جدید کلام اردو

JADĪD KALAM-I-URDŪ

Being Selections for the

Urdu Proficiency Examination

Compiled and arranged by

SHAMSUL-ULAMĀ MAULAVĪ MUḤAMMAD

YŪSUF JA'FARI, KHĀN BAHĀDUR,

Head Maulavi, Board of Examiners,

Under the Superintendence of

The Secretary & Member, Board of Examiners.

Second and Revised Edition.

PUBLISHED BY AUTHORITY.

CALCUTTA.

Printed at the Kalimi Press.

1318

Price Rs. [illegible]

فہرست مضامین جدید کلام اردو
حصۂ نثر

مضمون	صفحہ
اسلام اور رسوم	۱
ٹوپی	۲۶
دستار	۳۳
قدرتی سیر بین	۴۰
ایک دوست کی وفات	۴۷
سیتا جی	۶۰
نادر شاہ	۷۵
ایک پرانا روز نامچہ	۹۳
شکرستانِ خیال	۱۰۰
ایک اسکیا دوشیزہ کی داستان	۱۱۱
ایک 'سین' اور اس کے چھ پردے	۱۱۷
ایک رات	۱۲۲
برسات	۱۲۹
کلا تور	۱۳۲
سوتارہ	۱۳۵

مضامین	صفحہ
بندرِ عبّاس	۱۳۶
نمک کا داروغہ	۱۵۶
بے غرض مُحسن	۱۷۳
مہیش داس راجہ بیربر	۱۹۰
مُنتخب از فسانۂ آزاد	۲۲۷
مسیح الملک ایک بے رحم امیر کی حکایت	۲۸۳
مُنتخب از موعظۂ حسنہ	۳۰۸

حصۂ نظم

مضامین	صفحہ
ایک گھرانے کی قبریں	۳۲۸
دہلی کے کھنڈر	۳۳۱
غمِ برادر	۳۳۳
ماہِ صیام	۳۳۴
اُون کا بیان	۳۳۸
گداگری	۳۴۸
انگریزی لباس	۳۵۱
رُباعیّاتِ رنجور	۳۵۸

حصۂ نثر

منتخب از "لسان الصدق" کلکتہ

اسلام اور رسوم

اسلام کو جہاں اور باتوں پر ناز تھا - وہاں اس کو ایک بڑا فخر اس امر پر بھی تھا کہ اس نے تمام متوہمانہ رسموں - بد عادتوں - اور مضر رواجوں کی دنیا سے بیخ کنی کر دی - اور ما وجدنا علیہ آباءنا کی مستحکم دیوار کو - جو دینی و دنیاوی ترقیوں کے آگے سدِ راہ ہو رہی تھی - ڈھا کر گرا دیا - جس طرح اسلام میں بعض اور خوبیاں ایسی پائی جاتی ہیں جو دنیا کے دوسرے ملل و مذاہب کو نصیب نہیں - اسی طرح دنیا میں کوئی دین یا مذہب ایسا نظر نہیں آتا - جو رسوم قبیحہ کی آلائشوں سے پاک ہونے میں اسلام کی ہمسری کا دعویٰ کر سکے - باوجود اس کے کہ اس وقت تمام دنیا یورپ کی تہذیب کا لوہا مان رہی ہے - اور اس کی علمی روشنی نے ربع مسکوں

سے جہل کی تاریکی دُور کردی ہے - پھر بھی وہاں اب تک بہتیرے رسم و رواج ایسے پائے جاتے ہیں - جن کی بنا محض توہمات پر ہے - اور جن سے سوا اخلاقی یا مالی مضرت کے قوم کو کوئی نفع نہیں پہنچتا ہے - افسوس ہے کہ اسلام پر ہندوستان میں پہنچکر جہاں اور تباہیاں آئیں - وہاں - اس کو ایک بہت بڑا نقصان یہ بھی پہنچا - کہ اس کے خوبصورت روشن چہرے پر رسوم قبیحہ کے بیشمار بدنما داغ دکھائی دینے لگے - جس کی وجہ سے بجاے اس کے کہ ایک خدائی اس کی دلربا شکل کی فدائی ہوتی اس کو نفرت و استکراہ کی نظر سے دیکھنے لگی - "اسلام اور رسوم" ایک ایسا وسیع 'سبجکٹ' ہے - کہ اگر اس کے ہر ایک پہلو پر پوری طرح سے بحث کی جائے - اور وضاحت کے ساتھ دکھلایا جائے - کہ حقیقت میں اسلام ایک کیسا سیدھا سادہ مذہب تھا - مگر مختلف ممالک میں جاکر اس کی شکل اور وضع میں کیا کیا تبدیلیں واقع ہوئیں اور اس کو کیا کیا نقصانات پہنچے - تو بجاے خود ایک ضخیم کتاب تیار ہوجاے - ہمیں اس آرٹیکل میں جو کچھ دکھانا ہے وہ یہ ہے - کہ ہندوستان پہنچکر اسلام جیسا آزاد مذہب رسوم کی قیود سے کس قدر جکڑ

دیا گیا - اور ان رسوم سے بھی جو اور اخلاقی مضرتیں اِس کو پہنچیں - اُن سے قطع نظر کر کے - ہمارا مقصد یہاں صرف اِسی قدر ہے کہ اِن رسوم کی بدولت ہندوستان کے مسلمانوں نے جو مالی نقصانات برداشت کیے اور کر رہے ہیں - اُن کو بہ اِختصار بیان کر دیں -

سب سے پہلے یہ دیکھنا چاہیئے - کہ آیا انسان کے ساتھ اسلام نے حقیقت میں کچھ رسوم ایسی لگا دی ہیں - جن کی انجام دہی بدوں خود اُسی کو یا اُس کے والدین کو بیجا صرفِ زر سے مفر نہیں ہو سکتا - اب انسان کے زمانۂ حیات کو بالتّسلسل اُس کی پیدایش سے اُس کی موت تک دیکھو - اچّھا خیال کرو کہ ایک انسان پیدا ہُوا - پیدایش کے بعد پہلی رسم جو اسلام نے اُس کی ذات کے ساتھ لگائی ہے وہ یہ ہے کہ اُس کے کانوں مین اذان دِي جائے - اور وہ صرف اِس امر کے اِظہار کے لئے کہ یہ لڑکا داخلِ اسلام ہوا - اِس اذان کے دینے میں کیا کچھ صرفِ زر کی ضرورت ہے؟ نہیں - ایک کوڑِی بھی خرچ کرنے کی حاجت نہیں - دوسری رسم عقیقہ یا نسیکہ ہے: جس میں لڑکے کے سر کا بال اُتارا جاتا - اُس کا نام رکھا جاتا - اور اُس کی طرف سے

ایک یا دو جانور قربانی کیے جاتے ہیں۔ یہ تو ظاہر ہے کہ بچے کا سر منڈوانے میں کچھ ایسے خرچ کا کام نہیں۔ اور نہ نام رکھنے میں کسی قسم کے صرف کی ضرورت ہے۔ رہی قربانی۔ وہ بھی صرف اہلِ وسعت پر ہے۔ جو کر سکتا ہے۔ کرے۔ نہ کر سکتا ہے نہ کرے۔ اِس کے بعد ختنے کی رسم ہے: اِس کے ساتھ بھی کوئی ایسے لوازم نہیں لگائے گئے ہیں۔ جِن میں خرچ کی ضرورت ہو۔ بالغ ہونے پر ہر مرد و عورت کے لئے نکاح ضروریات میں سے قرار دیا گیا ہے۔ لیکن اسلام نے اِس کے ساتھ بھی کسی قسم کی رسم وغیرہ کی پخ نہیں لگائی۔ ہاں۔ مرد کو ولیمہ کرنے کا حکم ہے۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں۔ کہ آج تو مہاجن سے دو چار ہزار روپے سودی قرض لے کر تمام اہل قرابت اور دوست احباب کو الوانِ نعمت کھلا دیے۔ اور کل خود نانِ شبینہ کو محتاج ہو کر بھیک مانگنے کی نوبت آئی۔ بلکہ اپنے مقدور اور وسعت کے مطابق تھوڑے سے دوست احباب کو کھانا کھلا دیا جائے۔ جس سے نکاح کو شہرت ہو جائے۔ اور اِس مواکلت و مشاربت سے باہمی اِتحاد کو تقویت ہو۔ اب شادی کے بعد سے موت کے وقت تک انسان کے ساتھ اور کوئی رسم وابستہ نہیں کی گئی۔ اِس کے مرنے کے

بعد اُس کے اقربا یا احباب کا فرض صرف اسی قدر ہے کہ اُس کی نمازِ جنازہ ادا کر کے اُسے خاک کے نیچے دبا آئیں۔ اور بس۔

اب رہے فرائض دینی۔ وہ چار ہیں نماز۔ روزہ۔ حج۔ زکوٰۃ۔ یہ تو ظاہر ہے کہ نماز اور روزے میں کسی خرچ کی ضرورت نہیں۔ رہا حج۔ اس کے ساتھ "من استطاع الیہ سبیلا" کی قید لگی ہوئی ہے۔ جس کی تفسیر میں فقہا نے بڑی بڑی شرطیں لگائی ہیں۔ اور غور کا مقام ہے۔ کہ جب یہ امر مسلّم ہو گیا ہے کہ کسی قوم کی تقویت اور ترقی کے لئے اس میں قومی جلسوں اور صحبتوں کا جاری رہنا نہایت ضرور ہے۔ چنانچہ اسی غرض سے خود ہندوستان میں کچھ عرصے سے کانگریس کانفرنس۔ اور دوسری مجلسیں ہر سال منعقد ہوا کرتی ہیں۔ جن میں ملک کے ہر حصے کے باشندے زحمت و اخراجات سفر برداشت کر کے جا کر شریک ہوا کرتے ہیں۔ تو پھر اگر اسلام نے ایک سالانہ کانفرنس یا کانگریس ایسی قائم کی۔ جس میں اُس کے تمام پیرو۔ خواہ وہ پردۂ زمین کے کسی گوشے کے رہنے والے کیوں نہ ہوں۔ بشرطِ وسعت زندگی بھر میں ایک بار ضرور شریک ہوں اور ایک جگہ اکٹھے ہو کر مبادلۂ خیالات کریں۔ اور باہمی مشورے سے اپنی ہر قسم کی

دینی و دنیاوی ترقی کی راہیں سوچیں۔ تو اُس نے کیا بُرائی کی؟ ایسی باتوں میں روپے خرچ کرنا قوم کے لئے باعثِ تباہی و ہلاکت نہیں، بلکہ موجبِ رحمت و برکت ہے۔ اب زکوٰۃ کی حالت ملاحظہ ہو۔ اِس کو کون سا عاقل صرفِ بیجا کہے گا؟ اِس اُصول کو تو ہر ایک متمدّن قوم ملک میں میزانِ دولت کے پلڑوں کو برابر رکھنے کے لئے ضروری اور لابدّی سمجھتی ہے۔

اب یہ دیکھنا ہے۔ کہ آیا اور ادیان و ملل کی طرح اسلام نے بھی اپنے پیرُوؤں کے لئے کوئی میلے ٹھیلے یا پَرب تیوہار ایسے قائم کر رکھے ہیں۔ جن میں لایعنی مصارف سے چارہ ہی نہ ہو۔ مسلمانوں کے لئے اگر کوئی تیوہار رکھے گئے ہیں تو وہ صرف دو ہیں: عیدالفطر اور عید الاضحیٰ۔ تو کیا ہندوؤں کی دیوالی اور عیسائیوں کے بڑے دن کی طرح مسلمانوں کے اِن دونوں تیوہاروں میں بھی ظاہری آرایش اور دھوم دھام ضروریات سے ہے؟ اِس کا جواب تو حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے "لیس العید لمن لبس الجدید" والے مشہور خطبے سے بخوبی ملتا ہے۔ رہیں عید الاضحیٰ کی قربانیاں، وہ اہلِ استطاعت کے لئے ہیں۔ اور اہلِ وسعت کے لئے (بقدرِ وسعت) فی کس یا تمام اہلِ بیت کی طرف سے ایک ایک قربانی کرنی کوئی

مشکل بات نہیں۔

جو باتیں ہم نے اوپر بیان کیں۔ ان کے سوا اسلام میں تو اور کوئی فرضِ دینی یا رسمِ مذہبی ایسی نہیں دکھائی دیتی۔ جس میں تصرفِ بیجا داخلِ ضروریات سمجھا گیا ہو۔ آؤ اب دیکھیں۔ کہ ہندوستان کے مسلمانوں نے رسوم کی پابندی کے لحاظ سے کہاں تک اُس اسلام کی پیروی اختیار کی ہے۔ جس نے ایک عالم کو اپنی سادگیِ وضع کا فریفتہ کر لیا تھا۔ اَللّٰہُ اَکبَر! ان کی اور اصل اسلامیوں کی رسوم و عادات میں تو وہ بلا کا فرق ہو گیا ہے۔ کہ اگر پہلی اسلامی صدی کا کوئی شخص اِس وقت زندہ ہو جائے۔ اور اِن کے رُسوم و اطوار دیکھے۔ تو اُس کو اِن کے مسلمان تسلیم کرنے میں ویسا ہی تأمل ہو۔ جیسا رات کو دِن مان لینے میں۔ جس طرح ہم نے پہلے انسان کی زندگی کی تمام حالتیں اُس کی پیدایش سے موت تک دکھائی ہیں۔ اور یہ ظاہر کر دیا ہے۔ کہ اِس تمام زمانے میں اسلام نے فی الحقیقۃ کون سے فرائض اور رسوم اُس کے ساتھ لازم کر دیے ہیں۔ اِسی طرح علی التّسلسل ہمیں یہ دکھانا ہے۔ کہ ہندوستان کے مسلمانوں نے ایک انسان کو اُس کی پیدایش ہی کے وقت سے رُسوم کی قیود میں اِس قدر جکڑا ہے۔ کہ مرنے ہی پر اُن سے رہائی ممکن ہے ۔

نہیں نہیں۔ سچ تو یوں ہے کہ مر کر بھی ان سے چھٹکارا نہیں ملتا۔

اچھا فرض کیجیے کہ ایک بچہ پیدا ہوا۔ جب تک اس کی چھٹی اور مونڈن مین اتنے روپے نہ اُڑائے جائیں۔ کہ حقیقت میں اُس کے والدین کی پوری حجامت ہو جائے اور انہیں اپنی چھٹی کا دودھ یاد کرنا پڑے۔ تو وہ چھٹی چھٹی ہی کیا اور وہ مونڈن مونڈن ہی کیا! آگے چلیے۔ اب کیا ہے؟ نمک چشنی ہے یا کھیر چٹائی ہے۔ اِس میں بھی۔ اگر زیادہ نہیں تو دو چار ہزار روپے بھی نہ لگائے۔ تو برادری میں کیونکر منہ دکھانے کے قابل رہ سکتے ہین۔ اب وہ مولود اگر لڑکا ہے۔ تو اُس کے ختنے ہیں۔ اور اگر لڑکی ہے۔ تو اُس کی کان چھیدن ہیں۔ اور چند ہزار روپوں کا اِدھر سے اُدھر چلا جانا تو کوئی بات ہی نہیں ہے۔ اب اس کے مکتب کی تیاری ہے! اس میں کم سے کم اتنا سرمایہ صرف کردینا تو ضروریات سے ہے کہ اپنے پلّے ایک ٹکا بھی باقی نہ رہے۔ جس سے لڑکے کی کچھ بھی تعلیم و تربیت ہو سکے۔ ورنہ خویش و بیگانے انگشت نما کرینگے۔ اِس بیان میں ہم نے مبالغے کو مطلق راہ نہیں دی ہے۔ بیسیوں خاندان ہم نے بچشم خود ایسے دیکھے ہین۔ کہ جنھوں نے اپنی اولاد کے مکتبوں میں

ہزاروں روپیہ خرچ کر ڈالے اور اب روپے کے نہ رہنے کے باعث ان کی وہی اولاد بے تعلیم و تربیت آوارہ ماری پھرتی ہے۔

اب شادی کی رسم لیجئے جو تمام رسموں میں زیادہ اہم سمجھی گئی ہے اور جس ایک رسم کے ساتھ پچاسوں سیکڑوں رسمیں بطور فروعات اور توابع کے لگ گئی ہیں۔ اور جن سے کسی طرح چھٹکارا ممکن ہی نہیں ہے۔ اس کا تو پوچھنا ہی کیا ہے! اس کی تفصیل کے لئے ایک پوری ضخیم کتاب کے لکھنے کی ضرورت ہے۔ اگر کسی شخص کی خواہش ہو کہ ہندوستان اور خاص کر صوبۂ بہار کے ایک شریف مسلمان خاندان کے یہاں کی شادی کا چھوٹے پیمانے پر فوٹو دیکھ لے۔ تو اسے چاہئے کہ وہ پٹنہ کی ایک شریف خاتون یعنے والدۂ مسٹر محمد سلیمان بیرسٹر کی تصنیف کردہ کتاب "اصلاح النساء" کا ضرور مطالعہ کرے۔ غرض شادی حقیقت میں وہی شادی سمجھی جاتی ہے۔ جس میں پوری طرح سے خانہ بربادی ہوجائے۔ اور تمام املاک و جائداد کو آتشبازی وغیرہ میں پھونک کر در در گدائی کرنے کی نوبت آئے۔

خیر آدمیوں کی شادیاں تو بجائے خود رہیں۔ ہم نے ایک ایسے خاندان کے مد و جزر کی حالت بچشم خود دیکھی ہے۔ جس میں گڑیوں کی شادیوں میں نہایت دھوم دھام کو راہ دیجاتی تھی۔ اور تمام رسوم ایک ایک کرکے ادا ہوتی تھیں۔ اور اس

طرح سیکڑوں روپوں پر بے دریغ پانی پھیر دیا جاتا تھا۔ لیکن اِن غلط کاریوں کا آخر نتیجہ کیا ہوا ؟ آہ اِس دولتمند خاندان کے اُن لڑکوں اور جوانوں کو جو نہایت ہی عیش و آرام میں پلے تھے۔ اور جن کے گھر سے سیکڑوں محتاجوں اور غریبوں کی دِن رات پرورش ہوتی تھی نہایت تباہ حال در بدر دستِ سوال پھیلاتے دیکھا۔ بعض کی تو یہ حالت دیکھی۔ کہ اُس عیش و تنعّم کے وقت میں جو اُنھیں افیوں نوشی وغیرہ کی دھت پڑگئی تھی (کیونکہ یہ عادتیں ہندوستان میں دولت و ثروت کے ساتھ لازم و ملزوم سمجھی جاتی ہیں)۔ تو اِس افلاس و کربت کے زمانے میں اگر کسی شخص نے اُن پر ترس کھاکر اُنھیں دو چار پیسے دے بھی دیے۔ تو بجائے اِس کے کہ وہ اُن پیسوں سے کچھ کھاکر خود کو عذاب الجوع سے نجات دیتے۔ انھیں افیوں نوشی میں صرف کرتے۔ اور فاقوں پر فاقے کھینچتے کھینچتے اُن کی پیٹھ دُہری ہو جاتی۔ ان کے جانی دشمنوں کا دل بھی جنھوں نے اُنھیں کبھی اِس عیش و آرام کی حالت میں دیکھا تھا۔ اب ایسی رحمناک حالت میں اُنھیں دیکھکر پگھل جاتا۔ اور بے اختیار اشکِ حسرت بہانے لگتے۔ سچ ہے! اِن اللہ لا یغیر ما بقوم حتّی یغیروا ما بانفسھم۔ فاعتبروا یا اولی الابصار!

اب شادی کے بعد کی حالت ملاحظہ کیجیے۔ اگر خدا نے

صاحبِ اولاد ہے تو ہر ایک لڑکے کی چھٹی۔ مکتب۔ وغیرہ ہیں۔ اگر زیادہ نہیں تو اُس قدر۔ تو ضرور اُسے خرچ کرنا واجبات سے ہے۔ جو خود اُس کی تقریبوں کے موقعوں پر اُس کے والدین نے صرف کیا تھا۔ گو اُس کی حیثیت اُس کے بزرگوں کی حیثیت سے کتنی ہی تنزل کر گئی ہو۔ مگر خدا نخواستہ عزّت اور شرافت میں تو سرِ مُو فرق نہیں آیا ہے؛ اور عزّت و ناموس کا مُقتَضَا یہ ہے کہ جو رسمیں جس طریقے اور جس انداز سے بزرگوں سے ہوتی آئی ہیں۔ اُس سے رتی بھر کمی نہ ہونے پائے؛ ورنہ تمام اہلِ برادری میں تھُڑی تھُڑی ہوگی۔ اور کسی سے مُنہ دکھانے کے قابل نہ رہے گا۔ غرض اِس کے والدین اگر فضول خرچیوں کی بدولت چاہِ عمیق میں گرے تھے۔ تو یہ اُن کی رِیس کرنے کے ہاتھوں تحت الثّریٰ کو جاتا رہا۔ (مصرع)

بریں عقل و دانش بباید گریست

بادیُ النّظر میں یہ سمجھ میں آتا ہے کہ رسموں کا تَعَلُّق انسان کے ساتھ اُس کی زندگی تک ہوگا۔ مگر ایسا نہیں ہے گو انسان مَر کر خود یقیناً تمام دنیاوی قیود سے رِہا ہو جاتا ہے مگر ہندوستان میں اُس کے مرنے پر بھی اُس کے وَرَثہ کو رسوم کی قیود سے چھُٹکارا نہیں ملتا۔ اُس کے مرے پیچھے پھُول۔ تیجا۔ چہارم۔ بیسواں۔ چالیسواں۔ برسی وغیرہ کا ہونا ضرور ہے۔ جن کے

اہتمام میں اُس کے پس ماندوں کو چاہیئے کہ اپنے بزرگوں سے ایک انگل بھی نیچے نہ بیٹھیں۔ اگر برسی وغیرہ سے فراغت ہوگئی ۔ تو شب برات ایک ایسا سالانہ تیوہار ہے۔ جس میں سات پُشت کے مُردے اپنے اپنے نام سے کچھ نہ کچھ پیسے لے ہی مرتے ہیں۔

اِس کے علاوہ ہندوستان کے مسلمانوں نے خاص کر جس قدر رسوم کو مذہبی فرائض سمجھکر اپنے آپ پر لازم کر لیا ہے۔ اور جِن کی انجام دہی میں وہ کچھ کم مصارف کے زیر بار نہیں ہوتے۔ ان کی تعداد بھی اُن رواجی باتوں سے ہرگز کم نہیں ہے۔ جِن کی پابندی کو وہ دنیاوی حیثیت سے ضروری سمجھتے ہیں۔ وہ باتیں تو ایک طرف رہیں جو وہ اسلام کے نام سے کرتے ہیں۔ گو حقیقت میں اُن رواجی باتوں کو ٹھیٹھ اسلام سے تعلّق نہیں۔ اور وہ مُبتدعات میں سے ہیں بعض تو ایسی رسمیں جاہل مسلمانوں میں رائج ہوگئی ہیں۔ جو خاص ہندوؤں کی مُعتقدات اور اعمالِ مذہبی میں سے ہیں۔ اور جنھیں اسلام سے کوئی لگاؤ نہیں: مثلاً۔ ماتا اور گنگا کی پوجا۔ چھٹھ۔ جتیا۔ ہولی۔ دیوالی وغیرہ تیوہار منانا وغیرہ۔

یہ دونوں باتیں توکسی قدر وضاحت کے ساتھ بیان کردی گئیں۔ کہ حقیقت میں کہاں تک اسلام میں رسوم کی پابندیاں رکھی گئی ہیں۔ اور ہندوستان کے مسلمانوں نے

کہاں تک اپنے آپ کو اِن قیود سے جکڑ دیا ہے۔ اور اِس کی بدولت انھیں آئے دن کیا کچھ نتائجِ بد دیکھنے پڑتے ہیں۔ اب ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ یہاں کے مسلمانوں میں رسم و رواج نے کیونکر اِس قدر زور پکڑا ہے۔ اور اِس کے جواب دِہ کون لوگ ہیں۔ اور قیدِ رسوم سے رہائی پانے کی کیا تدبیر کی جا سکتی ہے۔

اِس میں شک نہیں کہ جو جو رسمیں یہاں کے مسلمانوں میں پائی جاتی ہیں۔ وہ قریب قریب سب ہندوؤں سے اخذ کی گئی ہیں۔

Checked
ISS

مسلمان فاتحین نے جو ہندوستان پر قبضہ کیا۔ اور مفتوح قوم سے زیادہ میل جول بڑھا۔ تو اِن کی خُو بُو اُن میں بھی اثر کرنے لگی۔ اور اگر مسلمانوں نے ہندوؤں کے مُلک پر قبضہ کیا تھا۔ تو ہندوؤں کے رسم و رواج نے مسلمانوں کے عادات و افعال پر قبضہ کرنا شروع کیا۔ لیکن ایک نہایت قابلِ غور سوال یہاں پر یہ پیدا ہوتا ہے۔ کہ قانونِ قدرت کے مُطابق قوم فاتح کا اثر قوم مفتوح کے افعال و عادات پر پڑنا چاہئے۔ نہ کہ قوم مفتوح کا قوم فاتح پر۔ حدیث شریف میں بھی ہے الناس علیٰ دین ملوکہم۔ چنانچہ انگریزوں کو بھی اِس مُلک پر قبضہ کئے ہوئے دو سو برس کا زمانہ گذرا۔ مگر انھوں نے ہندوستانیوں کی ایک رسم۔ ایک رواج۔ ایک عادت بھی نہ سیکھی۔ حالانکہ ہندوستانیوں پر انگریزوں کے چال چلن نے

بہت کچھ اثر کیا۔ پھر کیا وجہ ہے کہ اِس کے بالکل برعکس مسلمان فاتح ہندو مفتوحوں کے رسم و رواج سے متأثر ہوگئے؟ تو اب اِس کی وجہیں بھی سُن لیجئے۔

گو ظاہر میں مسلمان فاتحوں کا تعلّق ہندو مفتوحوں سے ویسا ہی نظر آتا ہے۔ جیسا یُورپین فاتحوں کا تعلّق ہندوستانی مفتوحوں سے۔ لیکن فی الواقع دونوں تعلّقات کو ایک دوسرے سے کوئی نسبت نہیں۔ اگرچہ ہندوستانیوں کو یورپی قوموں سے صورت آشنا ہوئے قریب قریب تین سو برس کا زمانہ گذرا۔ لیکن اِن کے دلوں میں اُن سے اور اُن کے دلوں میں اِن سے اب تک انتہا درجے کی وحشت اور غیر موانست ہے۔ جہاں انگریزوں میں عدل گستری۔ رعایا پروری۔ انتظام مملکت۔ انسداد جرائم۔ وغیرہ کے اعلیٰ درجے کے اوصاف ہیں۔ وہاں ایک خاصیت اِن میں یہ بھی ہے کہ یہ مفتوح قوموں سے میل جول اور زیادہ خلا ملا پیدا کرنا پسند نہیں کرتے۔ جو (خاصیت) ایک طور پر مُفید اور کارآمد سمجھی جاتی اور دوسرے پہلو سے مذموم خیال کی جاتی ہے۔

اِس کے ہر ایک پہلو پر بحث کرنا ایک پولیٹکل کام ہے جس سے ہمیں کوئی سروکار نہیں۔ ہمیں یہاں پر صرف اِسی قدر دکھانا ہے کہ انگریزوں کی غیر مونسیت اور ہندوستانیوں

ان سوسائٹی سے الگ تھلگ رہنے اور نیز اُن کے تعلیم یافتہ ہونے نے انھیں ہندوستانیوں کے کسی رسم و رواج سے متاثر ہونے نہ دیا۔

آیئے اب مسلمان فاتحوں کے ہندو مفتوحوں کے رسم و رواج سے متاثر ہونے کے اسباب پر غور کریں۔ ہم جہاں تک خیال کرتے ہیں یہی تین چار باتیں ایسی ہیں۔ جو مسلمانوں کے رسم و رواج ہنود کی پیروی کرنے میں زیادہ تر مؤید ہوئی ہیں:۔

(۱) عام مسلمانوں کی اور خصوصاً طبقۂ نسواں کی جہالت اور اِن کا عموماً دینی اور دنیوی تعلیم سے بے بہرہ ہونا۔

(۲) مسلمان فاتحوں کا (یورپی فاتحوں کے برعکس) ہندوستان کو بجائے فرودگاہ کے وطن قرار دیدینا۔

(۳) اُن کا ہندو مفتوحوں سے زیادہ میل جول اور خلا ملا پیدا کرنا۔

(۴) ہمارے علما اور مشائخ کا نہ صرف امر بالمعروف اور نہی عن المنکر سے پہلو تہی کرنا۔ بلکہ کچھ تو اُس وقت کی جابرانہ حکومت کے دباؤ کے باعث۔ اور زیادہ تر اپنی شکم پری اور تن پروری کے خیال سے۔ ناجائز باتوں کو جائز قرار دینا۔ اور بسا اوقات ان امورِ ناجائز کے ارتکاب میں مؤید ہونا۔

اِس میں کوئی شبہہ نہیں۔ کہ ہندوؤں کی رسوم کے

مسلمانوں میں رائج ہونے کی سب سے بڑی وجہ عام مسلمانوں کی جہالت اور خصوصاً اُن کی عورتوں کی بے تعلیمی ہے - ہماری عورتوں کی عموماً یہ حالت ہوتی ہے کہ گھر میں آنے جانے والی کنجڑنوں اہیرنوں سے جو باتیں سُن لیں اُن کو کالوحی المنزل من السماء مان لیا - اگر گھر میں کسی لڑکے کو چیچک نکلی - تو دکھیا اہیرن کی ہدایت کے بموجب مالی کو بلا کر اُس سے پوجا پاٹ کرانا ضرور ہے - ورنہ ماتا میّا دیا کی نظر پھیر لین گی - اب انھیں ہزار کہئے - کہ یہ ایک بیماری ہے - کسی حکیم یا ڈاکٹر کو بلا کر دکھانا چاہئے مگر سنتا کون ہے ؟ غرض - ہماری عورتوں کی جہالت اور بے تعلیمی کی وجہ سے ہماری 'سوسائٹی' میں جو جو خرابیاں پیدا ہو گئی ہیں - وہ اظہر من الشمس ہیں - اُن کو اِس مختصر 'آرٹیکل' میں صراحت کے ساتھ بیان کرنے کی ضرورت نہیں -

اِس امر کا - کہ مسلمان فاتحوں میں مفتوح قوم کی خُو بُو کیوں اثر کر گئی - اور 'یوروپین' فاتحوں میں کیوں نہیں اثر کرتی ایک بڑا سبب یہ بھی ہے - کہ 'یوروپین' فاتحین ہمیشہ ہندوستان کو اپنی سیرگاہ - شکارگاہ - یا فرودگاہ - تصوّر کرتے ہیں - اِس کو نہ اپنا وطن سمجھتے ہیں - اور نہ یہاں توطّن اختیار کرتے ہیں - عام ازاین کہ وہ طبقۂ حکّام سے ہوں - یا جماعتِ تجّار سے -

چنانچہ یہ جب تک ہندوستان میں رہتے ہیں - اگرچہ یہ

نہین - تو ہر تیسرے یا چوتھے سال انھیں اپنے 'بیلویڈ ہوم' (وطنِ مالوف) کی زیارت کر آنی ضرور ہے - اور حکام اور دوسرے ملازمین سرکاری 'پنشن' پانے کے بعد - اور تجار مسن اور ازکار رفتہ ہونے پر - ہندوستان کو ہمیشہ کے لئے خیرباد کہکر آخر اپنے وطنِ مالوف کو سدھارتے ہیں اور اپنی زندگی کے باقی دن تیر کرکے وہیں کے پیوندِ زمیں ہوتے ہیں - اِس کے بر عکس - مسلمانوں نے جو ہندوستان کو فتح کیا - تو وہ یہیں کے ہو رہے - انھوں نے اس ملک کو فتح کرنے کے بعد اپنے 'ہوم' سے خواہ وہ کابل یا ترکستان ہو - خواہ فارس یا عرب کوئی علاقہ نہ رکھا - اور مرتے دم تک پھر انھیں اپنے 'ڈیر ہوم' کی زیارت نصیب نہ ہوئی -

مگر اِس امر میں ہم انھیں زیادہ ملزم یا جوابدہ نہیں ٹھہرا سکتے - اِس لئے کہ اُس وقت میں سفر نمونہ سقر تھا - نہ اُس زمانے میں ریل تھی نہ آگبوٹ - اور نہ راستے رہزنوں اور ڈاکوؤں سے پاک صاف تھے - ایک چھوٹے سے چھوٹے سفر میں جو جو صعوبتیں اور زحمتیں پیش آتی تھیں - وہ ناگفتہ بہ ہیں - آج کل جو سفر ریل اور جہاز کے ذریعے سے دو اور تین ہفتے میں طے ہوتے ہیں - اُس زمانے میں اُن کے طے کرنے میں عمریں تمام ہوجاتی تھیں - یہ انھیں کی ہمّت

تھی۔ اُنھیں کی اولوالعزمی تھی۔ اُنھیں کا استقلال تھا۔ کہ سفر کی تمام صعوبتیں برداشت کرکے مشرق سے مغرب تک از چین و جزائرِ فرادیس تا مُلکِ مغرب و اُندلس پھیل پڑے اور چار دانگ عالم میں اسلام کا سِکّہ بٹھا دیا۔ پھر اگر اُنھوں نے ہندوستان پہونچکر اور اپنا مقصد حاصل کرکے اُسی مُلک کو اپنا وطن قرار دیدیا۔ اور اپنے وطن سے تعلّق قائم نہ رکھ سکے۔ تو اُن پر ایسا الزام عاید نہیں آتا۔

رہی تیسری وجہ۔ یعنی مسلمان فاتحوں کا ہندو مفتوحوں سے زیادہ میل جول اور خلا ملا پیدا کرنا۔ تو اِس کا ایک بڑا سبب مسلمانوں کا ہندوستان میں وطن گزیں ہونا ہوا۔ جس کا بیان اوپر کے 'پاریگراف' میں گزر چکا ہے۔ اور یہ بھی دکھایا جا چکا ہے۔ کہ یہ امر ناگزیر تھا۔ لیکن صِرف یہی بات نہیں ہے۔ اِس کی بہت بڑی تائید اکبرِ اعظم کی غیر مُتعصّبیّت نے کی۔ اس نے فاتح و مفتوح قوموں کے درمیاں سے کُل فرقوں اور امتیازوں کو اُٹھا دینے کی کوشِش کی۔ وہ دونوں کو ایک نظر سے دیکھتا تھا۔ اور اُس نے مسلمانوں کو اَوجِ فتحمندی سے اُتار کر۔ اور ہندوؤں کو حضیضِ مغلوبی سے نکال کر۔ ایک سطح پر لا کھڑا کیا۔ اپنے اِس مقصد کو پورا کرنے میں اُس نے یہاں تک اہتمام بلکہ مبالغہ کو راہ دی۔

کہ اپنے محل میں ہندو راجاؤں کے یہاں سے ڈولے منگوانے کی رسم جاری کی ؛ اور اِسی پر بس نہیں کیا۔ بلکہ خود بھی پوری ہندوانہ وضع اختیار کرلی۔ اور بجاے اِس کے کہ وہ اپنی وضع و لباس سے مغلی شان و شوکت ظاہر کرتا۔ خاصہ مہا راجہ اَدھیراج بن بیٹھا۔ اب حرم سراے شاہی میں جو رانیاں آئیں۔ وہ اپنے ساتھ اپنی تمام رسم و رواج اور اطوار و عادات لیتی آئیں ؛ اور جب شاہی محل کا رنگ ڈھنگ بدلا۔ رعایا نے بھی بفحواے الناس علیٰ دین مُلوکِہم اُن کی ریس اختیار کرلی۔ الغرض۔ جہاں اکبرِ اعظم کی غیر مُتَعَصِّبانہ اور ناجانبدارانہ ‘پالسی’ جس کی نظیر تاریخ کے صفحوں پر بہت کم ملے گی۔ ایک طور پر ملک و قوم کے لئے باعثِ رحمت ثابت ہوئی۔ وہاں اُس سے اسلامی ‘سوسایٹی’ میں ایسی ایسی خرابیاں بھی واقع ہوگئیں۔ جِن کے دفعیے کے لئے قومی مُصلحین نے اپنی کوششوں کا کوئی دقیقہ اُٹھا نہ رکھا۔ مگر اب تک کوئی خاطر خواہ نتیجہ ظہور میں نہ آیا۔ اور جِن کا رونا رونے کو ہم بھی اِس وقت بیٹھے ہیں۔ حق یوں ہے کہ اگر اکبرِ اعظم کی سلطنت کے بعد ہندوستان میں اورنگ زیب عالم گیرِ اوّل کی حکومت نہ ہوتی۔ جس نے محلسرا میں ڈولے منگانے کی رسم یکقلم موقوف کی۔ اور مذہبی امور میں مُتشدّدانہ ‘پالسی’

برتی۔ تو وہ نیّرِ اعظم اسلام کا۔ جس پر اُن خرابیوں کے باعث اِس وقت نصف کسوف ہو گیا ہے۔ کسوفِ کامل ہو جاتا۔ اور تمام ہندوستان تیرہ و تار نظر آتا۔

ہماری رسم و رواج کے بگاڑ کے لئے ہمارے علما و مشائخ بھی کچھ کم جواب دِہ نہیں ہیں۔ کچھ تو انھیں اُس وقت کی جابرانہ حکومت کے دباؤ میں پڑ کر بہت سی ناجائز باتوں کو جائز اور حرام کو حلال قرار دینا پڑا۔ جیسے۔ بادشاہوں کے سامنے سجدہ کرنا۔ بادشاہوں کا حریر اور طلائی زیورات پہننا۔ وغیرہ وغیرہ۔ لیکن زیادہ تر ان کی اپنی جیب پُری اور تن پروری کے خیال نے اِن کو اِن کے مُریدین اور مُعتقدین کی لغو و بیہودہ رُسوم کی پابندی کی طرف سے نہ صِرف چشم پوشی کرنے پر مجبور کیا۔ بلکہ اُنھوں نے بیشتر اُن رُسوم کی تائید کی۔ یوں معمولی طور پر جو نذرانے اِن کے مُریدین و مُسترشدین لایا کرتے وہ اِن کی جیبوں کے پُر کرنے کے لئے کافی نہ ہوتے۔ لیکن اب نئی نئی رسموں اور نئی نئی تقریبوں کے پیدا ہو جانے سے ضرور ہوا کہ مُریدین اُن موقعوں پر اپنے پیر میاؤں کی زیادہ آؤ بھگت کریں۔ اور جبکہ مثلاً کسی رسم یا تقریب کے موقع پر اُنھوں نے دس ہزار خرچ کیا۔ تو اِس مثل کے بموجب کہ "جہاں مُردے پر سو من مٹی وہاں نو من اور سہی"

یا سو دو سو اُس وقت پیر میاں کے آگے لا کر رکھ دینا اُنھیں بار گزر سکتا تھا؟ پھر کیونکر ہو سکتا۔ کہ پیر جی ایسی رُسوم کی۔ جو اُن کے لئے ازدیادِ معاش کا معقول ذریعہ تھیں۔ بیخ کنی کریں؟ بلکہ حلال و حرام کی کل تو اُن کے ہاتھ میں تھی۔ اُس کل میں ڈھال کر ہر ایک ناجائز اور مذموم امر کو جائز اور مُباح بنا ڈالا۔ یہی نہیں۔ بلکہ طمعِ زر اِس بات کی مُحرّک ہوئی کہ وہ نئی نئی رسمیں اور تقریبیں مذہب کا مقدّس لباس پہنا کر ایجاد کریں۔

اوپر جو کچھ لکھا گیا۔ اُس میں ہمیں اِس بات کا دکھانا مقصود تھا۔ کہ اسلام کا سا پاک و صاف مذہب مذموم اور بیہودہ رسوم کی آلایش سے کیونکر مُلوّث ہوا۔ خیر۔ جاہل اور مُتعصّب اشخاص تو ایک طرف رہیں۔ ہمیں سخت حیرت اور افسوس اُن حضرات پر ہے۔ جو تعلیم یافتہ اور روشن خیال ہونے کے مُدعی ہیں۔ اور ان رسموں کی مضرّتوں کو محسوس بھی کرتے ہیں۔ لیکن پھر بھی اِن کے دفیعے کی کوشش نہیں کرتے۔ اور تو اور۔ ہم نے بہتیرے اُن جنٹلمینوں کے ہاں بھی۔ جو یورپ کی ہوا کھا آئے ہیں۔ ادنیٰ ادنیٰ تقریبوں میں وہی بیہودگیاں اور فضول خرچیاں برتی جاتی ہوئی دیکھیں۔ اُن سے پوچھئے۔ تو سارا الزام عورتوں کے سر رکھ کر خود الگ ہو جاتے ہیں۔ مگر کیا اُن کا یہ عُذر مسموع ہو سکتا ہے؟ ہرگز نہیں۔ اوّلاً۔ اِن تقریبوں

ہیں ناچ وغیرہ بہتیری چیزیں ایسی ہوا کرتی ہیں۔ جن سے مستورات کو کوئی سروکار و تعلّق نہیں۔ وہ صِرف مرد اپنے جاہلانہ حوصلہ اور وحشیانہ اُمنگ سے کرتے ہیں۔ دوسرے۔ اِس کے کیا معنے ہیں کہ مرد عورت کے بس میں آجائے ؟ ہم یہ نہیں کہتے۔ کہ اُن کے ساتھ "بزن" کا معاملہ یا دُرشتی کا برتاؤ کرو۔ بلکہ اُنھیں تعلیم دو۔ اور اِس قسم کی رُسوم کی مضرّت اور لغویت اُن کے ذہن نشین کرو۔

زن و شُو کے تعلّقات اِس قسم کے واقع ہوئے ہیں۔ کہ بی بی پر میاں کی باتوں کا ضرور اثر پڑتا ہے۔ جِن لوگوں نے اپنی عورتوں کی اصلاحِ خیال کی کوشش کی ہے۔ وہ ہمیشہ اپنے مقصد میں کامیاب ہوئے ہیں۔ خاص کر کے ہندوستان کی عورتوں کو۔ جِن میں فطرۃً میاں کی محبّت و اطاعت کا مادّہ ودیعت کیا گیا ہے۔ میاں کی ہر ایک ادا محبوب اور پسندیدہ ہوتی ہے۔ اور وہ بطیبِ خاطر ہر امر میں اُس کی ہمخیال ہو جاتی ہیں۔ چنانچہ برابر دیکھا جاتا ہے۔ کہ اگر ایک سُنّی کے گھر میں شیعے کی یا ایک غیر مُقلد کے گھر میں مُقلد کی لڑکی آئی۔ تو وہ بھی سُنّی یا غیر مقلّد بن گئی۔ غرض۔ عورتوں کے نہ ماننے کا عذرِ لنگ تو کسی طرح مقبول نہیں ہو سکتا۔ اور اگر واقعی تم اپنی بی بی تک پر اپنے خیالات

کا اثر نہیں ڈال سکتے - تو پھر قوم پر کیا خاک اثر پہنچا سکوگے؟ پھر "اصلاح! اصلاح!" اور "رفارم! رفارم" کی ہانک پکار محض لا حاصل اور بے سود ہے -

شعر

تو کارِ زمیں را نکو ساختی ٭ کہ با آسماں نیز پرداختی

بعض حضرات تقریبوں اور مراسم کی تائید میں یہ امر پیش کرتے ہیں کہ مُختلف قسم کی تقریبوں کے ذریعہ اپنے برادری والوں اور دوستوں اور اُن کی مستورات کو اپنے گھر بُلانے اور اُن کے ساتھ مواکلت و مشاربت کا موقع ملتا ہے۔ جو مواخات اور "سوشل" اتّحاد کو قوی کرنے کا بہت عمدہ ذریعہ ہے: اور اُن مہمانوں کی دلچسپی اور دلبستگی کے لئے ناچ رنگ باجے گاجے - روشنی - آتشبازی وغیرہ کا ہونا ضرور ہے - ہم یہ مانتے ہیں کہ بیشک احباب و اقارب کو مدعو کرنے اور اُن کے ساتھ اکل و شُرب کرنے کے بڑے بڑے فوائد ہیں - اگر آپ کو خُدا نے روپے دیے ہیں - تو ضرور دعوتوں کے جلسے کیا کیجئے - مگر قرض لیکر اور خود آپ کو تباہ کرکے نہیں: اور پھر مُطلق دعوت کے لئے خواہ مخواہ کسی من گڑھت تقریب کے نام رکھنے کی کیا ضرورت ہے؟ عام طور پر دعوتیں کرنے کی فضیلتیں حدیث شریف میں بھی وارد ہوئی ہیں - لیکن کسی من گڑھت تقریب کے بنا لینے سے پھر وہ ایسی رسم کی

صورت اختیار کر لیتی ہے ۔ جس کا انجام دیا جانا لابدّی سمجھ لیا جاتا ہے ۔ گو وہ کیسی ہی بربادی اور تباہی میں ڈالے : اور پھر وہ رسم کسی کے اٹھائے نہیں اُٹھتی ۔ مگر ہم تو مہمانوں کی دلبستگی کے لئے ناچ رنگ جیسی لغو اور مُخرّبِ اخلاق چیزوں کی ضرورت کو کسی طرح تسلیم نہیں کرتے ۔ اگر ایسی ہی مہمانوں کی خاطر آپ کو عزیز ہے ۔ تو پھر شراب و کباب بھی کیوں ضروریاتِ مجالس میں نہ شمار کیا جائے ؟ یہ سب لغو باتیں ہیں ۔ دلبستگی کے لئے چار دوستوں کا ایک جگہ مل بیٹھنا کیا کم ہے ؟

بڑی خوشی کی بات ہے ۔ کہ ادھر ’محمڈن کانفرنس‘ اور ندوۃ العلماء کو خاص کر ’سوشل‘ اصلاح کا خیال پیدا ہوا ہے ۔ مگر صرف ’رزولیوشنوں‘ سے کام نہیں چل سکتا ! ہم کو حقیقت میں خوشی جب ہو ۔ کہ یہ انجمنیں اپنے اِن مقاصد کا عملی ثبوت دیں ۔ اور جو کچھ یہ کہتی ہیں وہ کر کے دکھا دیں ۔ ہماری راے میں اُنھیں چاہئے ۔ کہ اپنے اراکین سے وہ اِس بات کا ذمّہ لیں کہ ۔ وہ خود بیہودہ رسموں اور فضول خرچیوں سے مُجتنب رہیں گے ۔ اور کم سے کم ہند کے ہر بڑے شہر اور قصبے میں ایسے "والنٹیر" مقرر کریں ۔ جو وعظ پند اور ’لکچروں‘ کے ذریعہ لوگوں کو رُسومِ قبیحہ کی پابندی سے روکیں ۔ اور خود اس کا نمونہ بنیں ۔ یاد رکھو کہ جب تک تم خود وہ کام نہ کرو گے

جو دوسروں سے کرانا چاہتے ہو۔ تمھاری بات کی ہرگز شنوائی نہ ہوگی۔ کیا اگر سر سید مرحوم صرف ”انگریزی پڑھو! انگریزی پڑھو!!“ چلّایا کرتے۔ اور خود اپنی اولاد کو انگریزی تعلیم سے بے بہرہ رکھتے۔ تو قوم اِس جانب متوجّہ ہوتی؟ ہرگز نہیں۔ جب اُنھوں نے پہلے خود اپنے لڑکوں کو انگریزی پڑھوائی اور اُن کو ولایت بھیجکر تعلیم کرایا۔ تب اِس کی خوبیاں لوگوں کے ذہن نشیں ہوئیں۔ اور اُنھوں نے انگریزی پڑھنے اور ولایت جانے کو ہیبت اور حیرت کی نگاہ سے دیکھنا چھوڑا۔ جب تک دہلی میں مولانا اسمٰعیل شہید رحمۃ اللہ۔ اور پٹنے میں مولانا ولایت علی علیہ الرحمۃ نے خود اپنے خاندانوں کی بیوہ لڑکیوں کا نکاحِ ثانی نہ کیا۔ اِن جگہوں کے شریفوں نے اِس رسمِ پسندیدہ کو ذلّت وحقارت کی نگاہ سے دیکھنا نہ چھوڑا۔

اے مصلحینِ قوم! اور اے ”ریفارمیشن“ کا دعویٰ کرنے والو! اِس آیۂ شریفہ ”لم تقولون ما لا تفعلون“ کو ہمیشہ پیشِ نظر رکھو اور اِس کو اپنا دستورُ العمل قرار دو ورنہ یاد رکھو کہ تمھارے ہر ارادے میں حرمان۔ اور ہر مقصد میں ناکامیابی نصیب ہوگی۔ وما علینا الّا البلاغ۔

محمد یوسف جعفری
”رنجور عظیم آبادی“

(انتخابات از "مخزن" لاہور)

ٹوپی

آج کل جو بعض نہایت اہم مسئلے ہندوستان میں اہل الرّائے حضرات کے درپیش ہیں۔ اُن میں ایک یہ مسئلہ ٹوپی کا ہے۔ قانونِ راز داری۔ قانونِ اصلاحِ تعلیم۔ تقسیمِ بنگالہ۔ یہ سب ضروری بحث ہیں۔ مگر ٹوپی کسی سے کم نہیں۔ وہ مسائل تو محدود حلقوں پر اثر رکھتے ہیں۔ اِس کا اثر عام ہے۔ ممکن ہے آپ نے نہ سُنا ہو کہ ٹوپی کا مسئلہ نہایت اہم خیال کیا جاتا ہے۔ مگر آپ کے نہ سُننے سے کچھ اِس کی اہمیّت میں فرق نہیں آتا۔ یہ سب مسئلوں کے سر پہ ہے۔ اِسی کا آج کل راج ہے۔ پگڑی بیچاری اِس کے مقابلے میں گر گئی ہے۔ چند دور اندیش خیر خواہانِ ملک جانتے ہیں کہ ہندوستان کے لئے پگڑی ضروری ہے۔ خدا وہ دن نہ دکھائے کہ اِس کی پگڑی اُتر جائے۔ مگر لوگ انھیں دقیانوسی سمجھتے ہیں۔ اور کہتے ہیں :۔

کہ دستار جُز پیچ بر پیچ نیست
برِ عاقلاں جُز کلہ ہیچ نیست

کیوں نہ ہو۔ سعدیؔ سے بھی خوب کام لیا۔ اگر آج شیخ شیرازی زندہ ہوتا تو داد دیتا۔ اُسے معلوم نہیں تھا کہ گلستان

کے لئے بھی بعض اور کتابوں کی طرح تحریف کی ضرورت پڑے گی۔ غرض ٹوپی کی طرفداری میں ہر طرح کے ذرائع استعمال کئے جاتے ہیں۔ مگر ٹوپی جب کہ عقدۂ لاینحل بنی ہوئی ہے۔ دانایانِ فرنگ نے متفق ہوکر اپنے یہاں اس مسئلے کو حل کرلیا۔ اور اپنے مُلک کی آب و ہوا اور ضروریات کے موافق ایک وضع ٹوپی کی قائم کرلی۔ اس دن سے سارا یورپ ٹوپی پوش ہے۔ اگر تھوڑی تھوڑی تبدیلی مختلف ممالک کی ٹوپیوں کی وضع میں ہے۔ تو وہ جزوی اصول سب جگہ ایک ہے۔ اس کا کام سر کو سردی اور گرمی سے بچانا اور آنکھوں کے سامنے سایہ رکھنا اور دن کو آفتاب کی شعاعوں سے بچانا ہے۔ گویا ٹوپی میں بھی حکمت ہے۔ معلوم نہیں یہ حکمت اس ٹوپی کی جبلّی ہے یا حکیموں کے سروں پر رہتے رہتے اس میں سرایت کرگئی ہے۔ مگر اس میں شک نہیں کہ اہلِ فرنگ کی ٹوپی ایک دانا ٹوپی ہے اور گو باعتبارِ صورتِ ظاہری وہ حُسن کا دعویٰ نہیں کرسکتی۔ مگر حسنِ باطن سے خوب آراستہ ہے۔ ترکوں نے بھی جو یورپ میں آباد ہیں۔ ٹوپی کے مسئلے سے عرصہ ہوا فراغت پالی ہے۔ انھوں نے ایک رنگ اختیار کیا ہے۔ جو ساری قوم میں مقبول ہے۔ وضع قطع تراش خراش میں ترکی ٹوپی جسے فیز یا طربوش

بھی کہتے ہیں ۔ ٹوپیوں میں ایسی ہی ممتاز ہے ۔ جیسے ترک باعتبار جسم اور قویٰ کے انسانوں میں ۔ اس کا موزوں سُرخ یا سیاہی مائل رنگ ۔ اس کی نرم نرم بانات ۔ اس کی لچک ۔ اس کی سہولت ۔ اور سب سے بڑھ کر اس کا لٹکتا ہوا پھُندنا ۔ دل فریب ہیں ۔ اور ترکوں کے سُرخ و سپید چہرے پر تو یہ وہ بہار دیتی ہے ۔ کہ العظمت للہ ۔ مگر باعتبار فوائد کے یہ جہاں ایجاد ہوئی ہے وہاں کے لئے موزوں ہو تو ہو ۔ مگر ایسے ملک کے لئے جس میں انتہا درجے کی گرمی یا انتہا درجے کی سردی پڑتی ہو ۔ یا باری باری دونوں موسم آتے ہوں ۔ یہ ناقص ہے ۔ ایرانیوں کے یہاں بھی اپنا قومی شعار موجود ہے اور ایک اندازِ خاص ٹوپی کا موجود ہے ۔ مگر واہ رے ہندوستان ۔ اونٹ کی طرح کوئی کَل بھی تو سیدھی نہیں ۔ اہلِ ملک کو نہ سر کا ہوش نہ پانوں کا ۔ بنگالی ہیں کہ ننگے سر پھرتے ہیں ۔ اور مدراسی ہیں کہ ننگے پانوں ۔ بنگالی اگر ٹوپی پہننے کا تکلّف فرمائیں گے بھی تو برائے نام ۔ وہاں سے چلئے صوبجات متحدہ آگرہ و اودھ کو لیجئے ۔ گرمی ہو یا سردی تمام پُرانے لوگ ایک چھ ماشے کی ٹوپی پہنیں گے جو ہوا سے اُڑ جائے ۔ کوئی خاص تقریب ہوئی ۔ یا میلا ٹھیلا ہوا تو لیس کی اوڑھنے لگے ۔ اس سے ترقّی کی تو سلمے ستارے کی نوبت

تک ۔ اب یہاں تفرقہ شروع ہوا ۔ نئی پود کا اور لباس ۔ اور پرانی کا اور ۔ پھر ایک تفریقِ ثانی ۔ ہندوؤں کی اور ٹوپی ۔ مسلمانوں کی اور ۔ پھر آگے مسلمانوں میں اور تفریق ۔ ٹوپی وہ نیرنگی دکھاتی ہے کہ اگر کسی بڑے مجمع یا میلے یا تماشے میں لوگوں کی تصویر لی جائے ۔ اور ٹوپیوں کے جتنے نمونے وہاں موجود ہوں اُن کو جمع کیا جائے ۔ تو سنت رنگ کی آئندہ نمائش کے لئے ایک خاصہ محکمہ ٹوپیوں کا قائم ہو سکتا ہے ۔ ہندوستان جیسے ملک میں یہ توقّع رکھنا کہ یہ نازک مسئلہ کبھی پوری طرح حل ہوگا اور سارے اہلِ ہند کے لباس میں یک رنگی آجائے گی ۔ محال کی توقّع رکھنا ہے ۔ گو اِس میں شک نہیں کہ ایسی یک رنگی قومیت کے لئے ضروری ہے ۔ مگر کم از کم یہ تو ہو کہ ہندوؤں میں سب ایک ٹوپی پر اور مسلمانوں میں سب ایک ٹوپی پر رفتہ رفتہ مُتّفق ہو جائیں ۔ مسلمانوں میں تُرکی ٹوپی پھیلتی جاتی ہے ۔ اور بمقابلہ اور نمونوں کے حق بھی رکھتی ہے کہ پھیلے ۔ مگر ابھی وہ وقت دُور ہے کہ یہ حُکمی طور پر سب کے سر پر نظر آئے ۔ آپ اگر اِس کی مُشکلات سے آگاہ نہیں ۔ تو لیجئے سُنئے ۔ بہت لوگ اِس کے دُشمن ہیں ۔ بعض نازک دماغ ہیں ۔ جنھیں اِس ٹوپی سے نیچریت کی بو آتی ہے ۔ بظاہر ٹوپی ایک بے زبان ۔ بے گُناہ چیز ہے ۔ مگر ہمارے مُلک میں آکر اِسے

خاص اثرات حاصل ہو گئے ہیں ۔ یہ انسان کے دل کو بدل سکتی ہے ۔ عقائد میں خلل ڈال سکتی ہے ۔ اِسے پہنا اور نیچری ہونے کا تمغا حاصل کیا ۔ ایک حصّہ حُکّام کا ایسا ہے جو اِس ٹوپی کو بیوفا سمجھتا ہے ۔ اور کہتا ہے اِس کی ظاہری سیدھی سادی صورت پر نہ جاؤ اِس میں بڑی بڑی شرارتیں پنہاں ہیں ۔ اُن کا خیال ہے کہ جس نے ترکی ٹوپی پہن لی وہ فوراً تُرک ہی بن گیا ۔ اور تُرکوں سے اور اہلِ فرنگ سے چشمک کچھ آج کی نہیں ۔ مگر با ایں ہمہ یہ چُپکے چُپکے دلوں میں گھر کرتی جاتی ہے ۔ اور جہاں کئی اشخاص اِس کے روز افزوں استعمال کو گھبراہٹ سے دیکھتے ہیں ۔ وہیں بہت سی نگاہیں تُرکی ٹوپی کی طرف اُمیدوں کے ساتھ اُٹھتی ہیں ۔ کہ یہ کچھ کرکے دکھائے گی ۔ ترکی ٹوپی میں صرف ایک عیب ہے ۔ ذرا مسجد میں کم جاتی ہے ۔ اور اگر جائے تو دوسری ٹوپیاں اور عمّامے اِسے کم نگاہی سے دیکھتے رہیں ۔ لیکن اِس کی کامیابی اِسی میں ہے کہ یہ ہر مقام کی سَیر کرے ۔ یہی نہیں کہ صرف بڑے بڑے انگریزی طرز کے جلسوں کے ‘اسٹیج’ پر ہی اپنے پھندنے کی نمایش میں مصروف رہے ۔ یا صرف سینہ تان کے بیٹھنے والوں کے مجمع کی زیب ہو ۔ بلکہ خانہاے خدا میں بھی پہنچے جن میں داخل ہونے والوں کے سرِ نیاز زمیں پر دھرے رہتے ہیں ۔

ہم ہی میں بعض لوگ ہیں جو انگریزی ٹوپی کے حُسنِ باطنی اور فوائد پر مٹے ہوئے ہیں ۔ اِس بات کی داد دینی پڑتی ہے کہ وہ صُورت پرستی کے رہگذرِ عام سے نکل کر سیرت پرستی کی منزلِ خاص تک پہنچے ہیں ۔ مگر سب یکساں نہیں ۔ بعض صِرف اِس لئے وہ ٹوپی پہننا چاہتے ہیں ۔ کہ وہ صاحب لوگوں میں شمار ہوں ۔ یہ صورت پرستی کا ایک ادنیٰ نمونہ ہے اور قابلِ حقارت ۔ میں نے دیکھا کہ ایسے صاحبوں کی بھاری بھرکم 'ہیٹ' پر وہ ہماری پُرانی دقیانوسی چھ ماشے کی ٹوپی بھی ہنستی ہے ۔ اِسی طرح میں اُن شخصوں سے بہ مُشکل مُتّفق ہو سکتا ہوں جو انگریزی ٹوپی کو سفر میں پروانۂ راہداری بناتے ہیں ۔ اُن کی انگریزی ٹوپی گویا زمانہ ساز ٹوپی ہے ۔ میں نے اکثر اپنے ہموطنوں سے جنھیں اِس مُلک میں سیاحت کا اِتّفاق ہوا ہے سُنا ہے کہ آدمی اوّل یا دوم درجے کی گاڑی میں سفر کرنے کے مصارف برداشت کرکے بھی آرام نہیں پا سکتا تا وقتیکہ لباس سے کم از کم کرشٹان نہ معلوم ہو ۔ اور اِس لئے وہ بلا تامّل سفر کو روانہ ہوتے وقت انگریزی ٹوپی سر پر دے لیتے ہیں ۔ اِس میں شک نہیں کہ انھیں اِس صُورت میں ریل کے مُلازموں سے کام لینے میں قدرے سہولت ہوتی ہے ۔ اور اگر کوئی صاحب لوگ ہم سفر ہوں تو اُن سے بھی

جھگڑے کا خطر کم ہوتا ہے ۔ مگر اِس آسائش کی اُمید پر وہ انگریزی ٹوپی کی عزّت بڑھاتے اور اپنی ذاتی اور قومی عزّت گھٹاتے ہیں ۔ گویا اِس کے یہ معنے ہیں کہ اُن کے وہ مُعزّز بھائی جو اپنے مُلک کا لباس پہنتے ہیں ۔ اور جو اُس کے ساتھ اگر چاہیں بھی تو انگریزی ٹوپی بغیر مضحکہ اُڑانے کے نہیں پہن سکتے ۔ ہمیشہ ریل کے سفر میں بے پروائی کی نظر سے دیکھے جائیں ۔ اور وہ صرف اپنی فوری ضرورت کے وقت کو ٹال لیں ۔ وہ عزّت کیا ہے جو آپ کو اِس لئے ملے کہ دوسرا شخص آپ کو وہ نہیں سمجھتا جو آپ فی الحقیقت ہیں ۔ بلکہ کسی اور کے دھوکے میں آپ کی عزّت کرتا ہے ؟ عزّت وہ ہے جو آپ کی اپنی مُستقل ٹوپی کی ہو نہ کہ مانگی ہوئی عارضی ٹوپی کی ۔ ہماری سعی یہ ہونی چاہیئے کہ ہم مُتفقہ طور پر ایک ٹوپی پسند کریں ۔ اور اُسے اپنا مُلکی اور قومی شعار بنائیں ۔ جس سے جہاں جائیں پہچانے جا سکیں ۔ اور پھر اِس کوشش میں ہمہ تن مصروف ہوں کہ وہ ٹوپی اتنی قابلِ عزّت و وقعت ہو جائے کہ جو اُسے دیکھے پکار اُٹھے کہ یہ ایک مُعزّز قوم کا فرد ہے ۔ ٹوپی مشرقی ممالک میں ایک نشانِ عزّت ہے ۔ اِسے پوری طرح مُعزّز بنانا چاہیئے ۔

اکرام

دستار

ٹوپی پر جو مضمون لکھا جاچکا ہے۔ اُسے پڑھ کر ایک نقادِ سخن نے یہ رائے لکھی ہے:۔ "بہت سی ٹوپیاں ملاحظہ سے رہ گئیں۔ عمامے پر بھی نظر ہونی چاہئے تھی"۔ بیشک کئی ٹوپیاں ابھی منتظرِ توجہ ہیں۔ اور کیا عجب ہے کہ اُن کی پُرسش کا بھی کوئی دِن آجائے۔ سرِ دست دستار سے دو دو باتیں ہوجائیں۔ خُدا جانے الفاظ میں تاثیر کہاں سے آجاتی ہے۔ مُمکن ہے بعض لوگ اِس سے آگاہ نہ ہوں۔ لیکن میرا یہ ایمان ہے۔ کہ بعض لفظ بنے ہی ایسے ہوتے ہیں۔ کہ مُعزّز معلوم ہوں۔ اور بعض ایسے خفیف ہوتے ہیں۔ کہ نظر میں نہ جنچیں۔ شاید کوئی صاحب کہیں کہ محض پُرانے اور دیر سے دِل نشیں شُدہ خیالات سے کہتے ہو۔ مگر میرے ذہن میں۔ لفظ دستار باوجود زمانے کی ناقدر شناسی کے کانوں کو مُعزّز معلوم ہوتا ہے اور 'ٹوپی' باوجودیکہ قبولِ عام کا طُرّہ اِس کے سر پر ہے۔ کچھ ہلکی سی چیز نظر آتی ہے۔ 'دستار' کسی زبان میں اِس کا نام لو۔ ایک متانت اور ثقاہت کا بوجھ سنبھالے ہوئے معلوم ہوتی ہے۔ پگڑی ہی کو دیکھئے۔ تعدادِ حروف اور وزن تو وہی ہے۔ جو ٹوپی کا۔ گر اُس سے

کسی قدر بھاری بھرکم ہے ۔ اِس کے تلفظ میں بھی ایک قسم کی گرانی ہے ۔ اور یہ گرانی کچھ لفظی ہی نہیں ۔ قیمت میں بھی پگڑی ٹوپی سے گراں قدر ہے ۔ ململ کی سادہ یا بیلدار ٹوپی چند آنوں میں ملے ۔ تو پگڑی چند روپیوں میں ۔ ٹوپی اگر طلائی کام کی ۔ یا سلمے کی ۔ یا لیسدار لو تو معمولی پانچ سات روپئے میں ۔ لیکن پگڑی اگر ریشمی یا زرکار یا اور کسی طرح کے تکلّف والی ڈھونڈو تو بیس روپے سے لیکر سو روپے تک کی ۔ کسی با مذاق آدمی کے سامنے اِس کا عربی نام لیجئے "عمّامہ" ۔ دیکھئے کتنی وقعت اُس کے دل میں پیدا ہوتی ہے ۔ اوّل تو عمّامہ خُود مُعتبر چیز ہے ۔ دوسرے مُعتبروں کی صُحبت میں مُعتبر بن گیا ہے ۔ جب اِس کا ذکر سُنو ۔ کسی بزرگ کے نام کے ساتھ آتا ہے ۔ کچھ نہ ہو تو زاہد یا شیخ ۔ گویا اُن کے ساتھ مخصوص ہو گیا ہے ۔ مثلاً کہتے ہیں ۔ ؎

دیکھنا محفلِ رنداں میں نہ آنا اے شیخ
یہ وہ محفل ہے ۔ کہ عمّامہ اُچھل جاتا ہے

اِس شعر سے دو مطلب نکلتے ہیں ۔ ایک تو یہ کہ شیخ صاحبِ عمّامہ ہے دوسرے یہ کہ اِس کے نزدیک عمّامہ عزیز ترین یا مُعزّز ترین مقبوضاتِ ذاتی ہے ۔ جس کے متعلّق خوف دلانے سے گویا اُس کے شریکِ محفل ہونے کا احتمال

بھی نہیں رہے گا۔ اِسی طرح ایک اور رند مشرب حضرت فارسی میں فرماتے ہیں۔

در کوے مغاں زاہد رہ نیست مکلّف را
گیرم کہ تو گُنجیدی عمّامہ نمی گُنجد

یہاں عمّامہ زاہد کی مِلک قرار دی گئی ہے اور اُس کا رُعب اِس درجہ ہے کہ مجمعِ رنداں اِس سے گھبراتا ہے۔ اور اِس لئے چاہتا ہے کہ عمّامہ اُن کے تخلیے میں خلل انداز نہ ہو۔ اور اِس کو ایک ایسی بڑی چیز قرار دیتا ہے کہ خُود زاہد سما جائے تو سما جائے مگر عمّامے کے لئے گُنجایش کہاں؟ دستار کی فضیلت اِسی سے ظاہر ہے کہ دستارِ فضیلت کا یہ ایک جزو ہے۔ پگڑی کی توقیر میں اتنا کہنا کافی ہے۔ کہ اب تک ہمارے دیہات میں سر پر پگڑی ہونا سرداری کی علامت ہے۔ یہ نہ سمجھنا کہ یہ محض پُرانے توہّمات اور قدیم رواج ہیں۔ بلکہ ٹوپی پوش حکمراں خُود پگڑی کے قدر داں ہیں۔ عدالتوں اور دفاترِ سرکاری کا ایک اَن لکھا قانون ہے۔ کہ لوگ پگڑی باندھ کر آئیں۔ کلکتہ میں بنگالی لوگ جو ٹوپی اور پگڑی دونوں کی قید سے آزاد ہیں۔ اور قدرت کی بنائی ہوئی کھوپڑی اور اُس پر روغنِ ناریل سے تر بتر کنگھی کئے ہوئے بالوں کو کافی زینت سمجھتے ہیں۔ عدالت کی کُرسی پر بیٹھتے وقت ایک گول سی بندھی

بندھائی پگڑی سر پر دھر لیتے ہیں۔ وہی نشانِ حکومت ہے اور وہی تمغائے لیاقت۔ گھر گئے اور پگڑی اُتار کر رکھ دی۔ گویا ججی یا مُنصفی سے سُبکدوش ہوئے اور گھر پر سیدھے سادے نرے پُرے بنگالی بن کے آرام اور بے فکری سے بیٹھ گئے۔ اِدھر صُوبجاتِ مُتحدہ کی جانب چلے آیئے اور آپ دیکھیں گے کہ پنڈت جی ہیں تو اپنی گھُٹی ہوئی پگڑی پر نازاں ہیں۔ اور سیٹھ جی مہاراج کو اگر کوئی چیز گُماشتوں۔ دلّالوں اور عام بیوپاریوں سے مُمتاز کرتی ہے تو گلابی رنگ کی ایک ذرا سی پگڑی ہے۔ جسے کالبوت پر رکھ کر باندھتے رہنا بعض غریب لوگوں کا ذریعۂ معاش ہے۔ اور مولوی صاحب کا تو کیا ہی کہنا! اُن کا عمامہ تو مولویّت کا ایک جُزوِ ضروری ہے۔ جنُوب ہو یا شمال۔ ہند ہو یا سندھ۔ کشمیر ہو یا میسور۔ مولوی صاحب کا عمامہ موجود ہے۔ تھوڑے تھوڑے فرق سے یہ دو شعر اکثر مولوی صاحبوں کے لئے موزوں معلوم ہوتے ہیں۔

بیت

دیتا جاروب سرِ خاک ہے جامہ اُن کا
چھتریاں سر پہ لگائے ہے عمامہ اُن کا
سر پہ دستار فضیلت کی بہت بھاری ہے
پیٹ اُن کا تو کُتب خانے کی الماری ہے

جُنوبی ہندوستان کو دیکھو - تو اہلِ مدراس نے پگڑی کی قدر پہچانی ہے - یعنی اِس درجے تک کہ جُوتے کو بھی اُتار پھینکا ہے - عجب مزا آتا ہے جب کسی پُرانے ڈھنگ کے مدراسی کو دیکھیں - کوٹ بھی ہے - پتلون بھی - کالر بھی - ٹائی بھی - سر پہ دوپٹہ بنارسی تیس چالیس روپے کا بندھا ہوا ہے - مگر پانوں پر نظر ڈالو تو جُرابوں کے تکلّف سے بھی فارغ ہیں - اچھے اچھے مُعزز ننگے پانوں ریت پر یوں دوڑے پھرتے ہیں کہ دیکھنے سے تعلّق رکھتا ہے - اہلِ بمبئی کا تو کیا کہنا - اُنھوں نے تو عمّامے کو اپنی اصلی خوبی کے ساتھ قائم رکھا ہے - مرہٹوں کی پگڑی بھی ایک خاص بانکپن رکھتی ہے - مگر اس کے نیچے مُنڈے ہوئے سر کی نمائش اسے کسی قدر بد زیب بنا دیتی ہے - مگر بمبئی کے مُسلمانوں کی خوبصورت عبائیں - اُن پر لمبی لمبی قبائیں اور سروں پر خُوشنما اور قیمتی عربی عمّامے - اِن کے تموّل - اعتبار اور اعزاز کی مجازی علامتیں ہیں - کاش یہ عمامے ساتھ علمی فضیلت بھی لئے ہوتے - پھر تو ہم مُسلمانانِ بمبئی کو دوسرے مقامات کے لوگوں کے لئے نمونے کے طور پر پیش کردیتے - پارسیوں کا لباسِ سر بھی در حقیقت ایک قسم کی بندھی بندھائی پگڑی ہے - اور وہ اِس قدر بلند - وجیہ اور مضبوط ہوتی ہے - کہ زبانِ حال سے یہ کہتی ہے کہ اِتنے زمانے

میں ہندوستان کی قوموں کی لاج اِسی پگڑی نے رکھ لی ہے ۔ وسطِ ہند اور راجپوتانے کی ریاستوں میں آئیں تو پگڑی ایک خاص سپاہیانہ ٹھاٹھ بدلتی ہے ۔ تصویریں ہوں تو دکھائیں ۔ کہ فوجی جوان کس آن بان سے پیچدار دوپٹے زیبِ سر کرکے اِتراتے پھرتے ہیں ۔ کجکلاہی کے بجاے کج دستاری سے کام لیا جاتا ہے ۔ ایک طرف پگڑی کے پیچ کان سے دُور اُوپر کی طرف بھاگتے جاتے ہیں اور دُوسری طرف کان کو ڈھانپ کر رُخسار کے ایک حصّے کو بھی گھیرے ہوئے ہیں ۔ ایک طرف پہاڑ کی چوٹی ہے تو دوسری طرف وادی ۔ غرض پگڑی کیا ہے نشیب و فرازِ عالم کی تصویر ہے ۔ اِس پگڑی میں ایک چیز اور ہے جس کے دکھانے سے عکسی تصویر بھی قاصر ہے ۔ یعنے اِس کے خُوشنما رنگ ۔ معلوم ہوتا ہے ۔ وردیِ میجر صاحب نے قَوسِ قُزح آسمان سے چھین کر سر پہ لپیٹ لی ہے ۔

یُوں تو ہندوستان کے ہر حصّے میں دستار کسی نہ کسی صُورت میں موجود ہے ۔ مگر ہمارا پنجاب تو اِس کا گھر ہے ۔ یہاں اِس کی بن آئی ہے ۔ جتنی بڑی ہو اُتنے ہی آپ امیر ۔ اُتنے ہی معتبر ۔ چھوٹی سی پگڑی باندھ کر کوئی باہر نکلے تو کہتے ہیں ۔ ارے میاں یہ کیا لنگوٹی سی سر پہ باندھ رکھی ہے ۔ بھاولپور ۔ مُلتان ۔ ڈیرہ جات ۔ اِن اطراف میں تو پورا

تھان سر پر دھر لیتے ہیں - اور اِس پر کچھ قانع نہیں - اگر اور بڑے تھان ولایت سے بنکر آنے لگیں تو اِس نواح میں بڑے گاہک ہیں - اِن پگڑیوں میں ایک خوبی ہے - اِن کے پیچ ایسے عجیب ہوتے ہیں کہ گویا بے قاعدگی میں باقاعدگی لپٹی ہوئی ہے - بظاہر کوئی کدھر گیا ہے اور کوئی کدھر اور ایک شخص کی بندش دوسرے سے نہیں ملتی - پیچ دیوانہ معلوم ہوتے ہیں - مگر اُن کی دیوانگی میں بھی ایک ترتیب ہوتی ہے - بڑے شہروں میں اور خصوصاً پنجاب کی ریاستوں کے دار الخلافوں میں رنگا رنگ کی پگڑیاں عجب بہار دکھاتی ہیں - سرحدِ پنجاب میں پگڑی کو زیادہ وزن دار بنانے کے لئے ایک خاص بوجھل کُلہ (جو چھوٹے پیمانے پر ایک مصر کا مینار ہوتا ہے مخروط) جزوِ دستار قرار دیا گیا ہے اور اِس کی ساخت میں بہت محنت صَرف کی جاتی ہے - اِس زما میں زندگی کے مختلف صیغوں میں اِن دستار بند پنجابیوں نے نام پیدا کیا ہے - اور اِس ناموری کے ساتھ باہر دستار کی بھی ناموری بڑھ چلی ہے - کیا ہوا - اگر بنگالے کے لوگ اِسے اُتار کر پھینکنے پر آمادہ رہتے ہیں اور صوبجاتِ متحدہ کے لوگوں نے ٹوپی کو ترجیح دے رکھی ہے اور بمبئی مدراس والے دستار وقتِ ضرورت پہنتے ہیں - جب تک پنجاب کے دم میں دم ہے - پگڑی کا

بھرم کھلنے نہیں پائے گا۔ بلکہ اور لوگ بھی اِس کا دم بھرنے لگیں تو عجب نہیں۔ کیا اُنھیں معلوم نہیں۔ کہ پنجاب میں سب سے زیادہ خصوصیت اِسے سکھوں کی قوم سے ہے۔ (ان کے لمبے بال کسی اور لباس میں سنبھالے ہی نہیں جا سکتے) اور سرکارِ دولت مدار کی نظر میں سب سے منظورِ نظر قوم اِس وقت سکھوں کی ہے۔ جو دستار کی فضیلت سے اب تک منکر تھے اور اِس کی بزرگی میں شک رکھتے تھے۔ اِن کے لئے یہ دلیل قطعی ہونی چاہئے۔ کہ سکھوں کے سر پر پگڑی ہے اور اُس پگڑی پر لاٹ کرزن بہادر کا ہاتھ ہے۔

اکرام

قدرتی سیر بین

دُنیا کیا ہے؟ اِس سوال کا جواب دینا بہت ہی مشکل ہے۔ میری عقل ناقص تو یہی کہتی ہے کہ یہ ایک قدرتی سیر بین ہے۔ چنانچہ جب ہم لوگ اپنی عقل کی آنکھیں اِس کے شیشے میں لگا کر دیکھتے ہیں تو ایک نئی بات دکھائی دیتی ہے۔ یہ سیر بین اِس قدر بڑی ہے کہ تا قیامت اگر لیل و نہار ہم اِس کا تماشا دیکھنا چاہیں تو ہمیشہ ایک نیا تماشا

پیشِ نظر معدوم ہوگا۔ چونکہ یہ خدائی سیر بین ہے۔ اِس وجہ سے قدرت نے جتنی تصویریں بنائی ہیں وہ یا تو نشاط انگیز یا عبرت خیز ہیں۔ اور بہت بڑا وصف یہ ہے کہ کسی مخصوص آدمی کے مذاق کی تصویریں نہیں بلکہ ہر شخص کے رنگِ طبیعت کے موافق تصویریں موجود ہیں۔ اور صرف دو تین چار یا سو پچاس نہیں بلکہ اِس قدر ہیں کہ جب تک انسان زندہ رہے اُن کا نظارہ کرتا ہی رہے اور جب خوابِ اجل سے ہم کنار ہو تو اپنے بچوں کے لئے چھوڑ جائے۔ اِسی طرح سے تا قیامت اُس کی نسل کے لوگ اِس جامِ جم کی سیر کرتے رہیں مگر پھر بھی تصویروں کے تماشے ختم نہ ہوں۔ اِس وقت میں اِس سیر بیں کا تصویر نما بیلن اپنے دستِ خیال سے گھما گھما کر قدرتی تصویروں کے تماشے دیکھ رہا تھا کہ دفعتہً میرا دستِ خیال دو تصویروں کے دیکھتے ہی رُک گیا۔ ایک تصویر غم کی تھی۔ اور دوسری خوشی کی۔ پہلی تصویر کا رنگ کالا ہے۔ آنکھیں بڑی بڑی ڈرانی ہیں۔ کپڑے میلے۔ ناخُن اور بال بڑھے ہوئے۔ سیکڑوں ہاتھ۔ ایک میں چمکتی ہوئی تلوار۔ دوسرے میں پستول۔ تیسرے میں پیش قبض۔ چوتھے میں زہر کا جام۔ غرض کوئی ہاتھ ایسا نہیں ہے جو خالی ہو اور جس میں کوئی جان لینے والی یا مہلک چیز نہ ہو۔ اُس کی صورت پر

مایوسی برستی ہے - چہرہ نڈھال - بدن زار و نزار - لب خشک - پشت خمیدہ - سُست گفتار - اچھی طرح بات تک نہیں کی جاتی - اس کی غذا کے لئے خیالی پلیٹوں میں صرف پوست و استخواں ہوتے ہیں - بجائے آبِ ضبط کے گلاس میں خونِ جگر بھر کر ملتا ہے - تکلیفوں کے سوا آرام کے نام سے بھی واقف نہیں - رہنے کی کوئی ٹھور جگہ نہیں - جس جا گذر کیا لوگ نکالنے کی تدبیریں کرنے لگے - کھیل تماشا - گانا بجانا - ناچ رنگ - سیر تفریح - ہنسنا بولنا - ناول افسانے - قصے کہانیوں سے اسے کوئی مطلب نہیں - سوا شکایتوں کے دوسرے فن سے آشنائی نہیں - غم اپنے چمنزار کی سیر دیتا ہے - جہاں خزاں نے اپنا قبضہ کر لیا ہو اور سرو و خوشبو دار درختوں کے عوض خار دار درخت اُگے ہوں - جھاڑیاں جھنکاڑ پڑی ہوں - مرغانِ چمن کی جگہ حشرات الارض اور زہریلے جانور اِدھر اُدھر رینگتے پھرتے ہوں - اندھیرے کے سوا کہیں اُجالا نہ ہو۔

دوسری تصویر کا رنگ نہایت ہی صاف ہے - چہرہ بشاش - آنکھیں ایسی جنھیں گھنٹوں دیکھا کیجے - کپڑے صاف و شفاف کنگھی کئے ہوئے چکنے چکنے بال - اس کے بھی سیکڑوں ہاتھ ہیں - ایک میں پھولوں کے ہار - دوسرے

میں عطر کی شیشی۔ تیسرے میں سیم و زر۔ چوتھے میں شربتِ انار کا جام۔ غرض کوئی ہاتھ ایسا نہیں جس میں فرحت بخش اور روح افزا چیزیں نہ ہوں۔ اس کے سامنے خیالی فرش میں عمدہ نفیس و لذیذ کھانے ہوتے ہیں۔ پینے کے لئے مسرت کے گلاس میں آبِ حیات کا ٹھنڈا اور خوشگوار پانی ہوتا ہے۔ آرام حسب طبیعت کے لئے مکان بھی نمونہ بہشت ہوتا ہے۔ سیکڑوں خوشبو دار درخت ہوتے ہیں۔ کھیل تماشے۔ گانے بجانے۔ ناچ رنگ۔ سیر تفریح اور قصے کہانیوں کی صحبتوں سے ہر وقت دِن عید اور رات شبِ برات ہوتی ہے۔ سوا سامانِ دلبستگی کے اور کوئی دوسری بات ہی نہیں ہوتی۔ یہ ہمیشہ اُس باغِ سرسبز کی سیر کرتی ہے۔ جہاں خزاں کا جور آزما ہاتھ بھی نہیں پہنچ سکتا۔ جس میں شیریں پانی کی نہریں جاری رہتی ہیں اور مرغانِ چمن شاخوں پر چہچہاتے پھرتے ہیں۔

ان تصویروں کے نظارے کے بعد پھر میں اپنے دستِ خیال سے بیان سناتا ہوں تو دو تصویریں اور دیکھتا ہوں۔ ان میں۔ یعنی دو متضاد تصویریں نگاہ کے سامنے آجاتی ہیں۔ ان میں ایک تصویر امیر کی ہے اور دوسری غریب کی۔ دونوں الگ الگ [illegible]

چاروں طرف کرنوں پر بجلی کے تار بھی دوڑے ہوئے ہیں جو حفاظتِ جان کا ایک آلہ سمجھا جاتا ہے۔ اِس مکان کی آراستگی میں بہت کچھ روپے صرف ہوئے ہیں۔ رئیس کے سامنے دس رفیق و مُصاحب دست بستہ بیٹھے ہیں۔ اِس کی زندگی نہایت ہی خوشی و اطمینان سے بسر ہوتی ہے۔ اگر وہ کوئی جھوٹ بات بھی کہتا ہے تو رُفقا خوشامد سے فوراً ہاں میں ہاں ملاتے ہیں۔ صرف اِسی بات پر اِکتفا نہیں کرتے بلکہ سیکڑوں ہزاروں مصنوعی ثبوت اُس کی صحتِ کلام کے دینے لگتے ہیں۔ تعریفوں کا پُل باندھ دیتے ہیں اور جھوٹی باتوں کا پہاڑ کھڑا کر دیتے ہیں۔ اگرچہ وہ اِن باتوں کو سمجھتا ہے مگر پھر بھی اُن کی جھوٹی تعریفیں چونکہ رسیلی اور اچھی معلوم ہوتی ہیں۔ برابر سُنا کرتا ہے۔ اِس کا دل ہر وقت مطمئن رہتا ہے۔ غم جلد اُس کے پاس نہیں آتا۔ اور اگر کسی طرح آ بھی گیا تو زر کے پیادوں نے فوراً اُسے نکال دیا۔ اُسے جس کام کی جس وقت خواہش ہوتی ہے فوراً ہو جاتا ہے۔ سامانِ عیش ہر وقت مہیّا رہتا ہے۔ جس طرف جاتا ہے پندرہ بیس آدمی جلو میں رہتے ہیں۔ جس جگہ دھوپ ہوتی ہے وہاں مُلازم ریشمی کپڑے کی چھتری لگاتا ہے۔ گاڑی کے سوا کبھی پا پیادہ نہیں نکلتا۔ اُس کی انگشتری میں ایک

جھوٹا نگینہ ہوتا ہے تو لوگ اُسے سچّا۔ اگر اُس کے پاس پیتل کی کوئی چیز ہوتی ہے تو لوگ اُسے سونا سمجھتے ہیں ۔ بہت سے خود غرض لوگ ہر وقت اُس کی خوشامدیں کیا کرتے ہیں۔ جس کا عوض انھیں کبھی کم اور کبھی کچھ بھی نہیں ملتا ہے۔ قصّہ مختصر اِس کی زندگی عجب بہار خیز زندگی ہوتی ہے ۔

آخر الذّکر کی صُورت ہے تو گوری مگر کُملائے ہوئے پُھول کی طرح سے بالکل مُرجھائی ہوتی ہے ۔ اِس کا مکان خام اور کھپرے پوش ہے جو قبل از وقت یہ شہادت دیتا ہے کہ آنے والی برسات میں ضرور مُنہدم ہو جائے گا ۔ اِس کے کپڑے میلے ہیں جس میں سیکڑوں پیوند لگے ہیں ۔ ایک کم سِن لڑکا اِس سے چمٹا ہوا رو رہا ہے ۔ اِس کی بی بی اپنی گود میں ایک چھوٹا شیر خوار بچّہ لئے بہلا رہی ہے ۔ مگر وہ کسی طرح نہیں مانتا ۔ جب مُصیبت زدہ عورت اپنے ننّھے دودھ پیتے بچّے کو بہت بیچین دیکھتی ہے تو اُس وقت اُس کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو کے قطرے ٹپکنے لگتے ہیں ۔ اور یہ اِس معصوم کی صُورت دیکھ کر رہ جاتی ہے اور تسلّی کے لئے اُسے تھپکنے لگتی ہے ۔ یہ مُصیبت زدہ شخص جس کا ابھی ذکر ہوا اِس کا بھی ایک زمانہ تھا ۔ سیکڑوں آدمی مُلازم تھے ۔ اب وہی ہے کہ دوسروں کی جُوتیوں کی خاک جھاڑتا

پھرتا ہے - کہاں روز اِس کے دسترخوان پر آٹھ دس آدمی کھاتے تھے یا اب یہ حالت ہے کہ دو دِن سے اُس کے بال بچّے بے آب و دانہ تڑپ رہے ہیں اور کوئی پُرسانِ حال نہیں ہوتا - ایک دن وہ تھا کہ یہ گاڑی گھوڑے کے سوا پا پیادہ نہیں نکلتا تھا یا اب وہی ننگے پاؤں خاک بہ سر دیار بہ دیار مارا پھرتا ہے - ایک دن وہ تھا کہ وہ ڈھاکے کی جامدانیوں کے انگرکھے لوگوں کو تقسیم کرتا تھا اور اب وہی ہے کہ ایک پھٹی ہوئی میلی اچکن پہنے یا پیٹھ پر ایک پرانا کمّل ڈالے گلیوں کی خاک چھان رہا ہے - ایک دِن وہ تھا کہ اُس کے بچے نرم تکیوں پر سر رکھ کر سوتے تھے اور اب وہی زمین پر سوتے ہیں - ایک دن وہ تھا کہ اِس کی نازک بی بی کی خدمت کے لئے ماما اصیلیں نوکر تھیں اور اب وہی عورت بی بی اور لونڈی دونوں کا کام کرتی ہے - ننھا شیرخوار بچّہ جو اپنی ماں کی گود میں پل رہا ہے - اُسے صبح سے ایک قطرہ دودھ کا نصیب نہیں ہوا - اُسے اتنی سمجھ کہاں کہ بیچاری ماں کو دو روز سے فاقہ ہے پھر دودھ ہو تو کہاں سے ہو؟ غریب شوہر اگر کسی رئیس کی ڈیوڑھی پر جاتا ہے تو پیادے دور ہی سے کتوں کی طرح نکال بھگاتے ہیں - پھاٹک تک نہیں جانے دیتے - اگر

بیچارہ کسی طرح پہنچ بھی گیا تو اُس وقت دس حاشیہ نشینوں اور خوشامد خوروں نے اِدھر اُدھر کی باتیں رئیس سے کہنی شروع کیں۔ اگر خوش قسمت ہے تو بہت دیر کے بعد رئیس نے کچھ سلوک کیا ورنہ تقدیر کا گلہ کرتا اپنے اُجڑے مکان کو واپس آیا۔ حیا مانع ہے۔ دس جگہ جا نہیں سکتا۔ شرم اور غیرت قبول نہیں کرتی ہے۔ ناچار اپنی داستانِ غم خدا سے کہتا ہے۔ راتوں کو تنہائی میں اُسی کے آگے ہاتھ پھیلاتا ہے اور اپنے بال بچوں کی غم آلودہ اور مایوسانہ صورت دیکھ کر اپنا کل دکھ درد بھول جاتا ہے اور خدا کا شکر کرتا ہے۔ اور بگریہ و زاری کہتا ہے کہ اے پروردگار امیروں قوم میں ہمدردی کا اثر پیدا کر۔

سید مہدی نواب

عظیم آبادی

ایک دوست کی وفات

کچھ عرصہ ہوا رات کو آٹھ بجے میں اپنے مکان کے صحن میں ایک مایوسی کی حالت میں ٹہل رہا تھا۔ طاعون کے خوف سے خاندان کے کئی عزیز اِسی شام کو مکان چھوڑ چکے تھے۔ اُن کی جدائی کا اثر دل پر بالکل تازہ تھا۔ طبیعت اُچاٹ

تھی کہ دفعتہً میرے چچا نے مجھے بلایا اور وہ وحشتناک خبر جو انھوں نے ایک دوست کی زبانی سنی تھی مجھ سے کہی "حکیم جی کے صاحبزادے آج یکایک بیمار ہو کر قضا کر گئے۔" ایں جگدیش مر گیا! جگدیش! پیارا جگدیش! جسے دیکھے مجھے ہفتہ بھر نہیں گذرا تھا وہ دنیا سے چل بسا! اور اِس قدر جلد اور دفعتہً! ابھی تک اس کی بیماری کی بھی تو خبر نہ آئی تھی۔ آناؤ کچھ دور نہیں۔ اگر کچھ بھی بیمار ہوتا تو ضرور معلوم ہو گیا ہوتا۔

غرض دل میں اس بد خبر کا کسی طرح یقین نہ ہوتا تھا۔ طبیعت ہرگز باور نہ کرتی تھی۔ دل میں ہزاروں شکوک پیدا ہوئے کہ ایسا نوجوان۔ ہٹا کٹا۔ تندرست۔ نیک ارادہ۔ نیک عقیدت مستقل مزاج۔ سلیم طبیعت اِس جہان سے اٹھ جائے۔ اس وقت گو پورا پورا یقین نہ ہوتا تھا مگر دل میں چور تھا کہ کیا عجب ہے۔ دنیا میں موت کا کوئی وقت اور ٹھکانا نہیں۔ یہ زندگی چند روزہ ہے اور اِس میں کسی کا دخل نہیں۔ موت کا وقت جب آگیا پھر ایک لحہ قیام دنیا ناممکن۔ غرض یہ کانٹا دل میں ساری رات کھٹکتا رہا۔ کسی طرح نکالے نہ نکلا۔ لاکھ جتن کئے کہ دل بہلے۔ مگر دل میں بجز دوست کے خیال کے کچھ نہ آتا تھا۔ اور کیونکر آتا؟ تعجب تو یہی ہے کہ حواس بجا تھے دل و دماغ میں غور و فکر کی طاقت

موجود تھی۔ ورنہ اِس خبر کی سچّائی اور جھوٹائی کا کیونکر موازنہ ہو سکتا۔ دل سے ہر وقت دُعا تھی کہ یا الٰہی یہ خبر غلط نکلے۔ مگر نہیں مشیّتِ ایزدی کچھ اور تھی۔ جس کی زندگی کے واسطے میں دُعائیں مانگ رہا تھا وہ دُنیاوی تعلّقات اور بندشوں سے آزاد ہو چکا تھا۔ جس جِسم کی تندرستی کے لئے میں منّتیں کر رہا تھا وہ جِسم آگ کے حوالہ ہو چُکا تھا۔ جس بدن کے دیکھنے کا میں آرزو مند تھا اُس کا نشان تک باقی نہ رہا تھا۔ جس قالبِ خاکی کے قیام کے واسطے میں اتنی فکریں کر رہا تھا وہ اب خاک ہی خاک رہ گیا تھا۔ خاک بھی نہیں راکھ ہو گیا تھا۔

میں نے نیّت کی صُبح اُٹھتے ہی اِس خبر کی تصدیق کے لئے خُود اُناؤ جاؤنگا۔ اِس ارادے سے چاہا کہ دل کو تسکین دوں۔ مگر طبیعت کی بیقراری انتہا کو پہنچ گئی تھی۔ دل کو کسی طرح چین نہ ہوتا تھا۔ عجب مُتزلزل حالت تھی۔ اِس کشمکش میں ساری رات تمام ہوئی۔ صُبح ہوتے ہوتے اِس خبر کی تصدیق ہوئی اور شک کے بجائے دوست کی وفات کا یقین ہوا اور یقین ہوتے ہی دل پر رنج و یاس کا غلبہ ہوا۔ رات بھر تو ایک گونہ اُمید گو موہوم تھی۔ اُس امید کی وجہ سے دوست کا خیال بندھا رہا۔ اور اُن کی صِفات اور صُورت رات بھر آنکھوں میں پھرتی رہی۔ اُن کی صِفات

وہ خوبیاں - سلامت روی اور راست خیالی - سچائی اور نیکی - قومی جوش اور عام ہمدردی - مستعدی اور مستقل مزاجی - حلم اور بردباری - غرض وہ ساری باتیں جو اس ذات کے متعلق تھیں یاد آتی رہیں - دل اس بڑے نقصان اور کمی کا جو اس خبر کے سچ نکلنے سے قوم اور ملک کو ہوگی موازنہ کر رہا تھا - اور اس نقصان کے دم بدم خیال سے دل گھبراتا تھا -

اس میں شک نہیں کہ اگر اس نوجوانِ نیک نہاد کی زندگی کچھ روز اور وفا کرتی تو ملک پر اس کے احسانات بھولنے کے قابل نہ ہوتے - میں نے زیادہ تر انھیں طالب علمی کی حالت میں دیکھا ہے - مگر دو تین برس کے ہر وقت کے مشاہدہ و تجربہ سے کہہ سکتا ہوں کہ مرحوم کی زندگی اس جماعت کے لئے کہ جس پر ملک کی ساری امیدیں منحصر ہیں بہ لحاظِ راستبازی و ادائے فرض کے ایک قابلِ تقلید مثال تھی - اوقات کی پابندی - خوش معاملگی - قلب کی صفائی اور گفتگو کی سچائی - ہمارے مرحوم دوست کے مزاج اور طبیعت کے خاص صفات تھے - ہمیشہ صبح اٹھنا - اوقاتِ معینہ پر کل کام کرنا - وقت سے کالج میں موجود ہونا اور وہاں جا کر ہمہ تن گوش رہنا - ان کا روز مرہ معمول تھا - وقت کی پابندی کا بڑا لحاظ تھا - کئی جلسوں میں میں نے انھیں سب سے

پہلے موجود دیکھا۔ خوش معاملگی کی یہ کیفیت کہ کبھی کسی کو شکایت کا موقع ہاتھ نہ آیا۔ آپ ایک مذہبی "سوسایٹی" کے "لیبریرین" تھے۔ ایک روز کا ذکر ہے کہ ایک نو تصنیف کتاب کی تعریف ہو رہی تھی۔ حاضرین اُس کے دیکھنے کے شائق تھے کہ ایک صاحب نے میز پہ رکھی دیکھکر اُٹھا لی۔ اور کمال بے تکلفی سے مانگ بیٹھے۔ اُنھوں نے صرف لوحِ کتاب دیکھ کر سوال کیا۔ جس کے جواب میں مرحوم نے یہ کہا "افسوس ہے کہ یہ کتاب میری نہیں بلکہ "لیبریری" کی ہے۔ اور صرف اُس کے ممبروں کو مل سکتی ہے"۔ اُنھوں نے اپنی غلطی محسوس کرکے اپنی جلد بازی کی معافی مانگی۔

اپنے عہد کا اِس قدر خیال کہ کم دیکھا جاتا ہے۔ گذشتہ "جون" میں ایک روز میرے مکان پر مجھ سے ملنے کو آئے اور دم بھر بیٹھ کر کہا کہ "مَیں اِس وقت کی ریل پر جانے کو ہوں" میں نے دریافت کیا "کیا اِس وقت کی واپسی کا وعدہ کر آئے ہیں؟" کہا "ہاں"۔ بس پھر میں نے مطلق اصرار نہ کیا کیونکہ اُن کی عادت سے بخوبی واقف تھا۔ اِس عادت کو اُنھوں نے مرتے دم تک نباہا۔ وفات کے چار روز قبل ایک عزیز دوست کی بیماری کا حال سُن کر اُن کے دیکھنے کو گئے تھے اور اُن کے مکان پر چار روز مسلسل قیام کیا۔

اِتوار تک مکان پلٹ آنے کا وعدہ کر گئے تھے۔ سینچر کی شام شدّت کا دردِ سر اور اعضا شکنی تھی۔ صاحبِ مکان نے ہزار کہا کہ "آج شب بھر ٹھہر جائیے۔ شب بیداری سے طبیعت اور خراب ہو جاوے گی"۔ مگر رات کے جگنے اور سفر کے تکان کا مُطلق لحاظ نہ کیا اور معہودہ وقت پر صُبح اپنے مکان آ پہنچے۔ گو پہنچتے ہی طبیعت کی بے چینی دم بدم بڑھتی گئی۔ یہاں تک کہ دوپہر کو زبان بند ہو گئی۔ اور گھنٹہ بھر بعد راہیِ مُلکِ بقا ہوئے۔

قلب کی صفائی کا میں نے بارہا اِمتحان کیا مگر ہر مرتبہ دُرست پایا۔ گُفتگو ہمیشہ راست۔ راست بلا کم و کاست۔ جب کبھی کسی مُعاملے پر رائے طلب کی بلا تکلّف اپنے خیالاتِ اصلی کا اظہار کر دیا۔ جس مُعاملے کی تائید کی۔ صاف صاف۔ جس بات کی تردید کرنا منظور ہوئی۔ بے تامّل۔ مُجھے کئی بار کئی مُعاملات میں اُن کی رائے کی ضرورت ہوئی۔ میں ہر مرتبہ اُن کے دل کی صفائی کا قائل ہوتا گیا۔ بعض دفعہ اُن کی رائے سے خود مُجھ کو تعجّب ہوتا تھا۔ مگر آج تک مُجھ کو اور شاید کسی اور دوست کو بھی اُن کی تقریر سے رنج نہیں پہنچا۔ اُن کے دل میں دُوسرے کے اِختلافِ رائے سے کچھ اثر نہیں پڑتا تھا۔ ہاں بڑے بڑے مُعاملات میں وہ اور

اُن کے دوست قریب قریب مُتّفق الرّاے تھے - سچائی کا اِس سے اور کیا زیادہ ثبوت ہو سکتا ہے کہ ہمیشہ دُوسروں کے کلام - بیان اور نیّت پر اِعتبار کرتے تھے ؟ طبیعت میں تعصّب یا تنگ خیالی نام کو نہ تھی - مجھ سے اکثر کہا کرتے تھے کہ میں نے ہندو اور مسلمان کا فرق اخبار بینی سے جانا - ورنہ اِس سے پیشتر مجھے کبھی یہ تفریق محسُوس نہ ہوئی تھی - مُستقل مزاجی تو میں کہوں گا مرحُوم کا حصّہ تھی - اُن کی شادی کی نسبت اکثر ذکر آیا اور اُن کے والدین نے اِس مُعاملے میں انھیں مجبُور بھی کرنا چاہا - مگر یہ ہمیشہ اپنے خیال کے بموجب انکار ہی کرتے رہے - حتّٰی کہ خود والدین کو اُن کی رضامندی پر مجبور ہونا پڑا - خیال یہ تھا کہ طالب علمی کی حالت میں شادی نا مُناسب اور بعد فراغتِ حصُولِ علم بیاہ کا کرنا اور نہ کرنا خود اِسی شخص کی رائے پر مُنحصر ہونا چاہیئے - میرا تو یہ خیال ہے کہ شادی کرنے کا ان کا کبھی اور کسی وقت بھی ارادہ نہ تھا - کیونکہ اُن کی گفتگو سے بارہا یہ ترشّح ہوا کہ اِن کی نیّت ہے کہ زندگی مُلک کی خِدمت میں صَرف کی جاوے - اور سارا وقت اہلِ مُلک کی خِدمت میں وقف ہو - اور اِس خیال سے کہ شادی سے اِس نیک ارادے کی پیروی میں فرق آئے گا - اِس بارے

میں نہایت مُتامّل تھے ۔

غرض یہ زندگی جو ہم لوگوں سے بے وقت واپس لے لی گئی دوسروں کی فلاح میں صرف ہونے کو تھی ۔

اِس مستقل مزاجی کی بدولت بہت کچھ رُوحانی تکلیف بھی سہنا پڑی ۔ مگر اخیر دم تک اُسے نباہے گئے ۔ شادی نہ کرنا تو درکنار ۔ اِس میں دخل دینا اہلِ خاندان اور دیگر اہلِ قوم اور ہم وطن ۔ جو اکثر پُرانے خیالات کے آدمی ہیں ۔ ایک نئی بات ۔ بیہودہ ضِد اور بیجا اِختلاف اور خود رائی سمجھتے تھے اور مستقل مزاجی کو عام لوگ بُری نگاہ سے دیکھتے تھے ۔ گھر کی مستُورات کو انتہا کا رنج تھا ۔ بُوڑھے دادا کو بڑا صدمہ کہ نَوجوان پوتے کے دل میں کیا سمائی ہے کہ شادی سے اِنکار کرتا ہے ۔ اِن سب لوگوں کو وُفورِ محبّت سے واقعی بڑا غم تھا اور اِس نئی ضِد کے معنے نہ سمجھ سکتے تھے ۔ اِن کی نگاہ میں یہ ارادہ بالکل مہمل تھا اور دل میں خُدا معلوم کیا کیا خیال کرتے تھے ۔ بُزرگوں اور عزیزوں میں ایک بھی ایسا نہ تھا جو اِن کے اِس ارادے سے ہمدردی کرتا اور مدد دیتا ۔ بعض بعض کا تو اِن کی جانب خیالِ بد ہو چلا تھا ۔ مجھ سے کہا کرتے تھے کہ "اِس ارادے کی شُہرت کے قبل اٹاوٗہ بھر میں سب نوجوانوں سے بہتر خیال کیا جاتا تھا ۔

عزیز تھا اور قدر سے دیکھا جاتا تھا۔ مگر بجز تمھارے اور ایک اور دوست کے (جو اُن کے ہم سبق اور میرے عزیز ہیں) اور کوئی اِس خیال کا ہمدرد اور قدر داں نہیں"۔ اور اِس ہمدردی اور قدردانی سے اُن کو بڑی تقویت ملی اور ثابت قدم رہنے میں بڑی مدد ملی۔ میں نے صاف صاف کہدیا تھا کہ "میں ہمیشہ ناکتخدا رہنے کے خیال کو عموماً دل سے پسند نہیں کرتا تھا۔ مگر چونکہ آپ کے خیال کے موافق آپ کی آیندہ خوشی اور مُلک کی بہبودی اِسی پر منحصر ہے اور میں بھی سمجھتا ہوں کہ اِس طریقِ زندگی کے لئے ہندوستانی 'سوسائٹی' میں ایک جگہ مُقرر ہونا ضروری ہے۔ لہذا آپ کے خیال سے ہمدردی کرتا ہوں"۔ میں جس طرح ممکن ہوا اِس کی پیروی کے لئے کوشش کرتا رہا۔ اپنے خیال کی تائید میں اکثر کہا کرتے تھے کہ "اگر مجھ میں جو شرائط کہ اِس ارادے کے نباہنے کے لئے ضروری ہوں۔ اُن کی پابندی کے آثار نُمایاں ہوں تو اُس کی عملی پیروی کے لئے مجھے اجازت ملے۔ ورنہ نہیں"۔ اور بیشک اِن کا طرزِ مُعاشرت اُن کے بیان کی پوری تصدیق کرتا تھا۔

اصلاحِ قوم یا فلاحِ مُلک کی نسبت جو جو کچھ خیالات تھے اُن کی عملی پیروی اور پابندی اور اِن کے حصول کے

لئے آپ نے حتّی الوسع ہمیشہ مُناسب اور ضروری کوشش کرتے رہنا اپنا ذاتی فرض سمجھ رکھا تھا۔ اور درحقیقت صِرف اِسی طرح دُوسروں کی اِصلاح ہو سکتی ہے۔ کہ پیشتر خود اپنی اِصلاح کی جاوے اور بعد کو غیروں کی پیروی کی کوشش۔ یہ نہیں کہ "خود را فضیحت و دیگراں را نصیحت" مگر افسوس ہے کہ مُلک میں اِس ضروری اور اِبتدائی امر کی بہت بڑی کمی ہے۔ ہم تین شخصوں کا یہ ارادہ تھا کہ کسی نہ کسی وقت اگر مُمکن ہو تو آپس میں ایک ایسا عہد نامہ کیا جاوے کہ جو جو باتیں کہ دُوسروں کی اِصلاح کے لئے ضروری سمجھی جاویں یا جن جن اُمور کا رواجِ عام دینا منظور ہو۔ اُن کی خود پابندی کرنے کا عہد کیا جاوے اور مثال سے دوسروں پر اثر ڈالا جاوے۔ افسوس! یہ ساری اُمیدیں اِس مشورے کے رُکنِ اعظم کی بے وقت وفات سے نا تمام رہ گئیں۔

مصرع

حیف در چشم زدن صحبتِ یار آخر شُد

اب دیکھئے کیا ہوتا ہے۔

ایک اور بات جو آج کل کے نوجوانوں میں کم پائی جاتی ہے۔ وہ یہ تھی کہ گُفتگو میں خواہ وہ رُوبرو ہو یا پسِ پُشت۔ دُوسروں کے خیالات۔ عقائد اور دِلجوئی کا

بڑا پاس تھا۔ دل میں عموماً سب کی بڑی عزّت تھی۔ یہ نہیں کہ اپنے ہم خیالوں کو چھوڑ کر ساری دُنیا کو بُرا کہنا یا زبان سے ایسی بیساختہ بات نکال دینا کہ کسی کو ناگوار یا گراں ہو سکے۔ زبان سے شاید کوئی ایسی بات نکلی ہو کہ سامعین میں کسی کا دل دُکھ سکے۔ اور لطف یہ کہ کسی کی بے تمیزی سے بُرا نہ ماننا۔ مُتذکرۂ بالا صفت کا ہمارے دوست میں اخیر تک قائم رہنا اُن کی دریا دلی اور نیکی کا بہت بڑا ثبوت تھا۔ ہندوستان میں دوسروں کے خیالات کی پاسداری کم نظر آتی ہے۔ اکثر دیکھا گیا کہ جو اپنے خیالات۔ طریقِ عمل یا طرزِ معاشرت سے ذرا بھی مُختلف ہوا۔ پس وہی موردِ عتابِ عام ہوا۔

یہی دقّت مرحوم کو اپنی مُستقل مزاجی کی بدولت اُٹھانا پڑی۔ شادی نہ کرنا اِن کے عزیز و اقارب اور ہم قوموں کے نزدیک دستوُر و رِواج کے خِلاف اور بُری بات تھی۔ اِس لئے یہ ہو گیا تھا کہ جب اور جہاں اِن کا نام لیا جاتا تھا۔ وہاں اِن کی اِس "ضِد" کا ضرور بالضّرور ذِکر آتا تھا۔ لوگ بھلا بُرا کہنے لگے تھے۔ حیف ہے اِس 'سوسایٹی' پر کہ جس میں کسی نیک نیّت کو اپنے عُمدہ ارادے کی پابندی میں اِس قدر عتاب۔ بے قدری اور زحمت اُٹھانا پڑے۔ مجھے

بہت شک ہے کہ شاید ہی کوئی دُوسرا اِس قسم کے خیال میں کامیاب ہو سکے ۔ مگر راہِ راست پر چلنے میں مرحُوم کو غیروں کی تعریف اور بُرائی کی مُطلق پروا نہ تھی ۔ کہا کرتے تھے کہ اِنسان کئی آقاؤں کی تعمیل نہیں کر سکتا ۔ میں نے چاہے جو ہو ۔ خُدا اور ضمیر کی تعمیلِ حکم کرنا ٹھان لیا ہے ۔ افسوس ہے کہ ہندوستان میں ابھی تک کُنوارے مرد اور عورتوں کے لئے کوئی معقُول جگہ نہیں ۔ اور اِسی جگہ نکالنے کے لئے ہم لوگ اُن کی ہمّت اور بڑھایا کرتے تھے ۔ اور اِس ثابت قدمی کی بدولت آج مُلک کی ایک معصُوم لڑکی کا گلا کٹنے سے بچ گیا ۔ اِس اِرادے کی پابندی میں جو جو دِقّتیں کہ پیش آئیں اُن کا کسی اور طبیعت پر بہت ہی بُرا اثر پڑتا ۔ مگر مغفُور کی پابندیِ عہد میں مُطلق فرق نہ آیا بلکہ دنوں کے ساتھ اور مضبُوط ہوتی گئی ۔

علاوہ اِن سب باتوں کے اور بہت سی عادتیں تھیں جو طلبا میں ضرور ہونی چاہئے ۔ سنجیدگی اور خاموشی ۔ مختصر کلامی ۔ حلم و بُردباری عادت میں تھی ۔ نمائش اور دکھاؤ نام کو بھی نہ تھا ۔

خاموشی اور کم سخنی کی بدولت بہت سے اوصاف دُوسروں پر پوشیدہ رہے تھے اور رہ گئے ۔ خاص خاص

دوستوں کو چھوڑکر اُن کے پُورے پُورے اوصاف اور عالی حوصلگیاں کسی پر نہ ظاہر ہوئیں۔ اِختصار کو مزاج میں اتنا دخل تھا کہ مُجھے اُن کے خُطوط کے اِختصار کی ہمیشہ شِکایت رہی۔ مگر اُس اِختصار میں بھی بغور دیکھنے والوں کو مرحُوم کی خُوبیوں کا پتہ ملتا تھا۔ اور یہی دلیل اُن کی راستی کی ہے۔ طبیعت کسی قدر ہمیشہ مغمُوم رہا کرتی تھی۔ دُعا کے اثر کے بڑے قائل۔ جب کبھی بیماری میں کسی کو خط لکھا ہمیشہ دُعائے خیر کے لئے درخواست کی۔ سہُولت اور سنجیدگی کی یہ کیفیت کہ مرنے کے دو گھنٹے قبل جبکہ خود ہاتھ سے کچھ نہیں لکھ سکتے تھے ایک خط اپنے 'پرنسپل' صاحب کو اور ایک اپنے مُحبّ صادق کو۔ ایک پڑوسی کو اپنی بہن کے ہاتھ لکھوایا تھا کہ جن کے مضمون ذِکر کرتے طبیعت بھر آتی ہے۔ خُدا کرے ہمارے مُلک کے سب طُلبا اِسی طرح راست خیال۔ راست عقیدت اور نیک مزاج ہوں۔ گو آج یہ مجموعۂ خُوبیہا دُنیا میں اپنے دوستوں کا ساتھ دینے کو موجُود نہیں ہے۔ مگر دُعا ہے کہ اِس کی قابلِ تقلید مثال کا نیک اثر اِس کے ہم مکتبوں اور دیگر ہم خیال دوستوں کے دلوں پر ہمیشہ قائم رہے اور خُدا اس کو جنّت نصیب کرے۔

دیانرائن نگم ۔ از کانپور

سیتا جی

تنش جُز پیرہن عُریاں نہ دیدہ
چو جاں اندر تن وکس جاں نہ دیدہ

ہندوستان کی عورتوں کی سرتاج مہارانی سیتا جی کا نام ہمیشہ تک یادگارِ زمانہ رہے گا۔ اور گو اس عصمت اور عفّت کی دیوی اور پاک دامنی کی مُورت کے حالات ہندوستان میں گھر گھر معلُوم ہیں اور آج بھی یہاں کی مستُورات کے لئے چراغِ ہدایت کا کام دیتے ہیں۔ تاہم اُن کی پُر سبق زندگی چاہے جتنی بار دُہرائی جائے۔ کبھی لُطف۔ دلچسپی اور فائدے سے خالی نہ ہوگی۔ ہندوستان کی پاک دامن وفا شعار اور شوہر پرست مستُورات میں اُن کا رُتبہ سب سے بڑھ کر ہے۔ حالانکہ یہاں کی ہزارہا پاک دامن عورتیں اپنی عِصمت قائم رکھنے کے لئے جل کر خاک میں مل گئی ہیں۔ ہزاروں نے محلوں کے دریچوں سے کُود کر اپنی جان دے دی ہے۔ مگر پھر بھی جتنے سخت اِمتحانات۔ مصائب اور مُشکلات سیتا جی کو اپنی زندگی میں درپیش آئے اور کسی کو نہیں دیکھنے پڑے اور ساتویں دُشمن کو بھی نصیب نہ ہوں۔ اور جس صبر جس اِستقلال۔ جس متانت اور مردانگی سے اُنھوں

نے اپنی غیر معمولی مشکلات جھیلی ہیں اُس کی مثال اور جگہ نہیں دیکھ پڑتی ہے ۔ آج ہم اُن کی پاک اور بے لوث زندگی پر ایک سرسری نظر ڈالتے ہیں ۔ اور ہم کو اُمید ہے کہ انصاف پسند ناظرین خود قائل ہو جائیں گے کہ جس عزّت اور ادب سے آج کے دن بھی اُن کا نام لیا جاتا ہے بیشک وہ اِسی کی مُستحق ہیں ۔

سیتا جی کی زندگی کا کوئی پہلو ایسا نہیں ہے کہ سبق دِہ نہ ہو ۔ کوئی واقعہ نہیں کہ نتیجہ خیز نہ ہو ۔ کوئی حال نہیں کہ ادب آموز نہ ہو ۔ کوئی تذکرہ نہیں جو قابلِ تقلید نہ ہو ۔ چھوٹی سے چھوٹی بات اور ذرا سے ذرا واقعہ بھی اخلاقی سبق سے خالی نہیں ہے ۔ معلوم ہوتا ہے کہ اُن کی پاک زندگی دُنیا کی ہدایت ہی کے لئے پیدا کی گئی تھی ۔ اُن کی پاک دامنی کی زبردست مثال اور اُن کی ذاتِ پاک پر یہاں کی عورتیں جس قدر ناز کریں دُرست ہے ۔ کیونکہ عصمت و عِفّت ۔ لیاقت و متانت ۔ ہمّت و اِستقلال ۔ رحم و انصاف ۔ عقل اور فہم ۔ عادت و اخلاق ۔ وضع اور قطع ۔ غرض جو کچھ اور جس قدر کہ دُنیا کی اعلیٰ ترین عورت میں ہو سکتا ہے ۔ اُس کی ایسی زبردست نظیر مُشکل سے مِل سکتی ہے ۔

سیتا جی کے مولد و منشا ہونے کی عزّت جنک پور کو

حاصل ہے۔ جو کسی وقت راجہ جنک کا دارالخلافت تھا۔ جن کے علم و فضل کی شُہرت آج تک ہندوستان میں گونج رہی ہے۔ جنک پور کا دربار اِس وقت علم کی قدر دانی اور علما کی حوصلہ افزائی کے لیئے مشہورِ روزگار تھا۔ دربار میں ہمیشہ علم ہی کا چرچا رہا کرتا تھا اور دُور دُور کے عالم و فاضل۔ راجہ کے یہاں ہر چہار طرف سے آکر جمع ہوا کرتے تھے۔ مہاراجہ جنک نے اپنی آنکھوں کی پتلی سیتا جی کو جو تعلیم دی ہوگی اُس کا اِسی سے اندازہ ہو سکتا ہے۔ قدیم ہندوستان میں لڑکیوں کی تعلیم لڑکوں سے مُختلف ہوا کرتی تھی۔ اور سیتا جی کی بھی اُنھیں قواعد کے مُطابق ہوئی ہوگی۔ اِس میں بہت عجیب و غریب باتیں جو فی زمانتا ہند میں معدُوم ہوگئی ہیں شامل رہتی تھیں۔ گھر گرستی اور خانہ داری کے لوازمات۔ با قاعدہ سکھلائے جاتے تھے۔ بہت ایسے کار آمد چٹکلے بتلائے جاتے تھے کہ جن سے اِس وقت کی خاتونیں اپنے شوہروں کی دلچسپی اور خوشی کی خاطر کوئی سامان مُہیّا کرسکیں اُن کی تعلیم عمُوماً بہت وسیع اُصولوں پر ہوا کرتی تھی۔ بہت سی باتیں جن پر اب بالکل توجّہ نہیں ہے اور بہت سے ایسے ہُنر جو اَب بُرے تعلّقات کے سبب مذمُوم سمجھے جاتے ہیں۔ اِس وقت لڑکیوں کی تعلیم میں داخل تھے۔ شاہزادی

سیتا کی تربیت ایک خاص اِمتیاز سے ہوئی تھی - اور باوجود اِس لاڈ اور پیار کے جو مہاراجہ جنک اور اُن کی رانی کو اُن کے ساتھ تھا - اُن کی تعلیم میں کسی قسم کی خامی نہیں ہونے پائی تھی - گرستی کے معمولی فرائض اور روز مرہ کی خِدمات میں بھی وہ ویسی ہی مُستعد تھیں جیسے کہ زندگی کے اعلیٰ فرائض کے لئے -

جنک جی کی خِدمت ایک غریب مگر نیک لڑکی کی طرح وہ بڑی سرگرمی سے کیا کرتی تھیں - اِن خدمات کو جو سیتا جی بڑی خوشی اور شوق کے ساتھ روز مرہ بلا ناغہ انجام دیا کرتی تھیں - آج کل کی شاہزادیاں شاید ننگ و عار سمجھیں - ذرا ذرا سے کام خود کرنا اِن کا روز کا معمول تھا - مثلاً جنک جی کی پوجا کے لئے کُل سامان یہ خود کیا کرتی تھیں - اور روز اپنے ہاتھ سے زمین پر چَوکا دیا کرتی تھیں -

خیر اِسی طرح پر درس و تدریس علمی اور عملی سبق آموزی میں بچپن گذرا - اب وہ وقت آیا کہ جنک جی کو شادی کی فکر ہوئی اور یہ خواہش ہوئی کہ یہ دُرِ یکتا کسی یگانۂ روزگار کو نصیب ہو - شادی کے وہ لوازمات بلکہ قیدیں جو آج کل ضروری ہوگئی ہیں اُس وقت خواب و خیال میں نظر

نہیں آتی تھیں۔ آج ہم اُس وقت اور اپنے بد نصیب زمانے کا مُقابلہ کرتے ہیں تو زمین و آسمان کا فرق نظر آتا ہے۔ شادی کا وہ اندھا دُھند طریقہ جو آج کل لازمی اور لابدّی ہوگیا ہے اُس وقت ناپید تھا۔ افسوس زمانے نے ایسا پلٹا کھایا کہ اگلے وقتوں کی کُل عُمدگیاں معدُوم ہوگئی ہیں۔ سیتا جی کی عُمر شادی کے وقت میں صحیح صحیح نہیں کہہ سکتا ہوں۔ مگر مُجھ کو یاد ہے کہ کسی مقام مُستند میں ۱۸ برس لکھی گئی ہے۔ بہر حال سیتا جی کے مختلف کلاموں اور گفتگوؤں سے جو اُنھوں نے اپنی سہیلیوں اور خود اپنے دل سے کیں۔ یہی ثابت ہوتا ہے کہ جنک جی نے اِن کی شادی میں کسی قسم کی جلدی یا تعجیل نہیں کی تھی۔ اور بھی بہت سی باتیں ہیں جو اِس امر پر دلالت کرتی ہیں۔ اور جہاں تک ہم نے تلاش کی ہے سیتا جی کی بیجا کم سنی میں شادی ہونے کا کوئی ثبوت نہیں ملتا ہے۔ غرض کُل حالات اِس بات پر مُتّفق ہیں کہ سیتا جی اپنی شادی کے وقت۔ کیا بلحاظِ عُمر اور کیا باعتبارِ لیاقت ہر طرح سے شادی کی بھاری ذمّہ داریاں اور اپنے بڑے مرتبے کی خِدمات انجام دینے کے لئے پورے طور سے تیّار تھیں۔ جس طرح سے کہ اُن کی شادی مہاراجہ رام چندر جی کے

ساتھ ہوئی سب کو معلوم ہے۔ اور ہم کو اِس قصّے کے دُہرانے کی ضرورت نہیں ہے۔ اَجودّھیا اُگر جس سچّی خوشی سے اِن دونوں پاک نفسوں کے برسوں گذرے وہ ہر ایک کو نصیب ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ شادی کے ساتھ ہی رام چندر جی اور سیتا جی ایک جان دو قالب ہوگئے۔ اِن کی علٰحدہ علٰحدہ زندگی اُسی دن مُنقطع ہوگئی اور دونوں ایک ہی زندگی جینے لگے۔ واقعی ہم کو اِن پاک ذاتوں کو واحد ہی خیال کرنا چاہیئے۔ کیونکہ ایک دوسرے کی نیکی کا اِس قدر باہمی اثر پڑا کہ ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ کون سی صفت سیتا جی میں اُن کی خاص ہے اور رام چندر جی میں کون سی خُصوصیت صِرف انھیں کی علٰحدہ ہے۔ ایک نے دوسرے کی طبیعت پر سونے پہ سوہاگے کا کام دیا۔

اِن کے آرام و آسائش کے لئے اُس وقت مہاراجہ دسرت سے چکروتی راجہ کی دولت اور دباؤ۔ روپیہ اور ذریعے سے جو کچھ مُہیّا ہو سکتا تھا سب موجود تھا۔ آپ کے محلِ خاص کی جھلک جادو نگار بالمیک نے ہمیں صِرف ایک ہی بار دکھلائی ہے اور وہ بھی کچھ یوں ہی سی۔ مگر اِس پر بھی اُس کی شان و شوکت۔ تزک و اِحتشام۔ ساز و سامان۔ رونق اور سجاوٹ دیکھ کر چکاچوند ہو جاتی ہے

اور دیر تک اِس پر نگاہ نہیں ٹھہر سکتی۔ سیتا جی کے پینے کے لئے جنک پور سے کملا کا پانی ہمیشہ آیا کرتا تھا تاکہ طبعِ مُبارک پر تبدیلِ آب و ہوا کا بُرا اثر نہ پڑے۔ اِس عیش و کامرانی میں بھی سیتا جی نے نیکی اور رحم کے فرائض میں کبھی سرِ مُو بھی پہلو تہی نہیں کی۔ ہر کس و ناکس کے ساتھ اِن کا برتاؤ دُنیا کی عورتوں کے لئے ایک قابلِ تقلید نمونہ ہوگیا ہے۔ اور اِس قسم کی باتیں میرے نزدیک ہندوستان کی اعلیٰ ترین میراث ہیں۔

اب وہ مُشکل وقت آیا کہ جب رام چندر جی کو یکایک جِلا وطنی کا حُکم ہوا۔ اور جس روز اُن کے سر پر تاجِ خُسروی اور لباسِ شاہی زیبِ تن ہونے کو تھا۔ جس روز ساری اجودھیا ہر دل عزیز ولیعہد کی تخت نشینی کی خوشی منانے کو تھی۔ اُسی روز اُن کو جامۂ گدایانہ پہننے اور بن رہنے کو تجویز ہوا۔ جس خوشی۔ مُستعدی اور خندہ پیشانی سے یہ باپ کے قول نباہنے پر تیار ہوگئے۔ جس طرح پیارے باپ نے اُن کے بِروگ میں جان دے دی اور جو تہلکہ کہ ساری اجودھیا میں اِس واقعۂ جانکاہ سے پڑگیا تھا۔ سب کو معلُوم ہے۔ ہماری اِس وقت اِس دردناک 'سین' کے اُس پہلو پر نظر ہے کہ جس میں رام جی

سیتا جی کو گھر میں رہنے اور ساس سسر کی خدمت کرنے
کے لئے صلاح دے رہے ہیں ۔ رام جی اِنھیں بن کی
زندگی کی مصائب ۔ مشکلات اور تکلیفات سمجھا رہے ہیں
اور دسرت اور کوشیلا جی اُن کے قیام کے لئے اِصرار کر
رہے ہیں ۔ سمنت وزیر اور گرو بشسٹ کہہ رہے ہیں ۔
کہ جنگل میں تنہا سیتا جی کا رام چندر جی کے ساتھ جانا کسی
طرح مصلحت نہیں ہے ۔ یہ ایسا مشکل وقت تھا کہ بڑی
بڑی عاقلہ اور مستقل مزاج عورتیں ہراساں ہوجاتیں ۔ بڑا
شش وپنج کا باعث یہ تھا کہ ساس سسر کی اطاعت بھی
فرض ہے ۔ گرو کے بھی احکام واجب التعظیم ہیں ۔ جنگل کی
مصیبتوں کا خیال خود ہی ایسا تھا کہ بڑوں بڑوں کے دل
ہل جاتے ۔ مگر جس مستعدی ۔ اِستقلال اور جلدی کے ساتھ
مہارانی سیتا جی نے ایسے مشکل اور ہراسانی کے وقت جبکہ
اور سب پر بدحواسی کا عالم تھا ۔ اپنا ارادہ مضبوط کرلیا ۔
وہ سچ تو ہے کہ آپ ہی اپنی نظیر ہے ۔ مانا کہ اِس گھبراہٹ
کے وقت یہ بڑی تسلی اور مدد تھی کہ رام چندر جی نے
نہ جانے کے لئے کوئی صریح حکم نہیں دیدیا تھا ورنہ مشکل ہوتی
مگر اِس کے لئے بھی سیتا جی کو بڑی کوشش کرنا پڑی ۔ جس
متانت سے اُنھوں نے کل اِعتراضات کو رد کیا اور جس زور

اور خوبی کے ساتھ اُنھوں نے ساتھ چلنے اور رنج و خوشی دونوں میں شریک ہونے کا حق ظاہر کیا۔ وہ خود اُن کی لیاقت اور بُردباری کا سب سے بڑا ثبوت ہے۔ رنواس کے آرام و آسائش کی عادی شہزادی جس گرم جوشی اور مستعدی سے پیادہ پائی کی مصائب اور بن باس کی تکالیف برداشت کرنے کو راضی ہوگئی۔ وہ خود ایک بڑی بات ہے۔ اور لُطف یہ کہ اِس خوفناک تبدیلی سے اُن کے دل پر کُچھ اثر نہ ہوا۔ اُنھیں صِرف رام چندر جی کے ساتھ رہنے کی آرزو تھی۔ وہ پُوری ہوگئی۔ اور کسی تکلیف و آرام کا کیا خیال تھا؟ اُنھوں نے اپنا کُل زیور و اسباب چلتے وقت غُربا کو تقسیم کردیا۔ اور وقتِ رُخصت پر سیتا جی نے اپنی ساس سے صِرف یہی کہا کہ "میری بدقسمتی ہے کہ میں آپ کی زیادہ خدمت نہ کرسکی"۔ پس اِس کے سوا اِن کے دل میں کسی قسم کے ملال کا خیال بھی نہ تھا۔

جنگل میں پہنچ کر سیتا جی نے بہت سے کام اپنے ذمّہ لئے کہ جن میں سے مُن پتنیوں یعنے فُقرا اور رشیوں کی عورتوں کی خِدمت خُصوصیت سے ذکر کے قابل ہے۔ خیرات اور نیک کاموں اور غُربا پروری کا اِس قدر شوق تھا کہ راج گدّی یعنے تخت نشینی کے بعد جب مہاراجہ رام چندر

جی نے سیتا جی سے بردان مانگنے کی درخواست کی تب اُنھوں نے یہی خواہش ظاہر کی کہ مجھ کو مُن پتنیوں کو کپڑے تقسیم کرنے کی اجازت ملے -

اِسی طرح پر جنگل کی زندگی کے ہزاروں واقعے ہیں کہ جن کے مفصّل بیان کے لئے ایک دفتر چاہئے - اِن کے اوصاف درحقیقت اِس مصیبت ہی کے زمانے میں بخوبی روشن ہوئے - اور اِس کے بعد لنکا میں جو جو مصیبتیں اُنھوں نے جس ہمّت اور اِستقلال سے جھیلیں اِس سے اُن کے صفاتِ ظاہری و باطنی کا حال معلوم ہوتا ہے - برداشت کی یہ کیفیت کہ باوجود ہزاروں مصیبتوں کے کبھی حرفِ شکایت زبان پر نہ آیا - لنکا کی خوفناک عورتیں راون کے حکم سے انھیں طرح طرح کی ایذا رسانی کیا کرتی تھیں - اِن کی آٹھ پہر کی اذیّتیں اُن کی زندگی کو وبالِ جان کئے تھیں - وہ اُن کو اتنا حیران و پریشان اور اِس قدر دق کیا کرتی تھیں کہ ایک آدھ بار اُنھوں نے خودکشی کا ارادہ کیا - مگر پھر اُسے گناہ اور رام چندر کی تکلیف کا باعث خیال کرکے اِس سے باز رہیں - لنکنیوں کو درکنار راون تک کو سیتا جی نے اپنی زبان سے کبھی کچھ نہیں کہا - بہت تنگ ہونے پر صرف اِس قدر کہدیا کرتی تھیں کہ "تم

تنگ کرو۔ مار ڈالو۔ کھا جاؤ۔ چاہے کچھ کرو۔ میں راون کو ہرگز قبول کرنے کی نہیں"۔ جب راون خود آتا اور دھمکیاں دیتا تھا۔ تو اُس وقت یہ بڑی جرأت اور متانت سے یہ کہدیا کرتی تھیں کہ "میں رام چندر جی سے اِس طرح ملی ہوں جیسے سورج سے اُس کی کرنیں اور روشنی۔ اور کسی طرح علٰحدہ نہیں ہوسکتی"۔

مگر نیکی اور رحم دلی۔ اخلاق اور کرم کبھی بیکار اور بے اثر نہیں ہوئے ہیں۔ آخر کار لنکا کے سخت اور ہیبت ناک موذیوں کو بھی سیتا جی نے اپنے اخلاق اور نیکی سے فتح کرلیا۔ اور اُن کو اپنے برتاؤ سے اِس قدر خوش کرلیا کہ اُن میں سے اکثر اِن سے دوستانہ ملنے لگیں اور یہاں تک کہ اِن کو روز کی لڑائی اور راون کے دربار کا حال روز مرّہ بتلا جایا کرتی تھیں۔ یہ نیک مزاجی۔ حِلم اور خُلق اُن کے طبعی مزاج کے جُزوِ اعظم تھے۔ نہ کہ اِس وقت مصلحتِ وقت کے خیال سے اختیار کرلئے گئے تھے۔ اِس کے ثبوت کے لئے ہم کو کہیں دُور نہیں جانا ہے۔ کیونکہ فتحِ لنکا کے بعد جب ہنومان جی فتح کی خوش خبری دینے اور اِنھیں بڑے تُزک و احتشام سے لے جانے کے لئے آئے۔ تب اِس مژدے کی خوشی میں سیتا جی نے اُن سے کہا کہ مانگو جو کچھ مانگنا ہو۔

ہنومان اُن کی مُصیبت اور اذیّت کی کیفیت ایک دفعہ خود اپنی آنکھوں سے دیکھ گئے تھے اور اُن کے دل میں اِس ظالمانہ برتاؤ کے انتقام کی خواہش سمائی ہوئی تھی ۔ بھلا اِس کے سوا اور کیا مانگتے ؟ یہی کہا کہ آپ مُجھ کو اِجازت دیں کہ میں اِن سب کو آپ کے رُوبرو ہی مار ڈالوں ۔ سیتا جی نے اِس وقت اِس عالی ہمّتی اور رحم دلی سے جو ہمیشہ اِن کی خصلت تھی ۔ یہی کہا کہ "نہیں ۔ اِنھیں معاف کرو اِن کو ہرگز تنگ مت کرو ۔ یہ دوسرے کی نوکر تھیں"۔

اُن کی عالی ہمّتی اور فراخ دلی کی اور بہت سی مثالیں موجود ہیں ۔ بن باس ہونے کے بعد بھی یہ کیکئی اور بھرت جی سے اُسی عزّت ۔ اور محبّت سے پیش آتی رہیں ۔ جیسے کہ جِلا وطنی سے پیشتر ۔

جب رام جی نے اِنھیں کُل زیور اُتارنے اور فقیروں کا سا لباس پہننے کو کہا تھا تب بھی یہ اُن کی تعمیلِ حُکم کے لئے فوراً تیّار ہوگئی تھیں ۔ کیونکہ جب رام چندر جی نے وہ وضع اِختیار کی تو اُنھیں کیا عُذر تھا ؟ اور اُن کے حُکم کی خوشی سے تعمیل کردی ہوتی اگر گرُو بشسٹ اور راجہ دشرت بڑے زور و شور سے اُن کی تردید نہ کرتے ۔ گرُو جی نے کہا کہ رام جی کے ہوتے سیتا جی کو جوگیا بستر ناجائز ہے ۔ اور

مصیبت زدہ راجہ نے کہا کہ میں نے سیتا جی کو بن باس نہیں دیا ہے۔

اِس کے بعد جب بن میں سب لوگ معہ کیکئی اور بھرت جی کے انھیں واپس بلانے کی غرض سے آئے اِس وقت بھی انھوں نے جس شوق سے اپنی سگی ساس کوشیلا جی کی خاطر و مدارات کی اُسی ذوق سے کیکئی جی کی کہ جن کی بدولت انھیں یہ سب مصیبتیں جھیلنا پڑیں۔ اِسی طرح اُن کی صفائیِ قلب کے اور بہت سے ثبوت موجود ہیں۔ کیکئی جی کی شکایت حاضر و غائب انھوں نے کبھی نہیں کی۔ اور نہ اُن کے دل میں اُن کی جانب سے کوئی خیالِ بد تھا۔ اُس میں تو صرف رام چندر جی کی محبت جاگزیں تھی۔ گو سیتا جی کو اُن کے آرام آسائش کی کوشش میں بارہا سخت تکلیفیں اٹھانا پڑیں۔ مگر یہ اپنی جانبازی اور دل سوزی سے دمِ آخر تک نہ باز رہیں۔

ایک بار کا ذکر ہے کہ جنگل میں رام چندر جی سو رہے تھے اور آپ قریب بیٹھی تھیں کہ ایک جنگلی پرند اُن کی طرف جھپٹا اور پیر میں اِس زور سے چونچ ماری کہ فوراً خون بہنے لگا۔ مگر اِس بڑی تکلیف کو یہ خاموشی سے برداشت کر گئیں۔ رام چندر جی کو اُن کے آرام میں فرق ہونے کے خیال سے

نہیں جگایا۔ اِس کے علاوہ اور بہت سے واقعے ہیں کہ جن سے اُن کی اُس بڑی محبت کا جو اُن کو رام چندر جی کے ساتھ تھی ہم کو اندازہ ہوتا ہے۔ یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ انھیں رام چندر جی کے خلاف تاعُمر کبھی کسی قسم کی بدگمانی کیا سوئے ظن کا شان و گمان بھی نہیں ہوا۔ اُن کو ہمیشہ اِن پر اعتمادِ کُلّی رہتا تھا۔ اور اِن کی سچّائی میں اُنھوں نے زندگی بھر کبھی شک نہیں کیا۔ اور خود اتنا خیال تھا کہ جب خُفیہ طور سے لنکا پہنچنے پر ہنومان جی نے یہ کہا کہ آپ میرے کندھے پر ہولیں اور میں آپ کو رات کو آنکھ بچاکر یہاں سے نکال لے جاؤں گا اور رام چندر جی کے پاس پہنچا دونگا۔ اُس وقت سیتا جی نے بڑی نفس کُشی کر کے اُس سے محض اِس لئے اِنکار کیا کہ غیر مرد کا بدن چھُونا پڑے گا۔ مُمکن ہے یہ بھی خیال ہو کہ خود رام چندر جی ہی فتح کر کے لے جاویں تب بات ہے۔

سیتا جی میں ایک اور حیرت ناک بات یہ تھی کہ بڑے بڑے جانکاہ حادثوں میں بھی کبھی اُن کے حواس خطا نہیں ہوئے۔ صفاتِ ذاتی اور اوصافِ قلبی کے ساتھ ہی ساتھ عقل اور دماغ کی تمام خُوبیاں بھی اِن میں اِس درجہ اکٹھی

ہو گئی تھیں کہ جن سے اُن کی نیکی اور رحم دلی۔ خوش خلقی۔ اور فراخ دلی وفا شعاری پر گویا سونے پر سہاگا ہو گیا۔ جو قدرت کہ انھیں حواس پر اور جو ملکہ کہ اُن کو عقل اور فہم پر حاصل تھا اِس کا پتہ ہم کو صرف اِس سے ملتا ہے کہ جس وقت اُن کو راون اُٹھا لے گیا تھا۔ اِس گھبراہٹ اور مصیبت کے وقت بھی اُن کے حواس بجا تھے۔ اور یہ راستہ بھر اپنے زیور اِس غرض سے ڈالتی گئی تھیں کہ شناخت اور تلاش میں سہولیت اور سراغ رسانی میں آسانی ہو۔ جب ہنومان جی لنکا میں خفیہ طور پر اُن کے پاس گئے اور اپنے تئیں رام چندر جی کا پیغامبر بتلا کر نشانی کے لئے رام چندر جی کی انگشتری دکھائی۔ اُس وقت اُنھوں نے حقیقتِ حال اور اُن کی صداقت دریافت کرنے کے لئے جو جو جرحیں اور سوالات کئے ہیں وہ اِن کی عقلمندی۔ ضبط اور لیاقت پر دلالت کرتے ہیں۔ راون کی چالاکی اور مکاری سے بعید نہ تھا کہ کسی کو مصنوعی پیغامبر بنا کر اِن کا دل ٹٹولنے کے لئے بھیج دیتا۔ اُنھوں نے ہنومان جی کو پیشتر کبھی دیکھا نہ تھا۔ اتنی بڑی عاقلہ ہو کر یہ فوراً یقین کرتیں تو کیونکر؟ ہجران نصیب دل میں رام چندر جی کا حال دریافت کرنے کا شوق حد کو پہنچ گیا تھا۔ مگر عقل مانعِ تعجیل تھی اور عقل ہی نے اِس دلی جوش پر فتح پائی۔

سیتا جی کا یہ تذکرہ ادھورا ہے۔ ہمارا ارادہ تھا کہ ہم اِن کی

دُنیاوی زندگی پہ ایک سرسری نظر ڈالیں ۔ مگر زیادہ طوالت کا خوف مجبور کر رہا ہے کہ اس وقت کے لئے یہ پاک تذکرہ یہیں پہ ختم کیا جائے ۔ اُمید ہے کہ سیتا جی کی پاک اور عدیمُ المثال زندگی کا مختصر ذکر بھی دلچسپی اور سبق سے خالی نہ ہوگا ۔

دیا نرائن نگم

نادر شاہ

مُعتبر تاریخوں کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مورّخوں نے نادر کی ابتدائی حالت مفصّل بیان کرنے میں خاموشی سے کام لیا ہے ۔ اور حقیقت تو یوں ہے کہ اگر وہ کوئی خاندانی رئیس ۔ سلطان ابنِ سلطان یا امیر ابنِ امیر ہوتا ۔ تو اِس کے ابتدائی سوانح عمری بیان بھی کئے جاتے ۔ مگر جبکہ محض اُس نے اپنی جُرأت اور بہادری ہی سے ایشیا کو تھرّا دیا تو اِس کی فُتوحات کے کارنامے جو اب تک زمانے کے صفحات پہ جگ جگ کر رہے ہیں بیان کرنے مناسب معلوم ہوتے ہیں ۔

ابتدائی حالت اگرچہ مورّخین نے بیان بھی کی ہے تو وہ صرف اتنی ہے کہ نادر قبیلہ افشار میں سے اور امام قلی کا لڑکا تھا ۔ ایک مورّخ لکھتا ہے کہ اِس کا باپ اپنی قوم میں نہ تو صاحبِ اعتبار ہی تھا اور نہ کوئی منصبِ جلیل رکھتا تھا ۔ خود

نادر نے بھی کبھی بزرگیِ نسب کا دعویٰ نہیں کیا۔ اِس طرح سے اِس کا حسب و نسب تاریکی میں ہے۔ اور بقول اِس کے "نادر شاہ پسر شمشیر۔ شمشیر پسر زادۂ شمشیر ہم چنیں تا ہفتاد بار بشمار" ٹھیک ہے۔ بہادر کے ماں باپ تلوار ہی ہوتے ہیں۔ لیکن اُس کا خوشامدی مؤرخ میرزا مہدی۔ جس نے نادر کے واقعاتِ عمری اور محاربات کے حالات قلمبند کئے ہیں۔ لکھتا ہے کہ نادر شاہ کا باپ اپنی قوم میں ایک معزز شخص تھا اور اس طرح سے حقیقت کو مٹاتا ہے۔ گوہرِ شاہوار کی قدر و قیمت اِس کے رنگ و خوبی کے لحاظ سے ہوتی ہے۔ نہ معدن کے سبب سے۔ سر جان مالکم اپنی مبسوط تاریخِ ایران میں لکھتے ہیں کہ "نادر شاہ اوائلِ حال میں پوستین دوز تھا اور اِسی پیشے سے اوقات بسری کرتا تھا۔ چونکہ رذیل الکسب تھا۔ اِس لئے اِس کی صحبت بھی اپنے ہم پیشہ لوگوں سے تھی۔ جب محمد شاہ بادشاہِ ہندوستان کی لڑکی سے نادر نے اپنے بڑے بیٹے کا نکاح کرنا چاہا۔ تو بیٹی والوں نے کہلا بھیجا کہ "ہمارے یہاں یہ رسم ہے کہ داماد اپنی سات پشت شمار کرایا کرتا ہے"۔ نادر نے قاصد سے کہا "کہدو کہ آپ کا داماد نادر شاہ کا بیٹا ہے اور نادر شاہ تلوار کا بیٹا ہے اِسی طرح ہفتاد پشت شمار کرلو"۔ ایک معتبر ایرانی مؤرخ اِس طرح سے لکھتا ہے کہ "نادر شاہ

سنہ ۱۱۰۰ھ میں خُراسان کے دیہات میں پیدا ہوا۔ ۱۷ سال کی عُمر میں ازبکوں کے ہاتھ مع اپنی ماں کے گرفتار ہو کر چار سال تک مُقیّد رہا۔ اِس کی ماں تو قید کی تکالیف برداشت نہ کر کے محبس ہی میں چل بسی۔ نادر خُدا معلُوم کِن ترکیبوں سے رہائی حاصل کر کے نکل بھاگا۔ بعد ازاں خُراسان کے ایک امیر بائی بیگ کے یہاں نوکر ہوا۔ امیر کو قتل کر کے اُس کی لڑکی کو بھگا لے گیا۔ اور نکاح کر لیا۔ رضا قلی میرزا اِسی بیگم کے بطن سے تھا۔ اُس وقت میں نادر کی عُمر ۲۱ برس کی تھی۔ تھوڑے عرصے کے بعد اُس نے آوارہ اور بدمعاش لوگوں کی ایک جماعت اکٹھی کر لی اور اُن کا سردار بن کر اطرافِ خُراسان میں غارت گری شُروع کی۔ اور طرح طرح سے لوگوں کو ستایا اور دق کیا۔ رفتہ رفتہ اِس کی بے جگری کے کارنامے صُوبہ دارِ خُراسان کے کانوں تک بھی پہنچے۔ صوبہ دار نے نادر اور اِس کے ڈاکو ساتھیوں کو فوج میں بہ مصلحت بھرتی کر لیا۔ اِس وقت ازبکوں سے لڑائی پیش آئی۔ نادر کو تو اِس لڑاکا قوم سے قدیمی بُغض تھا۔ خوب ہی جان توڑ کر لڑا اور ایسی شکست دی کہ جب تک نادر زندہ رہا وہ بارادۂ غارتگری ایران کی طرف نہیں آئے۔ صُوبہ دار نے خُوش ہو کر امارت اور مالداری پر ترقّی کر دی۔ لیکن تھوڑے عرصے بعد

صوبہ دار نادر کی ناہنجار حرکات سے رنجیدہ ہو گیا۔ اور بہت کچھ برا بھلا کہہ کر نکال دیا۔ نادر پیچ تاب کھاتا ہوا مشہد چلا گیا۔ اِس وقت میں نادر کا چچا قلات میں افشار کے چھوٹے سے گروہ کا سردار تھا۔ نادر مشہد سے سیدھا اُس کے پاس گیا اور تھوڑے دنوں تک اُس کے پاس قیام کیا۔ لیکن چچا صاحب بھی بھتیجے کی پاجیانہ حرکات سے تنگ آ گئے۔ اور بہت ہی خشم ناک ہو کر قلعے سے نکل جانے پر مجبور کیا۔ غرض جہاں گیا اپنی تلوّن مزاجی اور بیہودہ حرکات سے جم کر نہ رہ سکا

شعر

ایسی بھی کیا تمھاری تلوّن مزاجیاں
قائم نہ تم رہو نہ تمھاری زباں رہے

پھر وہی سابق کا پیشہ اختیار کر لیا۔ پہلے کے دوست و احباب کو جمع کر کے قزاقی اور لوٹ مار شروع کر دی۔ اور پیشتر کی نسبت گروہ کثیر اکٹھا کر لیا۔ ایران اِس وقت افغانوں کی غارت گری اور آئے دن کی لڑائیوں سے نیم جان ہو رہا تھا۔ ادھر نادر لوٹ مار سے اور ناک میں دم کر رہا تھا۔ سلطنت صفویہ کے لئے واقعی یہ وقت بڑی مشکل کا تھا۔ لیکن ابھی افغانوں کے ایران میں پورے طور سے قدم نہیں جمنے پائے تھے۔ البتہ اُن کی دست درازیوں سے

ملک میں بہت سے جرگے جتھے بنائے پھرتے تھے۔ غرض کہ اس زمانے میں ہر طرف شور و غوغا برپا ہو رہا تھا۔ اب نادر کی سنیے۔ اُس کی شجاعت و چالاکی کے سبب سے بہتیرے زبردست ڈاکو اُس کے جھنڈے کے نیچے جمع ہو گئے۔ اور رفتہ رفتہ یہ گروہ ایسا مضبوط ہو گیا کہ سلطنتِ صفویہ کے واسطے افغانوں سے بھی زیادہ مہیب ثابت ہوا۔ اور تھوڑے ہی عرصے میں نادری گروہ نے اہالیانِ خراسان کو آ گھیرا۔ اور اُن سے ایک کثیر رقم لے کر چھوڑی۔ جب نادر کے چچا نے دیکھا کہ نادر کا اِقتدار روز بروز بڑھتا جاتا ہے۔ خوف زدہ ہوا۔ اور ایک خط نادر کو لکھا کہ اگر اِس خانہ بدوشی کی زندگی اور لوٹ مار سے باز آ کر شاہِ طہماسپ کی مدد کرو اور اِس کو جنگِ افاغنہ میں میں مدد دو۔ تو ایک پنتھ دو کاج ہے۔ تمھاری بہادری کی دھوم مچ جائے گی اور شاہ مشکور ہوگا وہ الگ۔ نادر بہت خوش ہوا اور اُس نے جواب دیا کہ مجھے منظور ہے۔ لیکن حضرتِ شاہ میرے قصور کاہے کو معاف کریں گے؟ اگر عفو کا وعدہ ہو جائے تو بسر و چشم حاضر ہوں۔

یہ بھی باسانی طے ہو گیا۔ نادر شاداں و فرحاں قلات کی جانب روانہ ہوا۔ اپنے چچا کو ہمیشہ چونکہ سدِّ راہ سمجھتا رہا تھا اور ایک پرانا کینہ بھی تھا کہ اُس نے قلات کے قیام

میں نکال دیا تھا۔ لہٰذا وقت کو غنیمت جان کر قتل کر ڈالا۔ اور اِس طرح جہاں اور بے گُناہ خون کئے تھے وہاں نامۂ اعمال میں یہ بھی درج کرالیا۔ تمام اُمور سے فراغت حاصل کر کے افغانوں کی طرف مُتوجّہ ہوا۔ تائیدِ ایزدی شاملِ حال تھی۔ اور نادر کے ہاتھوں افاغنہ سے ایران کی خلاصی مُقدّر ہوچکی تھی۔ بُری طرح شکست دے کر نکال دیا۔ شاہِ ایران نے بیحد نوازش فرمائی۔ اور سلطنتِ فارس نے خُدا خُدا کر کے نادر کی بدولت آفت سے نجات پائی۔ لیکن اِس آفت سے شاہِ طہماسپ صفوی کو نادر کے ساتھ اِس دانائی اور شجاعت کی وجہ سے ایک گونہ حسد سا ہوگیا۔

نادر افغانوں کے فتنے کو فرو کر کے ایک دوسری مُہم میں مشغُول تھا کہ شاہ نے ایک فرمان واپس آنے کے واسطے بھیجا۔ نادر نے لڑائی چھوڑ کر آنے سے اِنکار کیا۔ بادشاہِ بے مایہ نے اراکینِ دربار کے رُوبرو نادر کو باغی و خائن کے الفاظ سے یاد کیا۔ یہ خبر اُڑتے اُڑتے نادر کو بھی جا پہنچی۔ پھر نادر فوج لے کر اصفہان پر چڑھ دوڑا اور بادشاہ کو مجبور کیا کہ جو شرائط میں تجویز کروں اُن کو منظور کیجئے۔ اِسی میں خیر ہے۔ بندھا خوب مار کھاتا ہے۔ شاہ نے ناچار جیسا نادر نے کہا منظور کیا۔ اُس وقت طہماسپ کا اگر کچھ اختیار بھی تھا۔

تو وہ بھی جاتا رہا۔ مگر نادر اِس کے ساتھ اُس وقت تک کہ سلطنت غصب کرنے کا وقت آ جائے۔ اِحترام سے سلوک کرنا چاہتا تھا۔ لیکن جوڑ توڑ سے غافل نہ رہا۔ اور خراسان کی فتح کے بعد تو کھلم کھلا حرکات و سکنات سے اراکینِ دربار اور رعایا پر ظاہر کر دیا کہ میرے آگے بادشاہی حکم کوئی وقعت نہیں رکھتا۔ مانند اردشیر بابکان کے نادر بھی رات کو جو خواب دیکھا کرتا۔ صبح کو منجموں سے اُس کی تعبیر پوچھتا۔ ایک دفعہ دیکھا کہ ایک چار شاخ کی مچھلی ہے۔ لوگ ہر چند اُس کو پکڑنا چاہتے ہیں۔ لیکن وہ ہاتھ نہیں آتی۔ نادر نے بسہولت اُسے پکڑ لیا منجموں نے اِس کی تعبیر میں سلطنت کی مبارک باد دی۔ لیکن مرزا مہدی لکھتا ہے کہ "چار شاخ کی مچھلی سے مراد اُن چار ممالک سے ہے۔ جو بعد ازاں نادر کے قبضے میں آئے۔ ایران۔ خوارزم۔ ہندوستان۔ توران۔"

جب طہماسپ نے دیکھا کہ شامت اعمال سے بادشاہت برائے نام ہی رہ گئی۔ تقدیر پر راضی ہو کر ایک تاج شاہی مرصع بجواہر اور چار بڑے بڑے شہروں خراسان۔ مازندران۔ سیستان۔ کرمان کی حکومت کا پروانہ نادر کے پاس ایک امیر کے ہاتھ بھیجدیا۔ اور یہ بھی لکھا کہ آپ بادشاہ کا لقب بھی اپنے نام کے ساتھ اضافہ کر لیجئے۔ نادر نے اور تمام بادشاہی

عنایات کو تو قبول کرلیا۔ لیکن لقبِ شاہ کی نسبت خیال کیا کہ اِس کے اختیار کرنے میں سوائے اِس کے کہ دُوسروں کو حسد ہو کیا فائدہ ہے؟ دُوسرے ابھی موقع بھی نہ تھا۔ لہٰذا اِس عزّت سے شکریے کے ساتھ انکار کیا۔

پُروفیسر مرزا حیرت صاحب ترجمۂ تاریخِ ایران مصنّفۂ سر جان مالکم میں تحریر فرماتے ہیں کہ اِسی اثنا میں نادر کے بڑے بیٹے رضا قلی میرزا کی سُلطان حُسین مرزا مرحُوم کی لڑکی کے ساتھ شادی ہوئی۔ نادر نے اگرچہ سُلطان کا لقب اختیار کرنے سے انکار کردیا تھا۔ لیکن ایک امرِ معظّم مخصُوصۂ سلاطین کو اختیار کرلیا۔ حکم دیا کہ جو روپیہ فوج کی تنخواہ میں دیا جائے اُس پر ہمارا نام مسکوک ہوا کرے۔"

دولتِ عثمانیہ کا قبضہ اِس وقت میں اطرافِ عراق و تمام آذر بائی جان پر تھا۔ ابھی نادری سپاہ افغانوں کے تعاقُب کی زحمت سے بھی آسودہ نہ ہوئی تھی کہ نادر تُرکوں کو ایران کی حدُود سے نکالنے چلدیا۔ صحرائے ہمدان میں دونوں لشکروں کا مُقابلہ ہوا۔ تُرکوں نے شکست کھائی اور بے حد نقصان کے ساتھ ہمدان سے ہٹا دیئے گئے۔ یہاں سے فراغت پاکر نادر آذر بائی جان کی طرف متوجّہ ہوا۔ اور تبریز و اردبیل غرض اِس طرف کے کُل بڑے بڑے شہروں کو فتح کرلیا۔

ترکوں کی شکست کی خبر قسطنطنیہ میں پہنچی۔ ینگچری[1] فوج نے اوّل وزیرِ جنگ کو قتل کیا۔ اور بعد ازاں سلطان احمد ثالث کو تخت سے اُتار کر اُس کے بھتیجے محمود خامس کو بادشاہ بنا دیا۔ نادر نے رضا قلی خاں ایک معزز سردار کو سلطان محمود کے پاس پیغام دیکر بھیجا کہ آپ ترکوں کو آذربائی جان خالی کردینے کی ہدایت فرما دیجئے۔ ورنہ مُفت میں بندگانِ خدا کا خون ہوگا۔ نادر تو یہ کارروائی کر رہا تھا اور اِدھر طہماسپ نے (جو اُمرائے دربار کے ہاتھ میں کٹھ پتلی بن رہا تھا) سلطان محمود کو تخت نشینی کی مبارک باد بھیجی۔ اور ابھی رضا قلی خاں کا نتیجۂ سفارت اور تہنیت نامے کا جواب بھی نہ معلوم ہوا تھا کہ بادشاہ بیوقوف اُمرا کے بہکانے سے ایران پائے تخت آرمینیا کی طرف جو ترکوں کے قبضے میں تھا محاصرہ کرنے چل دیا۔ لیکن نتیجہ کچھ نہ ہوا۔ ترکوں سے شکست کھائی۔ اور نادر کی حذاقت و شجاعت سے جو دو چار شہر ترکوں کے ایرانیوں کے قبضے میں آگئے تھے

---

[1] عیسائیوں سے لڑائی میں جو لوگ گرفتار ہو کر آتے تھے۔ اُن کو قواعد سکھلا کر فوج میں بھرتی کر لیتے تھے۔ یہ ینگچری کہلاتے تھے۔ رفتہ رفتہ یہ فوج ایسی زبردست ہوگئی کہ شاہی خاندان میں سے جو شہزادہ اِن کو کثرت سے انعام دینے کا وعدہ کرتا اُسی کو بادشاہ بنادیتے۔ سلطان محمود نے بالکل ان کو تباہ کردیا (مؤلّف)

وہ بھی نکل گئے۔ اب بادشاہ سلامت کو صُلح کی سُوجھی۔ آخر جس قدر مقبوضات تُرکوں کے ایرانیوں کے پاس تھے وہ سب دے کر جان چھڑائی۔ اور پانچ قصبے مضافاتِ کرمان شاہ سے احمد پاشا حاکمِ بغداد کو نذر کرنا پڑے جس کی سعی و کوشش سے صُلح ہوئی تھی۔ اِس ذلیل مصلحت سے ایران کی خوب ہی فضیحت ہوئی۔ اور دیگر سلطنتوں نے نظرِ حقارت سے دیکھا۔ نادر کو جب اِن واقعات کی اطّلاع پہنچی۔ سوچا کہ اب موقع غصبِ سلطنت کا آگیا۔ ایک فرمان تمام اُمرائے ایران کے نام بھیجا کہ ایسی نامردی کے ساتھ صُلح کرلینے سے تو مرجانا بہتر تھا۔ میں فوجِ قاہرہ لیکر آتا ہوں۔ اور جس قدر مُلک طہماسپ کی نادانی سے غیر ہاتھوں میں چلا گیا ہے۔ اُس کو ذرا سی دیر میں لے لیتا ہوں۔ میری فوج ظفر موج جس طرف کو جائے گی فتح اس کے ساتھ ہوگی۔

دشمنِ آتش پرستِ بادپیما را بگو
خاک بر سر کُن کہ آبِ رفتہ باز آمد بجو

اور بعد ہی پیغام سُلطان محمود خامس کو بھی بھیجا کہ یا تو جس قدر مُلک ایران کا لیا ہے واپس کردیجئے۔ ورنہ لڑائی کے لئے تیّار رہیئے۔ احمد پاشا حاکمِ بغداد کو بھی یہی لکھ بھیجا۔ اِن سب اُمور سے فراغت پاکر اصفہان آیا۔ شاہ طہماسپ کو

خوب ہی لعنت و ملامت کی اور بعد ازاں دعوت کے بہانے سے بلاکر اُس کو قید کرلیا اور مع اُس کی خواتین کے خراسان روانہ کردیا۔ مرزا مہدی لکھتا ہے کہ اس وقت اُمرائے لشکر و اُمنائے کشور نے نادر کو تخت و تاج پیش کیا۔ مگر نادر نے دیکھا کہ ابھی تخت پر بیٹھنے کا موقع نہیں ہے۔ شاہ طہاسپ کے ہشت ماہہ لڑکے کو عباسِ ثالث کا خطاب دیکر تخت پر بٹھادیا اور خود اُمورِ سلطنت انجام دینے شروع کئے۔ یہ واقعہ ۱۱۴۵ ہجری میں ہوا۔ مراسمِ جلوس وغیرہ سے فراغت پاکر عظیم الشّان لشکر کے ساتھ بغداد کی طرف روانہ ہوا۔

احمد پاشا حاکمِ بغداد بڑا جنگ آزما اور بہادر سپاہی تھا۔ اسی وجہ سے نادر بھی کیل کانٹے سے خوب درست ہوکر گیا تھا۔ سلطانِ روم کی طرف طوپال عثمان پاشا ایک ترکی سردار جرّار لشکر لیکر احمد پاشا کی مدد کو آیا۔ میرزا مہدی لکھتا ہے کہ طوپال عثمان کے ساتھ کم سے کم ایک لاکھ سپاہی تھے۔ نادر بارہ ہزار سوار حوالیِ بغداد میں چھوڑ کر باقی فوج سمیت سامرہ[1] میں جہاں طوپال لشکر لئے پڑا تھا آیا۔ بڑی خونریز اور سخت لڑائی ہوئی۔ ایسی لڑائی ایرانیوں اور ترکوں میں کبھی نہیں ہوئی تھی۔ اوّل غلبہ ایرانیوں کو رہا۔ ایرانی

---

[1] سامرہ دجلہ کے کنارے بغداد سے ساٹھ میل کے فاصلے پر ایک گانوں ہے۔

سواروں نے ایک ہی ہلّے میں تُرکی سواروں کے قدم اُکھاڑ دیئے۔ لیکن عُثمانی پیادوں نے ایرانیوں کے دانت کھٹّے کردیئے۔ اور ایسے جان توڑ کر لڑے کہ ایرانیوں کو بھاگتے ہی بن پڑی۔ دو مرتبہ نادر کے گھوڑے کے بھی گولیاں لگیں اور اِس کا علَم دار مارا گیا۔ تمام مال و اسباب تُرکوں کے ہاتھ لگا۔ اِدھر بھاگتے ہوئے ایرانیوں کو بغدادیوں نے خُوب تہِ تیغ کیا۔ یہ واقعہ سنہ ۱۱۴۶ ہجری میں ہوا۔

کہا جاتا ہے کہ اِس لڑائی میں ساٹھ ہزار ایرانی قتل ہوئے۔ اگر اِس قدر نہ ہوئے ہوں تو بیس ہزار میں تو شک ہی نہیں۔ اور اِسی قدر تُرک بھی کام آئے۔ لیکن نُمایاں فتح ہوئی۔ نادر مع فوج کے جو بھاگا تو ہمدان[1] آکر دم لیا۔ موقع تو ایسا تھا کہ نادر جس قدر سرزنش بھی فوج کو کرتا بجا تھا۔ لیکن اُس نے دانشمندی سے کام لیا اور سب سپاہیوں کو نہایت تسکین دی اور انعام عطا کیا۔ اُن کو دُشمنوں سے اِنتقام لینے کی تحریص دلائی۔ یہ تدبیر بہت ہی کار آمد ہوئی اور سپاہی نادر کو اپنا سچّا قدردان و ہمدرد سمجھکر بدلہ لینے کے لئے آمادہ ہوگئے۔ ۳ ماہ کے بعد پہلی سپاہ سے بھی زیادہ کے ساتھ نادر نواحِ بغداد میں آموجُود ہوا۔

---

[1] ہمدان سامرہ سے دو سو میل ہے۔

ترکوں میں اب وہ جوش نہ تھا۔ ایک تو وہ تنخواہ کے نہ ملنے سے پریشان ہو رہے تھے۔ دُوسرے سامانِ رسد بھی وقت پر نہ پہنچتا تھا۔ دولتِ عُثمانیہ کا وزیرِ جنگ جو طُوپال عُثمان کا دُشمن تھا۔ اُس نے نہ تو کوئی مدد بھیجی اور نہ رسد و تنخواہ کا خیال کیا۔ مگر تاہم طوپال نے ۲۰ ہزار سوار نادر کے مُقابلے کو روانہ کیے۔ ایرانیوں نے۔ جن کے دلوں میں اِنتقام کی آگ پُورے طور سے سُلگ رہی تھی۔ تُرکوں کے ایک حملے میں قدم اُکھاڑ دیئے۔ اِس خبر کو سُنتے ہی طُوپال عُثمان جس قدر ہو سکا فوج جمع کر کے خود آیا۔ لڑائی شُروع ہوئی۔ ایک ایرانی سوار نے طوپال کو پہچان کر نیزہ اُس کے سینے میں مارا۔ اور سر کاٹ کر نادر کے پاس لے گیا۔ بے سردار فوج کیا لڑتی؟ سب بھاگ گئے۔ نادر نے طوپال کے سر کو مع جسم کے نہایت اِحترام کے ساتھ دفن کرا دیا۔ یہاں سب سے فراغت پا کر بغداد روانہ ہوا۔ اِسی اثنا میں محمد خاں بلوچ کی بغاوت کی خبر پہنچی۔ نادر بوجہ عُجلت اِس شرط پر کہ سُلطان حُسین مرحُوم کے وقت میں قبل از فتنۂ افغانان جس قدر مُلک ایرانیوں کے پاس تھا اور تُرک اُس پر قابض ہو گئے تھے اُس کو واپس کر دیں۔ پاشائے بغداد سے صُلح کر کے فارس چلا آیا۔ ابھی محمد خاں کی آتشِ بغاوت کو فرو کر ہی رہا تھا کہ

خبر پہنچی کہ دولت عثمانیہ نے اِس صلح کو ناپسند کرکے عبد اللہ پاشا حاکم مصر کو اختیاراتِ صلح و جنگ دیکر لشکرِ کثیر کے ساتھ روانہ کیا ہے۔ نادر نہایت جلد آرمینیہ و گرجستان فتح کرتا ہوا قارص پہنچا اور ایک دم سے طفلس۔ گنجہ اور ایران کا محاصرہ کرلیا۔ قارص میں عبد اللہ پاشا نہایت اِستحکام کے ساتھ مورچہ بندی کرکے پڑا ہوا تھا۔ نادر کا اِن تینوں شہروں کا محاصرہ کرلینے سے یہی منشا تھا کہ پاشا باہر آکر لڑے گا۔ کیونکہ مورچے بہت مستحکم اور دشوار گذار تھے۔ عبد اللہ پاشا اپنے لشکر کی زیادتی پر مغرور ہوکر باہر نکل آیا۔ مرزا مہدی لکھتا ہے کہ ترکی لشکر میں ساٹھ ہزار سوار اور پچاس ہزار پیادے تھے۔ نادر نے لشکر کی زیادتی پر خیال کرکے افسرانِ فوج کو جمع کیا اور کہا۔ اِس میں شک نہیں کہ ہمارا لشکر ترکوں کے آٹھویں حصے کے برابر بھی نہیں۔ مگر جو بہادری کا جوش ہمارے سپاہیوں میں ہے۔ اُس کا شمہ بھر بھی اُن میں نہیں۔ رات میں نے خواب دیکھا ہے کہ ایک قوی جانور میرے خیمے میں گھس آیا ہے اور مجھے ہلاک کرنا چاہتا ہے۔ مگر میں نے نہایت چابک دستی کے ساتھ اُسے مار ڈالا۔ یہ نیک فال اور فتح کی دلیل ہے۔ اگر ہم دیکھیں گے کہ ترکوں کو غلبہ ہے تو ایران نزدیک ہے وہاں چلے جائیں گے۔ اوّل تو ایسا ہوگا نہیں۔ اِن کلمات نے سپاہیوں

کے دل میں ایک جوش پیدا کردیا۔ نادر عمدہ طریقے سے سپاہ کو آراستہ کرکے خود ایک دستہ چیدہ چیدہ سواروں کا ساتھ لے کر اوّلاً قضائے مُبرم و اجلِ محتوم کی طرح حملہ آور ہوا۔ سواروں میں ایسا جوش بھرا ہوا تھا کہ کسی کو تابِ مُقابلہ و یارائے مُدافعت نہ تھا۔ عینِ گرمیِ جنگ میں رستم نام ایک ایرانی سوار نے عبد اللہ پاشا کا سر کاٹ لیا۔ نادر نے سر کو نیزے پر رکھ کر بلند کیا۔ فوج سردار کا سر دیکھ کر بھاگ کھڑی ہوئی۔ ایرانیوں نے تعاقب کرکے ہزاروں تُرک مار ڈالے اور گنجہ و طفلس بھی مفت میں فتح ہوگیا۔ دولت عثمانیہ نے انھیں شرائط پر جو سابقاً پاشائے بغداد اور نادر کے مابین طے ہوئی تھیں صُلح کی۔ اور قارص ایروان جملہ ولایتیں جو پیشتر ازیں ایران کے قبضے میں تھیں واپس کردیں۔ اب نادر نے دیکھا کہ تخت پر بیٹھنے کا موقع ہے۔ میدان صاف ہے۔ عباسِ ثالث کے بھی انتقال کی اِسی درمیان میں خبر پہنچی۔

ایران میں رسم ہے کہ شروع موسم بہار میں ایک عید کی جاتی ہے۔ مُلک بھر میں نہایت خوشی و خرّمی ہوتی ہے۔ شاہِ ایران، اُمرائے سلطنت و اعیانِ دولت کو خلعت و انعام حسبِ مدارج تقسیم کرتے ہیں۔ نادر نے اِس موقع پر جملہ شاہانِ ایران سے زیادہ شان و شوکت دکھلائی۔ اور عارضی طور پہ

ایک نہایت عُمدہ اور نفیس عمارت تیّار کرائی جس میں عیش و عشرت کے جُملہ لوازم نہایت فراخ دلی سے مُہیّا کیے۔ اِختتامِ عید پر جُملہ سردارانِ فوج اور ارکینِ سلطنت کے رُوبرو تقریر کی کہ شاہ طہماسپ اور شاہی خاندان کے شاہزادے موجُود ہیں۔ تم لوگ جس کسی کو پسند کرو بادشاہ بنالو۔ مجھے جو کرنا تھا کرچُکا۔ ایران کو افغانوں۔ تُرکوں۔ روسیوں کے دستِ تظلّم سے نجات دے کر بلا خرخشہ سلطنت بنادیا۔ سب نے کہا کہ سلطنت اُسی کا حق ہے جس نے مُلک کو دُشمنوں سے نجات دی اور وہی اچھّے طور سے انتظام کرسکتا ہے۔ نادر نے انکار کیا اور قسم کھائی کہ میرے دل میں کبھی تخت پر بیٹھنے کی آرزو نہیں پیدا ہوئی۔ اور نہ میں یہ حرکت کرنا چاہتا ہوں۔ غرض ایک مہینے تک برابر یہی جھگڑا رہا کہ لوگ تخت نشین ہونے پر اصرار کرتے تھے اور نادر انکار کرتا تھا۔ آخر جب اُس نے دیکھا کہ رعایا خلوصِ دل سے میرا تخت نشین ہونا چاہتی ہے قبول کرلیا۔ اور ۲۶ فروردین سنہ ۱۱۴۹ ہجری کو آٹھ بجکے ۲۰ 'منٹ' پر منجّموں کی شُبھ گھڑی کے موافق اورنگ جہانبانی پر قدم رکھا۔ مراسمِ جلوس۔ جیسا معمول ہے۔ ادا ہوئیں۔ اور فی الفور مُلک میں یہ سکّہ جاری کیا گیا۔

شعر

سکّہ بر زر کرد نامِ سلطنت را در جہاں
نادرِ ایراں زمیں و خسروِ گیتی ستاں

الخیر فیما وقع

تخت پر بیٹھتے ہی نادر نے حکم دیا کہ حضورِ رسُولِ مقبُول صلّی اللہ علیہ وسلم کی وفاتِ شریف کے بعد چار خُلفا یکے بعد دیگرے سریر آرائے خلافت ہوئے۔ شاہ اسمٰعیل صفوی نے اِس مذہب کو متروک کر کے مذہبِ شیعہ کو رواج دیا اور اِس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اُس وقت سے ایران فتنہ و فساد کا مخزن بن گیا۔ چونکہ اہلِ ایران نے مجھے حاکم کیا ہے۔ میں مناسب سمجھتا ہوں کہ مذہبِ سُنّت والجماعت کی پیروی اختیار کی جاوے۔ لیکن سیّدنا حضرت امام جعفرِ صادق علیہ السّلام ذُرّیاتِ حضرتِ رسُولِ خُدا صلعم میں بُزرگ ترین اور خواص و عوام کے نزدیک واجبُ التّعظیم گنے جاتے ہیں۔ اُن کے اسمِ مُبارک سے اِس مذہب کو موسُوم کیا جائے۔ پس اِس مذہب کا نام مذہبِ جعفری ہوا۔ اور سُلطانِ رُوم سے اِستدعا کی گئی کہ اِس کو پانچواں مذہب خیال فرماویں۔ اور حرمِ مُحترم میں ایک رُکن اِس مذہب کے واسطے بھی مُقرّر ہو۔ عوام نے اِس تبدیلی کو پسند کیا۔

تبدیلِ مذہب کے بارے میں مؤرّخین کے مختلف اقوال

ہیں - لیکن پروفیسر حیرت مرحوم کی رائے قابلِ قیاس ہے - وہ لکھتے ہیں کہ نادر در اصل ایک مذہب کا پابند تھا - اور وہ خود پرستی تھا - جب شاہِ ایران کے سلکِ ملازمت میں تھا اور افغانوں اور ترکوں کا اخراج کر رہا تھا تو اس وقت تک مذہبِ شیعہ کا پابند رہا - کیونکہ یہ مذہب اجرائے مرام کے واسطے عمدہ آلہ تھا - جب اپنی مراد میں کامیاب ہوگیا اور خاندانِ شاہ اسمٰعیل صفوی کے استیصال پر کمر باندھی اور قندھار - ہندوستان موصل فتح کرنے کا ارادہ کیا - مذہبِ تشیع کے ترک کرنے میں مصلحت دیکھی -

جلوسِ سلطنت کے بعد نادر اصفہان میں آیا - اور لشکر کو آراستہ کرکے بجانبِ قندھار روانہ ہوا - حسین قلی خاں برادرِ محمود خاں غلجائی اس وقت میں والیِ قندھار تھا -

فرقۂ بختیاری ہمیشہ اطرافِ اصفہان میں تاخت و تاراج کیا کرتا اور باشندوں کی سخت ضیق کی حالت میں گذرتی - نادر نے اس دفعہ ارادہ کیا کہ اس سرکش گروہ کو بھی مزا چکھانا چاہئے - چنانچہ وہ اوّلاً استیصال کی غرض سے کثیر لشکر کے ساتھ روانہ ہوا - یہ فرقہ اصفہان اور شوستر کے درمیانی پہاڑوں میں رہا کرتا تھا - اور خطرے کے وقت انھیں پہاڑوں کے غاروں میں پوشیدہ ہو جایا کرتا تھا - یہ غار ایسے تنگ اور

کٹھن راستے پر واقع تھے کہ اِن کا دریافت کرنا کسی آہن تن کا ہی کام تھا۔ ورنہ معمولی دلیری کا آدمی تو ہمّت ہار جاتا۔ مگر نادر نے نہایت جرأت سے اُن کے سردار علی مُراد خاں کو پکڑ کر قتل کر ڈالا۔ جب تو سب بختیاری فرقے پر صولتِ نادری بیٹھ گئی۔ نادر نے مضبوط جوانوں کو چُن کر ایک رجمنٹ بنائی اور اِس کا نام بختیار رجمنٹ رکھا۔ یہ فوج ہر لڑائی میں بختیار ہی ثابت ہوئی۔ یہاں سے نادر قندھار روانہ ہوا۔ قندھار کی چاروں طرف قدرتی پہاڑوں نے ہمت میں تزلزل ڈال دیا۔ لیکن نادر نے ایک اور تدبیر سوچی۔ حکم دیا کہ قندھار کے مُقابل میں ایک اور شہر بسایا جاوے اور سب لوگ اُس میں رہیں۔ اور قلعے کے سامنے بُرج بنوا کر توپیں چڑھا دیں۔ اِس طرح سے آمد و رفت کا راستہ بالکل مسدود ہوگیا۔

محمد شفیع الدین خاں

ایک پُرانا روزنامچہ

یکم اکتوبر ۱۸۳۳ء۔ آج مشہور شیرِ میسور کا بیٹا شاہزادہ جہانگیر زماں تاج الدین محمود ہم سے ملاقات کرنے آیا۔ یہ شاہزادہ سال بھر سے زبانِ انگریزی کی تحصیل میں مصروف ہے۔ شاہزادے نے ہم کو اپنے مکان پر مدعو کیا ہے۔

۳۱ دسمبر سنہ ۱۸۲۳ء - شاہ نصیر الدین حیدر نے لارڈ کمبرمیر جنرل عساکرِ انگلشیہ کی آمد آمد کی خبر سُنکر اپنے فرزند کیوان جاہ کو اُن کی پیشوائی کے لئے بھیجا تھا - جنرل موصُوف نے شاہزادہ کی مدارات بحیثیتِ ولیعہدِ سلطنت کی - لارڈ کمبرمیر اور رزیڈنٹ نے آج صبح کی حاضری بادشاہ کے ساتھ کھائی - دعوت کے بعد بادشاہ کی طرف سے زر دوزی کے کپڑے - شال - پشمینہ - ڈھاکے کی ململ کے تھان اور رُقومِ جواہر ہر ایک مہمان کو بقدر اُس کے منصب اور عہدے کے بطورِ تحفہ دیے گئے - اِس رسم کے اِختتام کے بعد تحفہ جات کی تمام کشتیاں رزیڈنسی کے توشہ خانے میں بطورِ امانتِ ایسٹ انڈیا کمپنی داخل ہوئیں -

کرنل گارڈنر چند روز ہوئے لکھنؤ آئے - اُن کی بیوی ایک ہندوستانی والیِ ملک نواب کی بیٹی ہے اور اُن کے لڑکے کی شادی بادشاہِ اودھ کی منکوحہ بیوی کی حقیقی بہن سے ہوئی ہے - کرنل گارڈنر یہاں شاہزادے کے والد مرزا سلیمان شکوہ سے ملنے آئے تھے - صاحبِ عالم بہادر کے ۱۲ لڑکے اور ۴۰ لڑکیاں ہیں - کیا تم نے کبھی کسی ایسے کثیر الاولاد شخص کا حال سُنا ہے؟ غریب مرزا سخت پریشانی کی حالت میں ہے - اِخراجات کثیر ہیں اور آمدنی بہت قلیل - دربارِ اودھ سے جو پانچ ہزار روپے ماہوار کا وظیفہ ملتا ہے وہ اُن کے بیشمار قرض خواہوں میں تقسیم

ہوجاتا ہے - مرزا کی حال ہی میں اپنے داماد یعنے شاہِ اودہ سے شکر رنجی ہوگئی ہے اور اُن کی طبیعت اب یہاں سے بالکل اُچاٹ ہوگئی ہے - کرنل صاحب یہاں اِس نیک اور قابلِ تعریف ارادے سے آئے تھے کہ مرزا صاحب کے قبائل کو دہلی لے جائیں جہاں اُن کا خیال ہے کہ اُن کے گذارے اور بُود و باش کے لئے خاطر خواہ اِنتظام ہوجائے گا - ابھی حال ہی میں مرزا کی سترہ لڑکیوں کی دہلی میں ۱۷ شاہزادوں سے منگنی ہوئی ہے -

اکتوبر ۱۸۳۰ء - نواب معتمد الدولہ آغا میر سابق وزیر غازی الدین حیدر مغفور شاہِ اودہ کانپور آتے ہیں - اِن کے اہل و عیال - خزانہ - توشہ خانہ اور دیگر خانگی اسباب کا قافلہ دریائے گنگا کی دوسری جانب پڑا ہوا ہے - یہاں کی چھاؤنی سے ایک دستہ فوجِ انگریزی کا اِس قافلے کو سرحدِ انگریزی میں حفاظت سے لانے کے لئے بھیجا گیا ہے - آج اُن کے ہاتھی دریا کے اِس پار آئے - دریا آج کل بہت چڑھا ہوا ہے اور اُس کا پاٹ ۴ میل سے زائد ہے -

۵ جنوری ۱۸۳۱ء - ہم آج کل کانپور میں مقیم ہیں - نصیر الدین حیدر بادشاہ کے خیمے دریا کے اِس پار نصب ہوئے ہیں - آمد و رفت کے لئے کشتیوں کا ایک پُل تیار کیا گیا ہے -

سنا جاتا ہے کہ بادشاہ کے ہمراہ جو ہاتھی اور اُونٹ آئے ہیں اُن کی تعداد دو ہزار کے قریب ہے ۔ فوج کے بھی کئی دستے اُن کے ہمراہ ہیں ۔ ۶ تاریخ کی صُبح کو لارڈ ولیم بنٹنگ کے کانپور پہنچنے کی خبر ہے ۔

۷۔ جنوری ۔ آج صُبح ۷ بجے کے قریب بادشاہ مع ایک کثیر تعداد ہاتھیوں اور اُونٹوں اور دیگر سامانِ جلوسِ شاہی کے نہایت شان و شوکت کے ساتھ پُل سے اُترگئے گورنر جنرل بہادر کے کمپ میں ملاقات کے لئے آئے ۔ نصف راہ تک لارڈ ولیم بنٹنگ نے بادشاہ کا اِستقبال کیا ۔ اور حسبِ خواہش بادشاہ انھیں کی زرنگار عماری میں سوار ہوئے ۔ لیڈی صاحبہ مع دیگر خاتونانِ ذیشان خیمۂ دربار کے دروازے کے قریب اِستقبال کے لئے اِستادہ تھیں ۔ مُصافحہ اور مُعانقہ کے بعد گورنر جنرل اور بادشاہ حاضری کھانے کے خیمے میں تشریف فرما ہوئے ۔ بادشاہ کے ساتھ جو اہلِ کار اور مُصاحب تھے ۔ آن کی پوشاکیں بڑی پُرتکلّف تھیں ۔

۸ جنوری ۔ آج گورنر جنرل بادشاہ کے کیمپ میں مُلاقاتِ بازدید کے لئے تشریف لے گئے تھے ۔ اور حاضری بھی سرحدِ مُلک اودھ ہی میں جہاں بادشاہ کا کُمپ پڑا ہوا ہے تناول فرمائی ۔

۱۰ جنوری ۔ آج بادشاہ لکھنؤ کی جانب نہضت فرما ہوئے ۔

گورنر جنرل کل لکھنؤ کی طرف کوچ کریں گے۔

۱۸ جنوری۔ ’گورنر جنرل‘ آج بادشاہ کے ساتھ حاضری کھانے جائیں گے۔ لاٹ صاحب مع دیگر صاحبانِ عالیشان ہاتھیوں پر ’رزیڈنسی‘ سے سوار ہوکر محلات کی طرف روانہ ہوئے نصف راہ تک بادشاہ نے پیشوائی کی۔ اُس وقت کی کیفیت قابلِ دید تھی۔ ’گورنر جنرل‘ اپنے ہاتھی سے اُتر کر بادشاہ کی عماری میں بیٹھے اور بازاروں میں گشت کرتے ہوئے چھتر منزل میں داخل ہوئے۔ کھانا جو نہایت پُرتکلّف تھا سونے کی قابوں میں چُنا گیا تھا۔ کھانے سے فراغت پاکر بادشاہ مع اپنے مہمانوں کے اُس برآمدے میں جو دریا کی طرف واقع ہے تشریف فرما ہوئے۔ دریا کے دُوسرے کنارے میدان میں ہاتھی لڑائی کے لئے مُستعد کھڑے تھے۔ اِس شہ نشین کے نیچے دریائے گومتی عجیب لطافت سے بہتا ہے۔ اِس میں ایک نہایت خوشنما کشتی جس کی شکل مچھلی سے بہت مُشابہت رکھتی ہے پڑی ہوئی ہے۔ بادشاہ اکثر اِس میں سوار ہوکر سیرِ دریا فرمایا کرتے ہیں۔ اِس کی تیّاری میں زرِ خطیر صَرف ہوا ہے۔

۲۱ جنوری۔ آج ہم ’جنرلِ مارٹن‘ کی مشہور کوٹھی موسُوم بہ قُسطنطُنیہ کو دیکھنے گئے تھے۔ اُس کوٹھی میں فیّاض بانی کی وصیّت کے بمُوجب اُس کی وفات کے بعد ایک کالج کھولا گیا

ہے جس کا نام 'لا مارٹنیر' ہے۔ اِس میں انگریزوں کے بچّے
تعلیم پاتے ہیں۔ اُس عالیشان محل کی کما حقّہٗ، تعریف اور
توصیف کے لئے صفحے درکار ہیں۔ اِس کا نقشہ نہایت اچھّا
ہے اور طرزِ عمارت بہُت پسندیدہ ہے۔ سنگِ مرمر کا بڑا
'ہال' قابلِ دید ہے۔ اِس کے نیچے تہہ خانے میں 'جنرل' کی قبر
ہے۔ جنرل مارٹن نے۔ جو قوم کے فرانسیس تھے اور جنھوں
نے 'پنشن' لیکر لکھنؤ میں اِقامت اختیار کی تھی۔ ۱۸۰۰ع
میں اِنتقال کیا اور اُس کثیر دولت کو۔ جو اُنھوں نے
بادشاہِ اودھ کے لئے ولایتی سامان مہیّا کرکے پیدا کی تھی۔
اپنی قوم کے بچّوں کی تعلیم کے لئے وقف کردیا۔

۲۲ جنوری۔ 'گورنر جنرل' آج صبح لکھنؤ سے روانہ ہوگئے۔
ہم نے آج وہ کمرہ بھی دیکھا جس میں شاہی تخت رکھا ہوا
ہے۔ اِس محل میں متعدّد کمرے نہایت شاندار اور نفیس
ہیں اور اکثر میں فوّارے چھُوٹتے رہتے ہیں۔ پرستان کا
سماں نظر آتا ہے۔ حمامِ شاہی بھی قابلِ دید ہیں۔ اِس محل
کے متعلّق جو پائیں باغ ہے اُس کے وسط میں ایک
بارہ دری سنگِ مرمر کی نہایت خوشنما بنی ہوئی ہے۔
جس میں مُنبّت کاری قابلِ ذکر ہے۔ باغ کی بائیں جانب
بیگماتِ شاہی کے رہنے کے لئے مکانات ہیں۔ یہاں ایک

نہایت با رونق باغ اور رمنہ ہے جو دلکشا کے نام سے مشہور ہے۔ ہرن۔ نیل گائے۔ مور اور سب طرح کے شکاری جانور حتیٰ کہ شیر اِس میں چھوٹے ہوئے ہیں۔ بادشاہ یہاں اکثر شکار کے لئے آتے ہیں۔ ایک مختصر سا مکان بھی اِس رمنے میں بنا ہوا ہے۔ جس میں ہر ایک طرح کا سامانِ آسائش بطرزِ احسن موجود ہے۔

۲۴ جنوری۔ آج ہم گووند باغ کی سیر کو گئے تھے۔ یہ باغ ایک ہندو ساہوکار نے صرفِ کثیر سے تیار کرایا ہے۔ وہ خود شہر میں ایک معمولی مکان میں رہتا ہے۔ مگر اِس باغ میں جو مکان بنا ہوا ہے اس کے تمام کمرے جھاڑ۔ فانوس۔ شیشوں اور دیگر سامانِ زیبائش سے نہایت عمدہ طرح پر آراستہ و پیراستہ ہیں۔ چھتوں پر مُنبّت کاری کی بیل بہت نفیس بنی ہوئی ہے۔ اِس باغ میں جو جانور خانہ ہے میرے خیال میں پیرس کے جانور خانے سے عمدہ ہے۔ نواب سعادت علی خاں مرحوم کا مقبرہ بھی آج ہم نے دیکھا۔ شاہِ حال اُن کے پوتے ہیں۔ سعادت علی خاں کی خاص بیوی کی قبر بھی اُنھیں کے مزار کے پہلو میں ہے۔ یہ عمارت بھی قابلِ دید ہے۔

شاہِ اودھ کی رعایا سرکارِ انگریزی کی حکومت میں آنا

بالکل پسند نہیں کرتی ۔ یہاں کی رعایا بہ نسبت سرکارِ انگریزی کی رعایا کے زیادہ مرفہ الحال ۔ آسودہ اور خوش معلوم ہوتی ہے ۔

سری رام

شکرستانِ خیال

فسانے اپنی محبت کے سچ ہیں پر کچھ کچھ
بڑھا بھی دیتے ہیں ہم زیبِ داستاں کے لئے

شیرینیاں تو بہت بہت چکھنے میں آئی ہیں اور میوے تو بڑے بڑے خوشگوار میسّر آئے ہیں ۔ مگر جو لطف ایک دوست کی بدولت شکرستانِ خیال میں دیکھا ۔ اُس کو کوئی نہیں پہنچتا ۔ ہم چار تھے ۔ کئی دِن سفر میں رہے ۔ سراؤں اور مسافرخانوں میں رہتے رہتے تنگ آگئے ۔ وہاں کے بے نمک کھانوں سے جی اکتا گیا اور سرائے والوں کی مسافر نوازیوں سے جیبیں ہلکی ہو چلیں ۔ کسی کا یہ کہنا تھا ۔ کہ "آئیے آج شب کے لئے ہمارے یہاں فروکش ہوجیے" ۔ کہ ہم فوراً راضی ہوگئے ۔ اور اگر یہ اسباب نہ بھی ہوتے تو کسی کافر کی مجال تھی کہ اِنکار کرتا ؟ ہمارے دوست نے اِصرار میں کوئی دقیقہ اُٹھا رکھا تھا ؟ ہماری گاڑی کا نظر آنا تھا کہ دوڑتے ہوئے آگئے ۔ ایک ایک

سے مصافحہ کیا اور ایک ایک سے معانقہ۔ معانقے میں وہ مبالغہ کہ ایک دو نازک طبع گھبرا بھی گئے۔ اُن کے چہرے سے گھبراہٹ کے آثار دیکھ کر ہمارے دوست یوں لب کشا ہوئے (اوہو! یہ محاورہ میں نے غلط لکھا۔ لب کشا تو وہ شروع سے تھے اور زبان تو تالو سے لگنے ہی نہیں پائی تھی) "آپ ٹھہرے شہری نازک۔ ہم ہوئے دیہاتی اُجڈ۔ ہم ٹھہرے طالب۔ آپ ٹھہرے مطلوب۔ ہمارے دل کی لگی کی آپ کو کیا خبر؟ تنگ در کنار کشیدن کے مزے ہم سے پوچھئے۔ اِس کے بغیر دل کی لگی کہاں بجھتی ہے؟ ابھی کیا ہے؟ یہ تو تمہیدی معانقہ ہے" اِس پر ایک فرمایشی قہقہہ پڑا۔ کہتے ہیں کہ قہقہہ قُفلِ درِ دِل کے لئے کِلید ہے۔ آپس میں زیادہ کھُلی ڈُلی باتیں ہونے لگیں۔ اُنھوں نے بارہا بہ شدّ و مد فرمایا کہ "آج شب غریب خانے میں رونق افروز ہوں۔ میرے تاریک گھر کا اُجالا بنیں"۔ ہم نے بہ منّت التماس کی۔ کہ "اگلے پڑاؤ پر جانے دیجئے۔ ابھی وقت ہے۔ یا کسی مہمان سرائے میں جانے کی اجازت دیجئے۔ آپ سے ملنے کی مسرّت حاصل ہوگئی۔ یہی غنیمت ہے"۔ مگر کون سنتا تھا؟ اسباب ہمارا باہر پھینک دیا گیا۔ دو چار آدمی اُس کو سمیٹنے اور کمرے کی طرف لے جانے لگے اور ہمارے با ہمّت میزبان اکیلے چاروں کو سمیٹے ہوئے نہایت فاتحانہ ادا

سے شور مچاتے ہوئے فرودگاہ کی طرف لے گئے۔ ہم نے اپنے آپ کو ایک مُتکلّف اور آراستہ کمرے میں پایا۔ سفر کی تکان۔ گردو پیش آسائش کے سامان۔ بے تکلّف میزبان۔ بے تکلّف مہمان۔ اگر کسی ایک آدھ کے دل میں ٹھہر جانے کے مُتعلّق تامّل باقی تھا تو وہ بھی جاتا رہا۔ اور گھر کی طرح گھر سمجھ کر ہم وہاں جم گئے۔

میزبان — اِس مکان کا موقع اور منظر ملاحظہ فرمائیے گا۔ اِس سے بہتر مکان اِس شہر میں تعمیر نہیں کیا گیا۔ اِس کی ایک ایک اینٹ اپنی تاریخ رکھتی ہے۔ یہ دروازے جو آپ دیکھ رہے ہیں۔ بے داغ دیودار کے ہیں۔ اور یہ طاق جو اِس دریچے میں لگے ہیں خالص صندل کے ہیں۔ سامانِ آرائش میں دیکھئے میں نے کس کوشش سے مُلکی اور انگریزی مذاق کو جمع کیا ہے۔ اور عُمدہ انگریزی سامان لانے کے لئے مجھے دو دفعہ کلکتہ اور بمبئی تک سفر کرنا پڑا۔

مہمان — حقیقت یہ ہے کہ آپ کا دولت کدہ نوادرِ زمانہ میں سے ہے۔ اور ہماری عین خوش قسمتی ہے کہ ہمیں اِس میں فروکش ہونے کا موقع مِلا۔

میزبان — آپ اسے خانۂ بے تکلّف سمجھئے اور کچھ نہ ہو تو ایک ہفتہ عشرہ تو یہاں قیام فرمائیے۔

مہمان ۔ آپ کمال نوازش فرماتے ہیں ۔ اِس وقت تو اِس قدر مُہلت نہیں ۔ لیکن اگر آپ کی کرم فرمائی کی یہی کیفیت رہی تو کیا عجب ہے کہ ہفتہ عشرہ چھوڑ مہینہ بھر کے لئے آپ کے یہاں کبھی آ ٹھہریں ۔

میزبان ۔ جناب آپ کا گھر ہے ۔ آپ جب تک رہیں ہمارے لئے مُوجبِ فخر و عزّت ہے ۔ واللہ دِلی راحت ہوتی ہے ۔ جب کوئی مہمان گھر آجاتا ہے ۔ مکان بھرا بھرا معلُوم ہوتا ہے ۔ ورنہ بایں ہمہ آرائش سُونا پڑا رہتا ہے ۔ میں ایک جان اِس میں کہاں تک پاؤں پھیلاؤں ؟ زنانہ علٰحدہ ہے ۔ اِس کے ساتھ بھی ایک عُمدہ مردانہ نشست موجُود ہے ۔ کبھی یہاں بیٹھتا ہوں ۔ کبھی وہاں ۔ آئیے آپ کو اُوپر سے اِس مکان کا نظارہ دکھلاؤں ۔

[سب بالا خانے پر جاتے ہیں]

مہمان ۔ آہا کیا دِلاویز منظر ہے ! اُس سامنے کی پہاڑی کو تو دیکھئے ۔ اُس کی سبز سبز رنگت کیسی سُہانی ہے ! دریا کس مزے سے بہہ رہا ہے ! اِس مکان میں رہنا بہشت کا لُطف رکھتا ہے ۔

میزبان ۔ (دل میں پُھولا نہ سماکر) وہ اُونچا مکان جو دُور نظر آتا ہے اِسی عاجز کا ہے ۔ اور وہ مسجد ۔ جس کے

مینار بادلوں سے باتیں کر رہے ہیں ۔ میرے ہی بزرگوں کی بنائی ہوئی ہے ۔ یہ اِس شہر کے اِرد گِرد جو باغات نظر آتے ہیں یہ سب آپ ہی کے ہیں ۔

مہمان — اوہو! اِس کثرت سے باغ اِس شہر کے گِرد ہیں اور یہ سب آپ کے ہیں ؟

میزبان — آپ دیکھیں گے کیسے کیسے نفیس میوے اِن میں اِس وقت تیّار ہیں ۔

[نوکر کو آواز دیتا ہے]

ارے جمّا ! چلو ۔ جلدی بڑے باغ کو دوڑ جاؤ اور مالی سے کہہ دو کہ بہترین ڈالی تیّار کرکے لائے ۔ راستے میں حوض والے باغ کے مالی کو بھی بھیجتے جانا ۔ تاکہ اُس سے پُوچھوں کہ اُس کے یہاں کیا کیا چیز تیّار ہے ۔ (ایک اور نوکر کو آواز دیتا ہے) ارے کوئی ہے ! لپک کے جمّے کے پیچھے جانا اور اُسے کہنا کہ چند خُوبصُورت گُلدستے بھی بنوالائے ۔ اور ایک آدمی اور اِدھر آؤ ۔ دوڑ کے گھر جاؤ ۔ اور چا کا سامان لے آؤ (مہمانوں کی طرف مخاطب ہوکر) معاف رکھئے گا میں کس قدر بیہُودہ واقع ہوا ہوں ۔ چا وغیرہ کی مدارات بالکُل بھول ہی گیا تھا ۔ حقیقت یہ ہے کہ جب کبھی کسی دیرینہ دوست سے مُلاقات ہوتی ہے ۔ دُنیا

و مافیہا سے بالکل بے خبر ہو جاتا ہوں -

مہمان — آپ خواہ مخواہ تکلّف فرماتے ہیں - یہ سیر جو آپ کرا رہے تھے اور جو مسرت آپ کے کمرے کو دیکھ کر ہوئی - یہ کیا کسی مدارات سے کم تھی ؟

میزبان — نہیں صاحب - ایسی بھی کیا مدارات - کہ باتوں ہی باتوں میں ٹال دیا جاوے ؟ آپ سفر سے آئے ہیں - آپ کو سب سے پہلے چا ملنی چاہئے تھی - کوئی ہے ! اِدھر آؤ - غفّار چا کا سامان لینے گیا ہے - تُم دوڑ کر دُودھ اور چینی لے آؤ - چا یہاں موجُود ہے - جلد دم کرو - کوئی اور آدمی ہو تو اُسے نان خطائی لانے کے لئے دوڑا دو - (پھر مہمانوں سے مخاطب ہو کر) یہ بھی فرما دیجئے کہ رات کا کھانا آپ کس وقت کھاتے اور کیا کیا خاص چیز مرغوب ہے - میں ہوں تو غریب آدمی لیکن مہمانوں کی تواضُع اپنی زندگی کا مقصد سمجھتا ہوں - اور یہ تو بتائیے - آپ کو کچھ نغمے کا بھی شوق ہے ؟ ہو تو وہ بھی حاضر کیا جائے - اِس وقت شام کی سیر گاڑی میں کیجئے گا یا کشتی میں ؟ ایک شکاری آپ کے لئے خاص کئے دیتا ہوں - (پھر کسی نوکر کو آواز دیکر) جاؤ اور ہماری خاص سواری کی کشتی جو ہے - اُسے روک لو - کوئی اور لے جانے نہ پائے - کیا کروں لوگ مانگ لے جاتے

ہیں - اور اِنکار کرنا خِلافِ مُروّت سمجھتا ہوں -

اِن سب مُختلف دلچسپیوں اور مدارات کی صُورتوں کا ذِکر اس روانی سے ہمارے میزباں نے کیا - کہ کسی کو رسمی طور پر بھی اِنکار کرنے کی یا یہ جتانے کی کہ آپ تکلّف کیوں کرتے ہیں مُہلت نہ دِی - اور مہمان یہ سمجھ چُکے - کہ یہ شخص بغیر ایسی پُر تکلّف مدارات کے نہ رُکے گا - ایک جہاں دیدہ دوست کسی قدر کھٹکتے تھے اور کہتے تھے کہ جو زیادہ گرجتے ہیں وہ برستے نہیں - مگر کثرتِ رائے اُن کے خِلاف تھی - اور ہر شخص یہ کہتا تھا کہ کبھی ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ ایک ذِی عِزّت آدمی خود ہی اتنی تجاویز مہمانوں کی مدارات کے لئے کرے اور خود ہی اُن سے پھر جائے؟ مُجوزہ لذّتوں کے خیال ہی خیال میں مزے لیتے ہوئے ہر شخص نے مُنہ ہاتھ دھو کپڑے بدلے اور سیر کی تیاری شُروع کی - سیر کا وقت ہو لیا - سب جانے کے لئے بیتاب - مگر ابھی چا نہیں آئی - آخر قرار پایا کہ سیر سے واپس آکر چا پی لیں گے - دُوسرا سوال یہ پیدا ہوا کہ میوے آکر بیکار نہ جائیں - آدمی بھیج دیا گیا کہ باغ ہی میں آتے ہیں - وہیں کھائیں گے - لبِ دریا آئے تو خاص سواری کی کشتی ندارد - کوئی اور صاحب لے جا چُکے تھے (کرائے پر یا مُفت یہ پایۂ تحقیق کو نہیں پہنچا)

ایک ٹوٹی سی کرائے کی کشتی موجود تھی - اُس میں سوار ہوئے - ملاح نے کھینا شروع کیا - کچھ دُور جا چکے تھے کہ میزبان پکارے - "حضرات! یہ فرمائیے کہ آپ اس وقت باغ میں میوہ کھانے کے لئے جانے کا قصد رکھتے ہیں - یا شہر کو بھی دیکھنے کا اِرادہ ہے؟ باغ ابھی یہاں سے چار مِیل ہے - پہنچتے پہنچتے شام ہو جائے گی - اور آتے وقت اندھیرے میں بڑی دِقت ہوگی - آپ صاحبان تھکے ہوئے ہیں - شاید آرام کی بھی جلد ضرورت ہو - آئیے شہر کو ایک نظر دیکھ لیں - اور پھر کھانا کھانے چلیں" - مہمانوں کی مایوسیوں کا گو آغاز ہوگیا تھا - مگر اِس تبدیلِ اِرادہ کو اِتفاقی سمجھ کر اُنھوں نے دِل کو تسلی دی - اور کھانے کے خواب لیتے ہوئے شہر کو مڑے - ایک آدھ گھنٹے میں میزبان کے مکان کے برابر آ پہنچے - مگر یہ وہ مکان تھا جس کو اُنھوں نے زنانہ بنا رکھا تھا - کہنے لگے "آئیے اب کھانے سے یہیں فارغ ہو لیجئے" - مہمانوں نے منظور کیا - جا کر ایک کمرے میں بیٹھے - جس کی دیواروں پر مینا کاری کا کام کیا ہوا تھا - اُس کی تعریف کی - میزبان نے کہا "عِلاقہ بھر میں یہی ایک مکان ہے - جس پر یہ کام اِس عمدگی سے ہوا ہے" - اور مہمانوں سے اجازت چاہی - کہ ذرا آدھ گھنٹے کے لئے اندر ہو آئیں - وہ

گھنٹے اِنتظار میں گزر گئے۔ مگر ہمارے مُتواضع میزبان بر آمد نہ ہوئے۔ اب تو گھبراہٹ شروع ہوئی۔ مکان میں چراغ تک ندارد۔ باتوں سے بھی جی اُکتا گیا۔ تحیُّر کہ کہاں آ پھنسے۔ کہ اتنے میں ہمارے مہمان نواز میزبان کی سرگرم اور بلند آواز پھر کان میں پڑی۔ جان میں جان آئی۔ دُور سے شور سُنائی دیا کہ نوکروں کو ڈانٹ رہے ہیں۔ "میں تو ضرورتاً باہر چلا گیا تھا۔ تُم کیا سب کے سب مرگئے تھے کہ نہ حُقّے کی نہ پانی کی خبر لی؟ اور تو اور۔ چراغ تک جلانے کی کسی کو توفیق نہ ہوئی۔ اچھّا آج کا موقع گُذر لینے دو۔ کل تم سے سمجھوں گا۔ اگر ایک ایک کو چُن چُن کے نہ نکال دوں تو سہی۔ نمک حرام کہیں کے! مُفت خورے جمع ہوگئے ہیں۔ کام دام کچھ نہیں اور نام میاں سُبحانا!" غرض ہمارے میزبان اِس قدر گرم تھے کہ جب کمرے میں داخل ہوئے تو ہمیں بجائے شِکایت کرنے کے کہ اُنھوں نے بہت دیر کی۔ اُلٹا انھیں ٹھنڈا کرنا پڑا اور یہ کہنا پڑا کہ گھر کا مُعاملہ ہے۔ کوئی گھبراہٹ کی بات نہیں۔ ہمیں کوئی تکلیف نہیں ہوئی۔ ہم چاروں آپس میں باتیں کرتے رہے۔ وقت جاتا معلُوم بھی نہیں ہوا۔ اِس سے وہ کسی قدر نرم بھی ہوئے اور کہنے لگے۔ "حقّہ منگواؤں؟" ہم نے کہا۔ حُقّہ اب کھانے کے

بعد ہی پئیں گے۔ اُنھوں نے کہا۔ نہیں۔ حُقّہ تیار ہے۔ اور کھانا بھی ابھی آیا جاتا ہے"۔ حُقّہ آیا۔ ہر ایک نے دو دو گھونٹ پیئے۔ پوچھنے لگے۔ "دیکھا؟ تمباکو کیسا شیریں ہے! ہمارے یہاں تمباکو کڑوا نہیں پسند کرتے"۔ یہ کہہ کر پھر اُٹھ گئے۔ ہم نے سمجھا کہ کھانا لاتے ہیں۔ ایک گھنٹہ پھر گُذر گیا۔ آخر کھانا آیا۔ بیشتر چیزیں ایسی تھیں جو اُسی مقام کے لئے مخصُوص تھیں اور جن کے ذائقے سے ہماری زبان آشنا نہ تھی۔ اور چکھ کر اُن میں ذائقۂ خوش تصوّر ہی سے پیدا کرسکتی تھی۔ ایک آدھ چیز شیریں تھی۔ مثلاً فیرنی۔ مگر پانچ آدمیوں کے سامنے اِس کی ایک ہی رکابی تھی۔ میزبان اُسے ہاتھ میں لئے ہر ایک سے فرمائش کرتے تھے کہ "چکھئے"۔ ہر ایک ایک چمچہ لے کر کہتا تھا۔ کہ "واہ! کیا بات ہے"! اِس طرح سب کو ذرا ذرا چکھا کر میزبان نے بے تکلّف اُسے اُنگلیوں سے چاٹنا شُروع کردیا۔ کھاتے جاتے تھے اور کہتے جاتے تھے "افسوس! آپ صاحبوں کو شیرینی سے رغبت نہیں۔ ورنہ مزے کی چیز تھی۔ آپ نے تو ایک ایک چمچہ لے کر چھوڑ دیا"۔ ایک صاحب خاصے ڈِھیٹھ تھے۔ کہہ اُٹھے۔ کہ "رغبت تو ہے۔ اگر اور موجُود ہو تو منگوائیے"۔ فوراً زور سے چلّائے۔ کہ "فیرنی کی جتنی رکابیاں موجُود ہوں لاؤ"۔ آٹھ دس منٹ کے بعد آدمی آیا کہ فیرنی

اور نہیں ۔ اتنے میں سب ہاتھ دھو چکے تھے ۔ کھانا بڑھایا گیا ۔ ہم نے اپنی فرودگاہ پر جانا غنیمت سمجھا ۔ اور اجازت کے خواستگار ہوئے ۔ حضرتِ میزبان بولے ۔ "واہ! چا تو ابھی آپ نے پی ہی نہیں ۔ وہاں چا علیحدہ تیار رکھی رہی اور ضائع گئی ۔ اب یہاں تیار ہے ۔ شیریں چا پیجئے گا کہ نمکین" ؟ سب نے متفق اللفظ جواب دیا ۔ کہ ہمیں کھانے کے بعد چا کی نہ عادت ہے نہ ضرورت ۔ اب آرام مقدم ہے ۔ مگر انھوں نے کہا ۔ کہ "اب تیار ہے ۔ لئے آتا ہوں" ۔ پھر اندر گئے ۔ اتنے میں ہوا زور سے چلنے لگی ۔ معلوم ہوتا تھا کہ شاید مینہ بھی آئے ۔ ہماری تشویش بڑھ چلی ۔ ہمارے دوست برآمد ہوئے اور لالٹین ہاتھ میں تھی ۔ کہنے لگے ۔ "بارش آ رہی ہے ۔ اس لئے شاید آپ کو انتظار میں تکلیف ہو ۔ چا میں کسر تو چند منٹ ہی کی تھی ۔ مگر میں زیادہ بارِ خاطر نہیں ہونا چاہتا" ۔ ہم شکریہ ادا کرکے رخصت ہونے کو تھے ۔ کہ وہ لالٹین لئے ساتھ ہو لئے ۔ "میں آپ کو چھوڑ کر آؤنگا" ۔ ہرچند کہا ۔ کہ "آپ اب آرام فرمایئے ۔ علی الصّباح ملیں گے" ۔ مگر وہ بزور ہمراہ ہو لئے ۔ چند قدم چل کر بوندیں آ گریں ۔ اور ہمارے میزبان کے استقلال کا خاتمہ ہوا ۔ بوندوں کا زور پکڑنا تھا ۔ کہ وہ اچانک کہہ اٹھے "لیجئے اب رخصت ہوتا ہوں" ۔ اور سب سے جلدی جلدی ہاتھ

لاکر واپس ہوئے اور ہمیں چھوڑ گئے کہ راہ ڈھونڈھا کریں۔ اِس خیالی دعوت کا جو اِس شب ہمیں نصیب ہوئی۔ لطف مدتوں فراموش نہیں ہوگا۔ کوئی ہرگز اِس بیان سے یہ نہ سمجھے کہ ہم ناشکر گزار ہیں۔ اور جس کا کھاتے ہیں اُس کا گاتے ہیں، پر عمل نہیں کرتے۔ ہاں گانے گانے میں فرق ہے۔ گاتے تو ہم شکرستانِ خیال کو بھی ہیں۔ مگر اِس گانے کی آواز ذرا اور ہے۔ اور وہ سب سے زیادہ خوش آیند ہمارے میزبان کو ہوگی۔

چار درویش

ایک اسکیما[1] دوشیزہ کی داستان

وہ آرام سے ایک برف کے تودے پر جس کو ہم آرام چوکی کے طور پر اِستعمال کرتے تھے۔ بیٹھ گئی۔ اور میں اُس کی داستان سُننے کے لئے تیار ہو بیٹھا۔ اسکیما کے معیار کے مُطابق وہ نہایت حسین تھی۔ اور لوگ شاید اُس کو کسی قدر بھاری بدن کا سمجھتے۔ ۲۰ سال کا سن تھا۔ اور گو اِس وقت وہ بے ڈھنگا سا پوستین کا کوٹ۔ پاجامہ اور بوٹ پہنے ہوئے تھی۔ اور سر کو چادر سے ڈھانکے تھی۔ تاہم چہرے

---

[1] شمال یورپ کے برفانی مُلک کے باشندوں کو اِس نام سے پکارتے ہیں۔

کی خوبصورتی اِس لباس میں سے بھی عیاں تھی۔ وہ خندہ پیشانی۔ تصنّع سے پاک اور دِل کی صاف تھی۔ اِس کا نام لاسکا تھا۔ ہم دونوں اکثر ساتھ دریائی بچھڑے کا شکار کرنے جایا کرتے تھے۔ ایک دفعہ کچھ دُور ریچھ کے شکار کے لئے بھی میں ساتھ گیا۔ لیکن آدھے راستے سے پھر آیا۔ کیونکہ ریچھ سے مجھ کو ڈر لگتا ہے۔

لاسکا نے اپنی کہانی اِس طرح شروع کی :۔

”اور قبیلوں کی طرح ہماری قوم بھی منجمد سمندر پر خانہ بدوشوں کی طرح زندگی بسر کیا کرتی تھی۔ لیکن دو سال ہوئے میرے باپ نے آوارہ گردی کو خیرباد کہہ کر یہ عالی شان برف کا محل اپنے رہنے کے لئے تعمیر کیا ہے۔ یہ سات فیٹ بلند ہے اور آس پاس کے مکانوں سے تین چار گُنا لمبا ہے۔ اب ہم مستقل طور پر یہیں رہتے ہیں۔ میرے باپ کو اِس مکان کا بڑا فخر ہے۔

”اب غور سے دیکھیں تو معلوم ہوگا کہ معمولی قسم کے مکانوں سے یہ کسی قدر بہتر اور مکمل ہے۔ سامنے کی طرف اِس میں ایک بلند چبوترہ مہمانوں کی آسائش اور سب اہلِ خاندان کے ایک جگہ بیٹھ کر کھانا کھانے کے لئے ہے۔ اِس پر دریائی بچھڑے۔ ریچھ۔ سفید لومڑی وغیرہ کے پوستینوں

کا فرش ہو رہا ہے ۔ اِس کے علاوہ متعدد برف کے بیچ دیواروں کے ساتھ ساتھ بچھے ہوئے ہیں ۔ غرض خُدا کا دِیا سب کچھ موجود ہے ۔ لیکن مدّت سے جِس چیز کی تلاش ہے وہ نہیں مِلتی ۔ عاشقِ صادق کوئی نہیں مِلتا ۔ یوں تو بیسوں پیغام آتے ہیں ۔ میں جانتی ہوں کہ وہ سب میرے باپ کی دولت کے عاشق ہیں ۔ میرا اُن میں سے ایک بھی شیدا نہیں ۔

میں نے دل میں خیال کیا کہ اِس دولت سے مُراد مکان تو ہو نہیں سکتی تھی ۔ کیونکہ اور لوگ بھی ایسی عمارت تیّار کر سکتے تھے ۔ نہ اِس سے بظاہر غرض بِن پہیہ گاڑیوں کُتّوں ۔ برچھوں ۔ کشتی ۔ مچھلی کی ہڈّی کے کانٹوں اور سُوئیوں سے تھی ۔ کیونکہ اِس قسم کی چیزیں وہاں دولت کے شمار میں نہ تھیں ۔ میری حیرت کو معلوم کر کے لآسکا پاس آکر چُپکے سے کان میں کہنے لگی :۔

"بھلا تم اندازہ تو لگاؤ کہ میرے باپ کے پاس کِس قدر دولت ہے ۔" میں دیر تک خاموش بیٹھا سوچتا رہا ۔ لیکن کُچھ سمجھ میں نہ آیا ۔ لآسکا میری حالت کو دیکھ کر خُوب کھِلکھِلا کر ہنسی اور پھر کان کے پاس مُنہ لاکر نہایت سنجیدگی سے کہا ۔ "۴۴ مچھلیوں کے کانٹے ۔ ہڈّی کے نہیں ۔ بلکہ سب اصلی لوہے کے ۔ اور غیر مُلک کی ساخت"۔

یہ کہکر وہ جلدی سے پرے ہٹ گئی کہ دیکھے مجھ پر اِس غیر متوقع خبر کے سُننے سے کیا اثر ہوتا ہے۔ میں نے کبھی نہ چاہا کہ اُسے مایوسی ہو۔ اِس لئے نہایت حیرت اور تعجب کے لہجے میں کہا۔

"کیا سچ مچ؟"۔

"تمہارے سر کی قسم!"۔

"لاسکا! تم مجھ سے فریب کرتی ہو۔ سچ کہو" یہ سُنکر وہ کچھ گھبرا سی گئی اور نہایت سنجیدگی سے کہا۔ "مسٹر ٹوین! یہ بالکل دُرست ہے۔ اور میں اُمید کرتی ہوں کہ تم مجھے جھوٹی نہیں سمجھوگے"۔ لاسکا کو جب اِطمینان ہوگیا کہ مجھے اُس کا کہنا باور آگیا ہے تو میرے متعجب اور خوش کرنے کے لئے اپنا بیش قیمت تعویذ دکھایا۔ (یہ ایک پیتل کا مربع ٹکڑا تھا)۔

لاسکا۔ اِس گہنے کے متعلق تمہاری کیا رائے ہے؟

میں۔ میں نے ایسی عمدہ چیز آج تک نہیں دیکھی۔

لاسکا۔ سچ کہتے ہو؟ واقعی یہ بڑی بیش قیمت چیز ہے۔ اِس کے دیکھنے کی خاطر لوگ کوسوں سمندر پار سے آتے ہیں۔ کہیں تم نے ایسا اور بھی دیکھا ہے؟

میں۔ نہیں (یہ جھوٹ بولتے ہوئے۔ مجھ کو تکلیف

تو ہوئی ۔ لیکن کیا کرتا ؟ یہ بھی دل نے نہ چاہا کہ اُس بیچاری لڑکی کو سچ بول کر تکلیف دوں کہ ایسے ٹکڑے لاکھوں نیویارک میں مارے مارے پھرتے ہیں اور کوئی پُوچھتا بھی نہیں) لیکن اِس نادر چیز کو تو چاہیئے کہ نہایت حفاظت سے رکھا جائے ۔

لاسکا ۔ ذرا آہستہ بولو ۔ کوئی سُن نہ لے ۔ یہ میرے باپ کے خزانے میں رہتا ہے ۔ آج میں نے پہن لیا ہے ۔ کِس کو معلوم ہے کہ میرے پاس ہے ؟

میں ۔ لاسکا ! تم بڑی خوش قسمت ہو ۔ ایسا خُوبصُورت مکان تمھارے رہنے کے لئے ہے ۔ یہ نادر تعویذ پہننے کو ۔ علاوہ اِس کے یہ بیش قیمت خزانہ ۔ برف کے کھیت ۔ بڑے بڑے برفانی میدان پھرنے کو ۔ رِیچھ اور دریائی بچھڑے شکار کرنے کو ۔ یہ نعمتیں کس کو نصیب ہوتی ہیں ؟ اور سب سے بڑی بات یہ کہ تمام دُور و نزدیک کے نوجوان تم پر فِدا ہیں ۔ تمھاری خِدمت کو اپنا فخر سمجھتے ہیں ۔

لاسکا ۔ اِس بظاہر روشنی کی کرنوں کے پیچھے ایک سیاہ بادل چھپا ہوا ہے ۔ دولت کا بوجھ اٹھانا آسان بات نہیں ہے ۔ اکثر مجھے خیال آتا ہے ۔ کہ کاش میں کسی غریب کے گھر پیدا ہوتی ۔ یا کم از کم اِس قدر مالدار نہ ہوتی ۔ مجھے تکلیف ہوتی ہے ۔ جب پڑوسی میری طرف اشارہ کرتے ہیں

اور آپس میں سرگوشیاں کرتے ہیں۔ کہ " وہ دیکھو لکھ پتی کی لڑکی!"۔

یہ لوگ نہایت حسرت کے لہجے میں کہتے ہیں۔ " اِس لڑکی کے پاس تو مچھلی کے کانٹوں کا خزانہ ہے اور ہمارے پاس ایک بھی نہیں۔" یہ سُنکر میرے دل کا عجب حال ہوتا ہے۔ جب میں بچّہ تھی اور یہ دولت ہم کو نصیب نہ ہوئی تھی تو ہم مکان کا دروازہ کُھلا چھوڑکر بے کھٹکے سو رہتے تھے۔ اب ہمیں چوکیدار رکھنا پڑتا ہے۔ اُن دنوں میں میرا باپ سب سے نہایت حِلم اور بُردباری سے پیش آتا تھا۔ اب وہ دُرشت مزاج اور مُتکبّر ہوگیا ہے۔ اور کسی سے بے تکلّف ہونا پسند نہیں کرتا۔ پہلے اِس کے دل میں سِوائے اپنے خاندان کے اور کسی کا خیال تک نہ گُذرتا تھا۔ اب ہر وقت اِن کمبخت کانٹوں ہی کا خیال لگا رہتا ہے۔ اِس دولت کی وجہ سے لوگ اِس کی بے انتہا خوشامد کرتے ہیں۔ پہلے کوئی شخص بھی اِس کے لطیفوں پر نہ مُسکراتا تھا۔ اب بات مُنہ سے نکلتی نہیں اور لوگوں کے پیٹ میں بل پڑنے شروع ہوجاتے ہیں۔ غرض اِسی دولت کی وجہ سے ہمارے تمام قبیلے کی اخلاقی حالت ردی ہوگئی ہے۔ جو پہلے بہادر اور کھرے تھے اب وہ خوشامدی اور مکّار ہوگئے ہیں۔۔

فیضُ الحسن

ایک سین اور اُس کے چھ پردے

دیدنی ہے شکستگی دل کی
کیا عمارت غموں نے ڈھائی ہے!

۱ — دریا کا کنارہ۔ برسات کا موسم۔ شام کا وقت۔ اور پانی برس گیا ہے۔ دریا اپنے زوروں پر بہہ رہا ہے۔ موج پر موج۔ لہر پر لہر آتی ہے۔ اور اپنے ساتھ خدا جانے کہاں کہاں کے خس و خاشاک بہائے لئے چلی جاتی ہے۔ خشک لکڑی کا ٹکڑا۔ کسی درخت کی تازہ ٹوٹی ہوئی شاخ۔ اور کچھ نہیں تو خالی پانی ہی ہے۔ مگر ایک عجیب سرعت و سنجیدگی سے ہر ایک شئے بہتی چلی جاتی ہے۔ دریا کی روانی سوچنے والوں کے دل میں دنیائے فانی کی طرف سے بدگمانیاں پیدا کر رہی ہے۔ بے ثباتی کا تصور اُس وقت کے مشاہدۂ عینی سے امداد پاکر ایسی روشن تصویر دیدۂ دل کے سامنے پیش کرتا ہے کہ پھر اور کسی عینک کی حاجت نہیں رہتی۔

۲ — ناؤ کا پل بندھا ہے۔ لوگ اُس پر سے گذرتے ہیں۔ اِدھر سے اُدھر اور اُدھر سے اِدھر آتے جاتے ہیں۔ کوئی رواں رواں جلدی جاتا ہے۔ کوئی رُک رُک کر

سیر دیکھتا ہوا چلتا ہے ۔ کوئی کہیں اپنے ہم مذاق دوستوں کے مجمع میں کسی کشتی کے ایک کونے پر بیٹھا تماشا دیکھتا ہے ۔ دل خوش کیا ۔ اور سب اُٹھکر چل دیئے ۔ غرض کہ چلنا ہر حال میں مُقدّم ہے ۔ اُس سے خالی کوئی بات نہیں ۔

۳ ۔ دریا کے اُس پار عین کنارے پر ایک پُرانی بارہ دری ہے ۔ اُس کی یہ حالت ہے کہ چھت ندارد ۔ کبھی کی پڑی ہوئی بیچاری ایسی گری کہ پھر کسی نے بنوانے کا نام نہ لیا ۔ دریا کے قریب کے حصّے کی دیواریں بھی پانی کے لگاتار اثر سے نرم ہو کر دریا میں گر پڑیں ۔ پانی بالکل مِلا ہُوا گذرتا ہے اور مکان کے باقی حصّوں کے رہنے کی بھی کوئی اُمید چنداں نظر نہیں آتی ۔ جو ننگے سُتون اور دیواریں اب تک کھڑی ہیں ۔ گویا زبانِ حال سے پُکار رہی ہیں کہ ع ہم کو دیکھو ہمارا حال سُنو ؛ اور دُنیا اور اُس کی بیوفائیوں کا سبق خوب ذِہن نشیں کرلو ۔ مگر ایسے اہلِ دل کہاں سے آئیں ۔ جو دریا کے شور و غُل میں اُن بیچاری دیواروں کی خاموش آوازوں کی طرف کان دھریں ! ع

صدا طوطی کی سُنتا کون ہے نقّار خانے میں

۴ ـــ اُس پار دریا سے تھوڑے تھوڑے فاصلے پر تین پرانے مقبرے نظر آتے ہیں ایک تو کسی بادشاہِ جمجاہ کا۔ وہ تو خیر بہت کچھ اپنی شان کو قائم رکھے ہوئے ہے اگرچہ ٹا کے۔ دُوسرا اُس سے کچھ دُور اُسی بادشاہ کے کسی امیر کبیر کا۔ مگر اُس کے گنبد کی عجب حالت ہو رہی ہے۔ اُس کے نیچے کی استرکاری اِینٹوں سے علٰحدہ ہوکر گرا ہی چاہتی ہے۔ واہ رے معمارو! تم نے تو مصالحے کے بنانے اور اِس کے لگانے میں کوئی کسر اپنی طرف سے نہیں چھوڑی۔ مگر اِس کو کوئی کیا کرے کہ قانونِ قدرت ہی ہمیشہ ہر چیز کی حالت میں ایک تبدیلی چاہتا ہے؟ چُونے کی تہہ اپنے آپ میں تو ابھی تک ایسی پیوست ہے کہ پھٹنے کا نام نہیں لیتی۔ مگر کمبخت اِینٹوں کو کوئی کہاں تک کوسے۔ جنھوں نے اپنے سے علٰحدہ کرکے اُس بیچارے کو اُسی حال پر چھوڑ دیا ہے؟ ع تیری بلا سے کوئی مرے یا کوئی جئے ÷ تیسرا مقبرہ نیچی چھت والا۔ ذرا اور فاصلے پر اُسی بادشاہ کی سب سے پیاری بیگم کا ہے۔ اِس مکان کی ناگفتہ بہ حالت کا کیا کہنا! دیکھو تو اُس کی مکین خود اپنی نہ بولنے والی زبان سے کیسی پیشین گوئی کر گئی ہے۔

شعر

بر مزارِ ما غریباں نے چراغ نے گُلے
نے پرِ پروانہ سوزد نے صدائے بُلبُلے

دن کو قریب کے گانوُں کے چرواہے اپنے اپنے جانور چرانے لے آتے ہیں۔ مکان میں گوبر سب طرف جا بجا پڑا ہے۔ کہیں گائیں بھینسیں بیٹھی ہیں۔ کہیں بچھڑے کھڑے ہیں۔ کہیں بکریوں کے پاس اُن کے بچّے کُلیل کر رہے ہیں۔ آس پاس لڑکے بے تکلّفی سے مُختلف کھیل کھیلتے ہیں۔ اور اپنی نادانی میں اُن کو یہ بھی معلُوم نہیں کہ ہم کس کی خاک کو پامال کر رہے ہیں! آہ! وہ۔ جِس نے اپنے عِلم اور عقل۔ خُوبی اور سخاوت کے نُور سے ایک جہان کو مُنوّر کر رکھا تھا۔ آج اُسی کے قول کے مُوافق اِس کی قبر پر دیا تک نہیں ہے۔ پھُولوں کا تو کیا مذکور!

۵۔ ناؤ کے پُل سے اُوپر کی طرف لوہے کا پُل ہے۔ ریل گاڑی اُس پر سے آتی اور گذر جاتی ہے۔ اگرچہ ظاہرا وہ اِس منظر کے اثر سے مُتاثّر ہوتی بالکُل معلُوم نہیں ہوتی۔ مگر ایک روانی ہے کہ جس سے وہ خود بھی خالی نہیں۔ دُنیا کی کسی بات کو قرار نہیں۔ قیام نہیں۔ واقعی ع سخت بے اِعتبار ہے دُنیا!

۶ ــ دریا کے اِس پار ایک لکڑی کا لٹھا کسی پہاڑی مقام سے بہکر آیا پڑا ہے ۔ اس پر ایک اجنبی شخص اپنی بے خودی کے عالم میں غرق ۔ خاموش بیٹھا ہے ۔ اُس کا پیارا اور پیار کرنے والا باپ ۔ ابھی تھوڑے دن ہوئے اُس کے سر سے اُٹھ گیا ہے ۔ اِس کو بالکل مُضمحل اور دِل شکستہ چھوڑ گیا ۔ وہ ہر چند اِس صدمے کو اپنے دل سے دُور کرنا چاہتا ہے ۔ اور اِس کی کوشش بھی کرتا ہے ۔ اور شاید کیا عجب ہے کہ وہ اِسی خیال سے اپنا جی بہلانے کو دریا کے کنارے بھی آ بیٹھا ہے ۔ مگر کہاں ! جو دِل خدا نے ایسے بنائے ہیں ۔ کہ ہمیشہ غم کی چاشنی سے لذت گیر رہتے ہیں ۔ وہ کہیں ایسے صدموں کو آسانی سے بھول سکتے ہیں ! اُس نے دریا پُل بارہ دری اور مقبروں کی طرف یکے بعد دیگرے نگاہ ضرور ڈالی ۔ اور سب میں ایک روانی ۔ تغیّر اور شکستگی کی کیفیت بھی پائی ۔ مگر رہ رہ کر اُس کا خیال اِس کو اپنی ہی جانب مُتوجّہ کرتا تھا اور بار بار بے ساختہ اِس کی زبان سے نکل جاتا تھا ۔

شعر

دیدنی ہے شکستگی دِل کی ٭ کیا عمارت غموں نے ڈھائی ہے !

جہانگیر

ایک رات

دس بجے ہونگے - چاندنی رات تھی - برآمدوں سے قریب ہی صحن میں کرسیوں اور چارپائیوں پر چار چار پانچ پانچ آدمی خوش گپیوں میں مصروف تھے - وہ وقت کچھ ایسا دلکش تھا اور نوجوانی کی بے تکلف گفتگو چٹکلوں اور لطیفوں سے رنگِ محبت اِس قدر گرم ہو رہا تھا کہ سونے کا خیال بھی دِل میں پیدا نہ ہوتا تھا - دفعۃً آسمان کا چہرہ مکدّر ہونا شروع ہوا - ہوا میں سرسراہٹ پیدا ہوگئی اور وہ زیادہ نمایاں طور پر محسوس ہونے لگی - چاند کا پیارا پیارا شوخ رنگ پھیکا پڑ گیا اور تارے جِھلملا جِھلملا کر رہ گئے - کسی نے کہا "وہ دیکھو! آندھی آن پہنچی" سب گھبرا گھبرا کر دیکھنے لگے - حقیقت میں مغربی آسمان زرد ہو رہا تھا اور یہ زردی ہر ہر گھڑی آگے کو بڑھتی آتی تھی - دو ہی منٹ گذرے ہونگے کہ گرد و غبار کے سیلاب نے چاروں طرف سے گھیر لیا - دھول اور مِٹّی اُڑ اُڑ کر آنکھ کان ناک اور منہ کی خبر لینے لگی اور طوفان کے شدید تھپیڑے پڑنے لگے - کواڑوں کے زور سے ٹکرانے اور کھٹا کھٹ کی آواز سے یاد آگیا کہ کمرے کھلے ہیں - اُٹھے اور

رُومال سے چہرہ ڈھک کر اٹکل سے کمرے پہ پہنچے - دروازہ بند کیا - صحن سے برآمدے میں کھینچکر ننگی چار پائی پر چادر میں سر لپیٹ پڑ رہے - کچھ دیر ضرور اضطراب اور پریشانی میں کٹی - گرد و غبار سے جو گرداب کے مانند ہو رہا تھا کچھ سُجھائی نہیں پڑتا تھا - کہ کس پہلو پہ سوئیں اور کس پہ نہ سوئیں - چندے کروٹیں بدلیں - بے چینی اور گھبراہٹ کا اظہار کیا - مگر مجھ کو یقین ہے کہ تھوڑے ہی دیر بعد خرّاٹے مار رہا ہونگا -

معلوم نہیں کیا وقت تھا کہ اچانک آنکھ کھل گئی - ٹھیک ٹھیک نہیں بتا سکتا کہ کیونکر - مگر مجھے تو مچھّر خانم پر کچھ بدگمانی سی ہو رہی ہے - ورنہ جاگتے کے ساتھ ہی کیوں میں نے ہاتھ کی پشت کو چار پائی کے پائے سے رگڑ رگڑ دیا تھا - مگر جس طرح بھی آنکھ کھلی ہو اور جس کی وجہ سے بھی کھلی ہو وہ میرے دِلی شکریے کا مستحق ہے - میں نے آنکھیں کھول کر دیکھا - آہا کیا کیفیت تھی! نور کا وقت تھا - ہوا تھم گئی تھی اور زمین و آسمان پر سنّاٹا چھایا ہوا تھا - اِس وحشت خیز آندھی کے بجائے جس میں میں نے آنکھیں بند کی تھیں - ہلکی ہلکی فرحت افزا نسیم چل رہی تھی - یہ کسی ننھّے سے پپیہے کی سُریلی آواز

کس طرف سے آ رہی ہے ؟ شاید۔ رفیقِ شب جھینگر ہے کہ اِس بیخودی کے ساتھ ایسی میٹھی مسلسل تان اُڑا رہا ہے۔ نسیم کے جھونکے۔ کہ پیہم اور لگاتار نہیں ہیں۔ اگر رُوحانی سرود فرض کئے جائیں تو معلوم ہوتا تھا کہ جھینگر اِس رُوح پرور سرود کے لئے تنبور کا کام دے رہا ہے۔

چاند۔ واہ کیا پیارا نام ہے! مگر مجھ کو شُبہہ ہے کہ اِس کی اِس وقت کی صُورت کے لئے یہ نام بھی موزُوں ہے یا نہیں۔ جی چاہتا تھا کہ اِس کو ملکۂ فلک بلکہ ملکۂ فلک کا تاج کہوں۔ مگر کوئی نام بھی اِس پیاری اور دِل لُبھانے والی صُورت کا صحیح خیال دلانے کے لئے کافی نہیں ہو سکتا جو نصف آسمان سے کچھ ڈھلکر ٹکٹکی باندھے ہوئے دُنیا اور اہلِ دُنیا کو تک رہی تھی۔ کیا وہ اِس خیال میں محو ہے کہ میرے نُور نے اِن چیزوں کو کتنا خوبصورت بنا دیا ہے ؟ نہیں۔ اِس کو تو یہ معلوم نہیں کہ خُدا نے اِس کو ایسی پیاری۔ دِلفریب صُورت عطا کی ہے۔ معلوم ہوتا تو ممکن تھا وہ یوں اہلِ دُنیا کو اپنے حُسن کے مزے لُوٹنے دیتی ؟ اِس بھولی بھولی حسین صُورت کو دیکھ دیکھ کر کبھی یہ خیال ہوتا تھا کہ سُرور و نشاط کا عالم اِس پر چھایا ہُوا ہے۔ ابھی ایک دِل کش اور ہمدردی پیدا کرنے والی اُداسی برسنے

لگتی تھی۔ کبھی متانت۔ سنجیدگی اور محسُوس وقعت کا اِظہار ہوتا تھا۔ کبھی یہ معلُوم ہوتا تھا کہ اہلِ دُنیا کو اپنے پاس کھینچنے اور اگر یہ مُمکن نہ ہو تو خود ہی اُن کے پاس سے چلے آنے کے لئے بیتاب ہو رہی تھی۔ پُرانے یُونانی شُعرا کو شاید ایسی ہی ادا نے دھوکا دیا ہوگا کہ اُنھوں نے اِس کو سچ مُچ انڈیمین کے آغوش میں لا سُلایا۔ مگر پیارے چاند! تُجھ پر کسی خاص کیفیت کا محمُول کرنا نامُمکن ہے۔ جس طرح تیری صُورت کو غور سے دیکھنے والے تیری تعجّب خیز خُوبصُورتی سے مسرُور۔ کبھی تجھ سے دُور ہونے کی وجہ سے مغمُوم معلوم ہوتے ہیں۔ کبھی تیرے نُور سے فیضیاب ہوکر سرچشمۂ ہستی کے ممنُون اور کبھی تیری سرتاپا رازِ زندگی سے مُتحیّر ہو جاتے ہیں۔ مُمکن ہے کہ خود تُجھ پر اہلِ دُنیا کو دیکھ دیکھ کر یہ کیفیتیں پیدا ہوتی ہوں۔ کیونکہ باوجود اِس پستی کے ہم بھی قُدرت کی ایک عجیب و غریب صنعت ہیں۔ بلکہ خالِق کائنات کے قول کے مُطابق ہم اِنسان تو اشرفُ المخلُوقات یعنی تُجھ سے بھی کُچھ بڑھ کر ہیں۔ اِس لئے کُچھ تعجّب نہیں کہ اپنی طرح ہم تُجھ کو بھی مُختلف کیفیتوں کا محکُوم سمجھ لیں۔

مجھ کو اِس خیال سے بڑی خوشی ہوئی کہ اِس خُوبصُورت منظر کو زیادہ خُوبصُورت بنا لینا میرے بس میں تھا۔ چارپائی

پر لیٹے لیٹے آنکھ پر انگلی رکھ کر چاند کے ساتھ کھیلنا شروع کیا۔ ابھی ایک چاند تھا۔ میری تھوڑی سی کوشش سے دو ہوگئے۔ پھر ایک چاند تو فوق السّما پر تھا۔ اور دُوسرا انتہائے اُفق پر سطحِ زمین کے بوسے لے رہا تھا۔

تاروں پر چاند کی روشنی اِس قدر غالب آگئی تھی کہ وہ بالکل اِس عالمگیر نُور کا ایک حصّہ ہوگئے تھے۔ میں نے بہتیرا آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھا مگر کسی چھوٹے ننّھے تارے کی صُورت دکھائی نہ دی۔

نیم کے درختوں کی ایک قطار مجھ سے کچھ فاصلے پر ہوکر گذرتی تھی۔ چاہئے تھا کہ وہ اِس نُور کی کیفیت کو کم کردیتے مگر نہیں۔ اُن کا بے خودی کے عالم میں جھُومنا اور ایسے وقت میں کہ ساری 'نیچر' سو رہی تھی۔ سائیں سائیں کرنا۔ کِس قدر بھلا معلُوم ہوتا تھا۔ ٹہنیوں پر کوہِ قاف کی اُن دوشیزہ اور پاکباز لڑکیوں کا گمان ہوتا تھا جو کسی سرسبز چوٹی پر گلّے چراتے وقت ایک بے فکری کے عالم میں کھیل کُود میں مصرُوف ہوجائیں اور تکلّف کی زنجیریں اُتار کر ناچنے لگیں۔ آہ! وہ کیسا وقت تھا کہ فِطرتِ اِنسانی سارے پست خیالات سے پاک ہوکر قدرت کی نیرنگیوں میں محو ہو ہو جاتی تھی۔ دیکھو! وہ شاخیں ایک دُوسرے کے ساتھ

سرگوشیاں اور اِس تنہائی اور فرصت کے وقت کو غنیمت سمجھ کر چہلیں کر رہی تھیں۔ ہوا کا وہ دوسرا جھونکا آیا ۔ اور جیسے کوئی چلبلی طبیعت کی طرّارہ کسی شوخی لئے ہوئے فقرے کی تاب نہ لاکر کھٹ سے الگ ہو جاتی ہے ۔ بعینہ وہ شاخ پھرتی سے دوسری کو جھٹکا دے ایک طرف جھک گئی ہے ۔ اوپر سے پاک دل چاند یہ تماشا دیکھ رہا ہے۔

خاموشی کا یہ عالم تھا کہ آسمان سے زمین تک کوئی آواز سنائی نہیں دیتی تھی ۔ جھینگر کی آواز بلکہ پیہم راگ تو البتہ تھا ۔ مگر وہ اِس فرحت بخش کیفیت میں اِس قدر ڈوبا ہوا تھا کہ میں اُس کو بھی چاندنی ۔ ہوا یا خاموشی کا ایک جزو تصوّر کرنے پر زیادہ مائل تھا ۔ اِس سناٹے میں مجھ کو یہ خیال ہوتا تھا کہ دنیا میں صرف چار ہی چیزیں زندہ ہیں چاند ۔ درخت ۔ ہوا اور میں ۔ کاش یہ غلط فہمی کچھ دیر قائم رہ سکتی ! اِس سہانے سمے کے دِل کھول کر لطف اٹھا رہا تھا ۔ تکلّف کا خیال بھی دِل کی وارفتگی کو چھو نہ گیا تھا ۔ نیکی کے فرشتے روح کے کانوں میں کچھ عجب ہوش ربا راگنی گا رہے تھے کہ العلم حجاب اکبر کی سچائی بڑے زور سے مجھ پر ظاہر کی گئی ۔ عین اِس موقع پر کہ دل محویّت سے بھرا ہوا تھا ۔ شاعروں کی طرف خیال رجوع کر گیا کہ

ایسے ہی مناظر ہونگے جن سے متاثر ہوکر وہ 'نیچر' پرست ہوگئے۔ میں کیوں اس موقع اور وقت سے شاعرانہ سبق اخذ نہ کروں؟ اس خیال کا آنا تھا کہ تکلّف اور تکلّف کے ساتھ تصنّع نے میری ازخود رفتگی پر قبضہ کرنا شروع کیا۔ ایک پژمردہ خشک پتّے کی کھڑک کانوں میں پڑی۔ یہ اس عالمِ خاموشی میں پہلی بے ربط آواز تھی۔ جس نے توجّہ کو کسی اور طرف مائل کیا ہو۔ اس آواز کا اثر ابھی تازہ ہی تھا کہ صفدر کی چار پائی پر سے "اللہ میاں! کیا کر رہے ہو"؟ کی آواز سنائی دی۔ یہ شکایت کا پہلو لئے ہوئے تھی اور بلا شبہہ مجھ کو ناگوار معلوم ہوئی۔ مگر فوراً خیال آیا کہ شاید یہ کسی منحوس خواب کا نتیجہ ہو۔ پورے طور پر ابھی یہ خیال پیدا نہیں ہونے پایا تھا کہ سردار اور کریم نے یکے بعد دیگرے صفدر کو مخاطب کرکے پوچھا "کیوں جی کیا ہے؟" ان بزرگوں نے متعدی مرض کا کام کیا۔ ایک ایک کر کے چار پائیوں پر سے آوازیں آنی شروع ہوئیں۔ ان کرخت آوازوں نے مجھ پر بڑا ظلم کیا۔ یہی معلوم ہوتا تھا کہ جیسے ایک نہایت ہی خوش گوار خواب میری آنکھوں کے سامنے سے ہٹا جاتا ہے۔

شعر

سنبھلنے دے مجھے اے نا امیدی کیا قیامت ہے

کہ دامانِ خیالِ یار چھوٹا جائے ہے مجھ سے

افسوس یہ ظالم اور بے درد آوازیں اس دلچسپ طلسم کے توڑنے میں ایک حد تک کامیاب ہوگئیں کچھ یوں ہی سا نقشہ آنکھوں کے سامنے جما ہوا تھا کہ سڑک پر سے ریل کی سیٹی اور پھر کھڑکھڑاہٹ کی آواز کانوں میں پڑی۔ اس پر غضب یہ ہوا کہ مؤذن نے اپنی کرخت آواز بلند کردی۔ جس کے ختم ہوتے ہی کالج کے مختلف شعبوں کی گھنٹیاں بجنے لگیں اور انھوں نے سارا طلسم توڑ دیا۔

اب نہ ہوا میں وہ خنکی تھی نہ چاندنی ہی کا کچھ پتا تھا۔ جھینگر اپنی راگنی ختم کر نہیں معلوم کس کونے میں چھپا پڑا تھا۔ درختوں میں وہ کیفیت باقی تھی۔ نہ شاخوں ہی پر کوہِ قاف کی پریوں کا دھوکا ہوتا تھا۔ اور خاموشی کی بجائے تو ٹن ٹن ٹناٹن کی آواز کانوں کو دِق کر رہی تھی۔

حاجی محمد خاں
مدرسۃ العلوم علی گڈھ

برسات

اُف! برسات کا موسم بھی کس قیامت کا ہوتا ہے!

ذرا گھر سے نکل کر کسی میدان کی سیر کیجئے تو معلوم ہوگا کہ قدرت نے عجائباتِ عالم کا دفتر کس طرح کھول رکھا ہے۔ اس دفتر کا ایک ایک نقطہ معرفت میں ڈوبا ہوا ہے ۔ جس سے ایک صاحبِ بصیرت بہت کچھ معلومات اخذ کر سکتا ہے اور قدرتِ الٰہی کی غیر متناہی رنگ آمیزیوں کا بہت کچھ علم حاصل کر سکتا ہے ۔ جدھر دیکھئے سبزے کا خوشنما فرش بچھا ہوا ہے ۔ اور مینہ نے جو ابھی ابھی برس کر نکل گیا ہے ۔ اس سبز مخملی فرش پر سفید سفید موتی اس انداز سے ٹانک دئے ہیں کہ دیکھ کر ایک عجیب محویت طاری ہوتی ہے اور زبان سے بے ساختہ واہ نکل جاتی ہے ۔ یہ وہ موسم ہے کہ جس میں پژمردہ سے پژمردہ دلوں میں بھی ایک اُمنگ سی پیدا ہو جاتی ہے ۔ اور اس کی دلچسپیوں کو دیکھ کر وہ لوگ بھی جن کے لب پر مصائبِ روزگار نے کبھی مسکراہٹ تک آنے نہ دی تھی بے ساختہ کھلکھلا پڑتے ہیں ۔ انسان تو انسان جانور تک اس کی دلچسپیوں سے بغیر متاثر ہوئے نہیں رہ سکتے ۔ جس وقت ذرا ذرا پھوار پڑ رہی ہو کسی پُر فضا باغ میں جائیے تو دیکھئے کیا لطف حاصل ہوتا ہے ۔ درخت تازگی اور مسرت سے جھومتے دکھائی دینگے ۔ پیاری پیاری خوشنما چڑیاں ایک شاخ سے اُڑ کر دوسری

شاخ پر بیٹھتی نظر آئیں گی۔ وہ طیور جن کی پیاری اور سُریلی آوازیں کسی اور موسم میں سُنائی تک نہ دیتی تھیں۔ وہ بھی اِس موسم میں خاموش نہیں بیٹھ سکتیں اور کسی نہ کسی وقت دو ایک بانگیں لگا ہی دیتی ہیں۔ غرض کہ اِنسان ہو یا حیوان اِس موسم میں سب پر ایک قِسم کی تازگی کے نشانات پائے جاتے ہیں۔ وہ درخت۔ جن کو خزاں کے ظالم ہاتھوں نے بالکل بے برگ و بار کردیا تھا اور جو عشاقِ حرماں نصیب کے فراق اُٹھائے ہوئے دلوں کی طرح بالکل پژمُردہ ہوگئے تھے۔ ایسے ہرے ہوجاتے ہیں کہ گویا اُن پر کبھی خزاں کا قبضہ ہی نہ ہوا تھا۔ زمین۔ جس کے اندر آفتاب کی قیامت خیز کرنوں نے ایک تپش سی پیدا کردی تھی۔ اپنے بخارات کو سبزے کی شکل میں نکال دیتی ہے۔ سرخ سرخ بیر بہوٹیاں۔ جو ہری ہری گھاس پر اِدھر اُدھر پھرتی دکھائی دیتی ہیں۔ آنکھوں کو عجیب لُطف بخشتی ہیں۔

یوں تو خُدا کی تمام مخلوق اِس موسم کا نہایت مسرت اور جوش سے خیر مقدم کرتی ہے اور اِس کی نیرنگیوں اور گلکاریوں سے ہر طبقے کا آدمی لُطف اُٹھاتا ہے۔ لیکن خاص کر جو مسرت بھولے بھالے کِسانوں کو اِس سے حاصل ہوتی ہے

اُس کا خاکہ کھینچنا میرے قلم کی طاقت سے باہر ہے۔

جس وقت دُھواں دھار گھٹائیں آسمان پر چھا رہی ہوں اور پانی نہایت زور شور سے برس رہا ہو کسی میدان میں جائیے۔ دیکھئے۔ ایک کسان پانی کی برستی ہوئی لہر میں اپنے ہل کے بیلوں کو ہنکا رہا ہے۔ یہ ہل چلاتے چلاتے وقت کی دلچسپیوں سے کچھ ایسا مُتاثر ہو جاتا ہے کہ بے ساختہ الاپ اُٹھتا ہے۔ اُف! اُس کی بے تُکی لیکن اثر پیدا کرنے والی الاپ ہَوا میں مِلکر جنگل میں اِس طرح گونج جاتی ہے کہ دِل بے قابو ہوجاتا ہے۔ یہاں تک کہ خود کِسان بھی اُس کے اثر سے خالی نہیں رہ سکتا۔ اور اپنے ہی الاپ میں ایسا محو ہو جاتا ہے کہ پھر اُس کو دُنیا و ما فیہا کی خبر نہیں رہتی۔ دُوسری طرف ایک نو عُمر لڑکا۔ جس کی عُمر مشکل سے پندرہ سولہ سال کی ہوگی۔ ننگے بدن کندھے پر ایک لٹھ رکھّے ہوئے اپنے بیلوں کو ہنکاتا جاتا ہے اور اپنی سُریلی آواز میں اِس طرح تانیں لیتا جاتا ہے کہ گویا دِل کھینچ لیگا۔ کہیں کسی گڈھے یا کھوہے میں اگر پانی جمع ہوگیا ہے تو کِسانوں کی چھوٹی چھوٹی بھولی اور معصوم لڑکیاں اُس میں اُچھل کُود مچا رہی ہیں۔ کوئی تو پانی اُڑا رہی ہے کوئی دُوسری لڑکی کو

گڑھے میں گرانے کی کوشش کر رہی ہے۔ "سنو سکھی سیاں جوگیا ہوئی گئے رے" ایسی مہین اور میٹھی آواز میں الاپ رہی ہے کہ جس سے اِرد گرد کی جھاڑیاں گونج کر یہ ثابت کرتی ہیں کہ وہ بھی اُن کی اِس وقت کی خوش فعلیوں میں نہایت مسرّت اور شکر گذاری کے ساتھ حصّہ لے رہی ہیں۔

جس وقت پانی زوروں میں برس رہا ہو۔ کسی دریا کی جاکر سیر کیجئے۔ چھوٹی چھوٹی بُوندوں کا دریا میں ایک تلاطم سا پیدا کردینا۔ سفید سفید چاندی کی سی مچھلیوں کا فرطِ انبساط سے اُچھل کر پانی کے اُوپر آجانا اور پھر دفعتہً غائب ہوجانا بھلا کن آنکھوں کو اچھا نہ معلوم ہوتا ہوگا؟ میڈکوں کی متواتر چیخ پکار اور بطوں کی قائیں قائیں اِس موقع پر کن کانوں کو خوشگوار نہ معلوم ہوتی ہونگی؟

غرض کہ اِس موسم کی ایک ایک ادا دِل کو بے چین کردینے کے لئے کافی ہے۔ اور اِس کی ایک ایک دلاویزی قلب کو مسخّر بنانے میں کمال رکھتی ہے۔ اِس کی قدر تو کچھ دقائق شناسانِ قدرتِ الٰہی سے پوچھنی چاہیئے کیونکہ

شعر

برگ درختانِ سبز در نظرِ ہوشیار

ہر ورقے دفتریست معرفتِ کردگار

سیّد محمّد ہادی
مچھلی شہری

کلانور

کلانور ضلع گورداس پور (پنجاب) میں ایک قصبہ ہے۔ فی زمانہ اپنی بساط اور وسعت کے لحاظ سے اِس قابل نہیں کہ ہندوستان کے مشہور شہروں میں شمار کیا جاوے اور نہ اِس کو ہندوستان کے مشہور شہروں کی سی شہرت حاصل ہوئی کہ جس کے باعث سے یادگارِ زمانہ ہو۔ مگر تاہم اکبرِ اعظم جیسے شہنشاہِ ہند کے تخت گاہ ہونے کا جو فخر اِس کو حاصل ہے وہ بھی کچھ کم نہیں۔ اور ہمیشہ تاریخِ ہند میں تذکرۂ تخت نشینیِ اکبرِ اعظم کے ساتھ کلانور کا ذکر بھی ہوتا رہیگا۔

اکبرِ اعظم کو اپنے والدِ ماجد کے اِنتقالِ پُر ملال کی خبرِ وحشت اثر کلانور ہی میں پہونچی۔ مصلحتِ وقت اور ارکانِ دولت و اعیانِ سلطنت کے مشورے سے کلانور ہی میں اکبرِ اعظم نے تاجِ شاہی زیبِ سر کیا اور تختِ سلطنت پر جلوہ افروز ہوا۔ وہ چبوترہ۔ جس کو خاص طور پر تختِ گاہ اکبر ہونے کا فخر حاصل ہے اور جو خاص اسی واسطے تعمیر ہوا تھا۔

اگرچہ زمانے کی دست درازیوں سے جہاں بلب اور اِس کی نیرنگیوں کے نظارے سے ششدر ہے۔ اور اِسی کی بدولت اپنی جوانی کی آب و تاب کھو چکا ہے۔ مگر تاہم اکبرِ اعظم کی تخت نشینی کی ایک باقی ماندہ یادگار ہے اور چشمِ بصیرت کی دانۂ اشک کی تسبیح کے ایک دَور کو پورا کرنے کے لئے کافی ہے۔ اللہُ اکبر! وہ جگہ جہاں پرندہ پر نہ مار سکتا تھا۔ عام و خاص بلا اِجازت جا نہ سکتے تھے۔ جہاں نظریں بھی جاتی ہچکچاتی تھیں۔ جہاں ہر وقت مجمعِ کثیر و جمِّ غفیر رہتا تھا۔ اب ویران اور سُنسان ہے۔ وہ جگہ۔ جس کا کثرتِ انبوہِ مردُمان سے دم گھُٹتا تھا۔ آج ذِی نفس کی صُورت دیکھنے کو ترس رہی ہے۔ سچ ہے۔ ع کہ آئینِ جہاں گاہے چنیں گاہے چناں باشد۔ بادشاہی شان و شوکت۔ دبدبہ و حشمت زمانے کے ہاتھوں معدُوم ہو چکے ہیں۔ اور بجائے اُن کے بیکسی۔ حسرت۔ یاس اور افسوس زبانِ حال سے گویا ہیں :- شعر۔

اِک وضع پر نہیں ہے زمانے کا حال۔ آہ!
معلوم ہوگیا ہمیں لیل و نہار سے

جہاں کسی زمانے میں لوگ شاہی ہیبت کے سبب نہ جا سکتے تھے اب وحشی جانوروں کی خوفناک ہیئت اُن کی

سدِّ راہ ہے۔ جس زمانے میں اکبر تخت نشین ہوا ہے کالانور کا بھی عہدِ شباب تھا۔ چند مقبرے۔ ٹوٹی پھوٹی شہر پناہ اور اُسکے دروازے۔ پُرانی عمارتوں کے کھنڈرات۔ اس کے زمانۂ عُروج کی یادگار ہیں۔ مُغلیہ سلطنت کے ساتھ ہی اُس کا بھی زوال شروع ہُوا اور ایک وفادار خدمت گار کی طرح اُس کے ناپید ہوتے ہی یہ بھی گُمنام ہو گیا۔ اِس وقت بھی اگرچہ بلحاظِ آبادی ایک قصبہ ہے مگر بلحاظِ وسعت ایک شہر ہے۔ اُس کا ایک زمانہ وہ تھا کہ بوجہ گنجائش نہ ہونے کے لوگ شہر کے باہر قیام کرتے تھے۔ اور ایک وقت یہ ہے کہ اِس کے بہت سے مکانات مکینوں کے انتظار میں اِستادہ ہیں۔ اور بہت سے وہ مکانات۔ جن کی مُدّتِ اِنتظار ایک حد کو پہنچ گئی ہے۔ شب بیدار عاشق کی مانند حالتِ اضطراب اور بے چینی میں کروٹیں بدل چکے ہیں۔

اِس قصبے کے گرداگرد ایک چھوٹا سا دریا۔ جس کو کرن کہتے ہیں۔ نرالی طرزِ ادا سے بہتا ہے۔ اگرچہ بظاہر دریا کی لمبائی چوڑائی کچھ بھی نہیں۔ مگر وہ راہ۔ جو اِس نے اِختیار کی ہے۔ ایسی ٹیڑھی ترچھی ہے۔ کہ اِس کے کنارے کنارے ذرا سی دیر چلنے سے آدمی تھک جاتا ہے۔ اِس کی وضع قطع کو دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایک سفید اژدہا بل کھاتا ہوا

اپنے آپ کو چھپاتا ہوا کسی صید کی تلاش میں جا رہا ہے - یا زمانے کی دست درازیوں سے تنگ آکر بمصداقِ "تنگ آمد بجنگ آمد" مایوسانہ حالت میں تڑپ رہا ہے - دریا کے کنارے کنارے پرانے زمانے کے کھنڈرات دُور تک چلے گئے ہیں اور چشمِ بصیرت کے لئے ایک عجیب و غریب نظارہ ہے - ایسے منظروں کو دیکھکر سوائے اِس کے کہ آدمی یاس کی کشتی میں بیٹھکر خیالات کے دریائے ناپیدا کنار میں روانہ ہو اور کچھ نہیں سُوجھتا اور سِوائے اِس کے کہ حیرت سے زمانے کی نیرنگیوں پر غور کرنا شُروع کرے اور کچھ بن نہیں آتا -

ایک عرصے کے بعد انگریزی سلطنت کی بدولت پھر اِس شہر کا ستارہ چمکا ہے - صنعت و حِرفت کا چرچا ہو گیا ہے اور تعلیم کا شوق بھی یہاں کے باشندوں کے دامنگیر ہوا ہے - یہاں کی مستورات بھی عِلم کی طرف راغب ہیں -

سیّد ارشاد علی

سوتاڑہ

بہارستانِ فطرت میں پہاڑوں کا ایک عجیب مرتبہ ہے - کیسا ہی معمولی منظر ہو لیکن اگر وہ کسی اونچے پہاڑ پر منتہی ہوتا ہے تو اُس میں عجیب دلفریبی پیدا ہو جاتی ہے

دُور سے سرسبز سر بفلک کشیدہ پہاڑ نظر آکر مُردہ دلوں کو زندہ کرتے ہیں ۔ اور جو شفّاف سیمیں چشمے اُن سے جا بجا اُچھلتے کُودتے نکلتے ہیں وہ اپنی مجموعی قوّت سے دریا بہاتے اور عالم کی سرسبزی و شادابی کا مُوجب ہوتے ہیں ۔ یہی پہاڑ ہیں جن کا نظارہ اِنسان کو اپنی بے حقیقتی و بے بضاعتی کا دِل ہی دِل میں قائل کرکے کسی اور عالم میں پہنچا کر معرفتِ الٰہی کا سبق پڑھاتا ہے ۔ اور اِنھیں پہاڑوں کے تاریک کھوؤں کی خوفناک تنہائی میں نفسِ امّارہ کا ستایا ہوا اِنسان گوشہ گزیں ہوکر عبادت و ریاضت کی بدولت قیدِ جسمانی سے آزاد ہوکر کسی اور ہستی کی سیر کرتا ہے ۔ یہی پہاڑ ہیں جو ہزارہا سال سے بیش بہا جواہرات کو جگر گوشوں کی طرح سینے میں چھپائے ہوئے چلے آتے ہیں ۔ اور سختیٔ مقابلہ سے اِنسان کی بہترین کوششوں کی بھی بہ مشکل اُن تک رسائی ہونے دیتے ہیں ۔ اِنھیں پہاڑوں کی چوٹیوں پر بکھرے ہوئے سنگریزے ایسے ایسے سمندروں اور دُور دراز طوفانوں کو یاد دلاتے ہیں جن کے مقابلے میں گویا کہ طوفانِ نوح کل ہوا ہے غرض کہ پہاڑ زمانۂ قدیم کی جہاں تک کہ مؤرخوں کا ذہن بھی رسائی نہیں کرسکتا زندہ تاریخ اور اِنسان کے لئے عجب مایۂ دولت

و عبرت ہیں۔

ضلع بیڑ کی خوش قسمتی ہے کہ مغربی گھاٹ کا شمالی حصہ آدھے ضلع کو گھیرے ہوئے ہے۔ اور گو اِن پہاڑوں میں یہ بڑا نقص ہے کہ درختوں سے جو در اصل اِن کا زیور ہیں بالکل خالی ہیں۔ اور اُن کا بالائی حصہ کوسوں تک انسان و حیوان کی سکونت اور پرورش کے لئے پھیلتا ہوا چلا گیا ہے۔ اور صرف نظر کے قدم قدم پر چھوٹے اور بڑے گول اور نوکدار روڑوں سے ٹھوکر کھانے سے محسوس ہوتا ہے کہ بالائے کوہ ہیں۔ لیکن پھر بھی کہیں کہیں خصوصاً چڑھاؤ اور اُتار پر ایسے ایسے دلفریب سماں سامنے آ جاتے ہیں جو بھولے سے بھی نہیں بھلائے جا سکتے۔ اگرچہ گرمیوں کے موسم میں اُن کی جلی بھُنی سطح اور ڈراونی بلندی تھکے ماندے مُسافروں کا دل دُور سے نظر آکر بٹھا دیتی ہے۔ لیکن کسی کسی مقام پر جب قریب پہنچتے ہیں تو اُس کی کافی تلافی ہو جاتی ہے۔ بیڑ کے مغرب میں جس مقام پر گھاٹ ختم ہوتا ہے وہاں کی زمین عجب زرخیز ہے۔ کوسوں تک جدھر نظر جاتی ہے ہرے بھرے کھیتوں کی تازگی کحل الجواہر کا کام کرتی ہے۔ اور برسات کے موسم میں خواہ حضرتِ میکائیل کیسی ہی جُز رسی فرمائیں مگر وہاں کی

سیر حاصل زمین محنت کے مارے کسانوں کو وقت پر مالا مال کردیتی ہے ۔ جوار کے درخت اِنسان کے قد سے بھی ایک ہاتھ اُونچے ہوتے ہیں اور بڑے بڑے دانوں کی کثرت سے بُھٹّے پھٹے پڑتے ہیں ۔ اِن زرخیز کھیتوں کا سِلسلہ ایک سیدھی ہموار سڑک پر ختم ہوتا ہے جو بخطِ مُستقیم گھاٹ سے اُترتے ہوئے احمد نگر کو جاتی ہے ۔ یہ کھیت اور یہ سڑک آفتاب کی تیز روشنی میں بالکل ایسے معلوم ہوتے ہیں کہ گویا دھانی دوپٹّے پر رُوپہلی ٹھپّہ لگا ہوا ہے ۔ اِس سڑک کی دُوسری طرف گھاٹ کے کنارے کے نزدیک موضع سوناڑہ اِس طرح واقع ہوا ہے کہ گویا کوئی عقاب قُلّۂ کوہ پر پر پھیلائے ہوئے بیٹھا ہے ۔ اگرچہ مکانات اور باشندوں کی عام حالت اور اشغال کے لحاظ سے مرہٹواری کے دوسرے دیہات کے مقابلے میں سوناڑے میں کوئی چیز ما بہ الامتیاز نہیں ہے ۔ لیکن گِرد و اطراف کی سرسبزی و شادابی ۔ ٹھنڈی ہوائیں ۔ باشندوں کی فارغُ البالی اور تواضع اور سب سے زیادہ وہاں کا دِلفریب منظر اِنسان کے دِل پر عجب اثر ڈالتا ہے ۔ موضع کی دُوسری طرف بجانبِ مغرب نصف میل تک اُفتادہ زمین کا سِلسِلہ ۔ جو کہیں سے اُونچی اور کہیں سے نیچی ہے ۔ نشیب و فرازِ ہستی کا سبق پڑھاتا ہوا گھاٹ کے

کنارے تک چلا گیا ہے۔ وہاں پہنچ کر خدا کی قدرت کا تماشا نظر آتا ہے۔ اگر ذرا گردن جھکا کر دیکھا جائے تو ایک عمیق غار نظر آتا ہے۔ جس کی دونوں طرف سیدھی دیواریں کھڑی ہوئی ہیں۔ یہ دونوں دیواریں مِلکر زاویۂ حادّہ بناتی ہیں۔ اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کسی فوق الانسان قوّت نے پہاڑ کا ایک مثلث نما ٹکڑا جدا کرلیا ہے۔ عمق پانچ چھ سو فیٹ سے کم نہیں ہے اور چونکہ اُتار بالکل عمودی ہے اِس لئے نظر کانپتی تھرتھراتی نیچے اُترتی ہے۔ مگر وہاں پہنچ کر جو سماں سامنے آتا ہے۔ وہ تمام خوف اور تمام زحمت کا کافی بلکہ کافی سے بھی زیادہ معاوضہ ہو جاتا ہے۔ چونکہ عُرفِ عام میں اِس غار کی گہرائی سوتاڑ کے برابر سمجھی جاتی ہے اِس لئے موضع کا نام سوتاڑہ رکھا گیا ہے۔ خوف زدہ نگاہ سطحِ تحتانی پر پہنچ کر ہر طرف گھنے درخت دیکھتی ہے۔ جن کے گھنگھور پتّوں کی سیاہی مائل سبزی دل پر ایک خاص اثر پیدا کرتی ہے۔ اور درختوں کے بیچ میں پتّوں کی سبز نقاب مُنہ پر ڈالے ہوئے ناہموار پہاڑی سطح پر ایک بلورین چشمہ بہتا ہوا نظر آتا ہے۔ جہاں کہیں کہ پتّے زیادہ گھنے نہیں ہیں۔ یا دو درختوں کی شاخیں آپس میں گلے ملتی ہیں۔ یا

ہوا کے جھونکے نقاب کو ذرا چہرے سے ہٹا دیتے ہیں۔ چشمے کے شفاف پانی کی نورانی جھلک اِنساں کی اپنی ہستی کو بھلا کر کسی اور ہستی کو یاد دلاتی ہے۔ غور سے دیکھتے ہیں۔ تو پانی میں کسی گنبد نما عمارت کا عکس پیچ و تاب کھاتا ہوا نظر آتا ہے۔ اور جب سائے سے اصل کی طرف ذہن منتقل ہوتا ہے۔ تو ڈھونڈتے ڈھونڈتے گھنے پتوں کی گہری سبزی سے کوئی سفید سفید چیز۔ جس نے منظر کو اور بھی دِلربا بنا دیا ہے۔ جھانکتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ جِس مقام پر غار بصورتِ زاویہ ختم ہوتا ہے وہاں کچھ اور ہی کیفیت ہے۔ ہر طرف سے چھوٹے چھوٹے چشمے بہتے چلے آتے ہیں۔ اور غار کے قریب پہنچ کر اُن کا منتشر پانی ایک تیز پہاڑی چشمے کی شکل میں نمودار ہوتا ہے۔ جو شور مچاتا اُچھلتا کودتا مچلتا کنارے تک پہنچتا ہے۔ اور وہاں اپنی سطح کو۔ جس کی تلاش میں اِس قدر سرگرداں و پریشان ہونا پڑا ہے۔ نہ پاکر بے قرار ہو جاتا ہے۔ اور اُسی کرب و اضطرار کے عالم میں ایک چھلانگ ایسی مارتا ہے کہ مُنہ کے بل گرتا ہے۔ اور یہ معلوم ہونے لگتا ہے کہ گویا ایک دریا ہوا میں معلق لٹک رہا ہے۔ یہ تماشا دیکھ کر اِنسان اِس قدر محو

ہو جاتا ہے ۔ کہ اِس کا بے اِختیار جی چاہتا ہے کہ ذرا نیچے اُتر کر اس بہارِ جانفزا کا لُطف اور بھی اچّھی طرح اُٹھائیں مگر پہلے یہ عمُودی اُتار ۔ دِل بٹھا دینے والی گہرائی اور اُونچی اُونچی ناہموار سیڑھیاں اُس کے پاؤں پکڑ لیتی ہیں ۔ مگر شوق اُسے اِس زور سے دھکیلتا ہے کہ بے اِختیار اُس کے قدم حرکت میں آتے ہیں اور ان انگڑھ سیڑھیوں کو ۔ جن کے بنانے میں دستِ صنعت کا بہت ہی دخل ہے ۔ جس طرح بنتا ہے طے کرتا ہوا ایک ایسے مقام پر پہنچتا ہے ۔ جہاں کچھ دُور پہلوان چٹّان کے سوا کوئی اور شے نظر نہیں آتی ۔ مجبُور بیٹھ کر پھسلنے لگتا ہے ۔ اور جب تھوڑی دیر میں پھر سیڑھیاں نمُودار ہو جاتی ہیں ۔ تو پھر پہلے کی طرح گرتا پڑتا آگے بڑھتا ہے ۔ اور آخر خُدا خُدا کرکے کوئی آدھ گھنٹے کی سخت محنت میں ۔ جو اُس کو پسینے پسینے کر دیتی ہے ۔ نیچے کی سطح پر قدم رکھتا ہے ۔ مگر وہاں پہنچتے ہی ایسا ہوش رُبا ’سین‘ دیکھتا ہے جو تمام کُلفتوں کو آن کی آن میں بُھلا دیتا ہے ۔ دو طرف سر بفلک کشیدہ سنگلاخ دیواریں نظر کو روکتی ہیں ۔ جن پہ جا بجا کسی دیہاتی مگر ہمدردِ انسان نقّاش نے اپنے غیر تربیت یافتہ ہاتھوں سے آدمی نما پُتلوں کی انگڑھ تصویریں

نا واقف اُترنے والوں کی رہبری کے لئے بنادی ہیں - جنُوب کی طرف جہاں تک نظر جاتی ہے کھیت ہی کھیت پھیلتے ہوئے چلے گئے ہیں - جن میں ایک شفاف ندی - جس کا پاٹ فاصلے کے ساتھ بڑھتا جاتا ہے - بہہ رہی ہے - شمال کی طرف آبشار ریل کی طرح شور مچاتی ہوئی گر رہی ہے - مگر درختوں کی جھُرمٹ کی وجہ سے نظر نہیں آتی - بیچ میں ایک بلّوریں چشمہ اپنی پہاڑی ندی میں عجب مستانہ چال سے لڑکھڑاتا قدم قدم پر گول اور نوکدار اور چوپہل چھوٹے اور بڑے سنگریزوں سے ٹکّر کھاتا ہوا بہہ رہا ہے - اور ہر طرف بڑے بڑے درخت اُس کے سرد اور شفّاف پانی کو آفتاب کی گرمی اور پہاڑی ہَواؤں کے تند جھونکوں سے محفوظ رکھنے کے لئے ہر طرف چھتریاں لگائے کھڑے ہیں - جن میں سے چھن چھن کر آفتاب کی زرد کرنیں سطحِ آب پر گرتی اور پانی میں مہتاب کے چھوٹنے کا سماں دکھاتی ہیں - چشمے کے اُدھر پتّوں میں چھپی ہوئی وہی عمارت - جس کا عکس اُوپر سے نظر آیا تھا - دکھائی دیتی ہے - اور جب چشمے کو عبور کرکے دُوسری طرف پہنچتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ بلند کرسی پر ایک چھوٹا سا مندر ہے - جو کسی فطرت پرست رِشی نے اِس ہوش رُبا

مقام میں ۔ جہاں ہر شے صانعِ حقیقی کی لاجواب صنعت کا پتہ دے رہی ہے ۔ اطمینانِ قلب سے صحیفۂ فطرت کی ورق گردانی میں مصروف رازِ ہستی کے حل کرنے کی نیّت سے بنایا ہے ۔ اُس دلرُبا مندر کی سیر اور اُس کے بانی کے لاجواب اِنتخاب پر داد دیکر اِنسان درختوں کے سائے میں چشمے کے کنارے کنارے اِس کی دِل لُبھانے والی خوش فعلیوں کا نظارہ کرتا ہوا شمال کی طرف بڑھتا ہے ۔ اور جوں ہی کہ درختوں کے جھُنڈ سے سر نکالتا ہے ایک عجیب جانفزا منظر نظر کے سامنے آجاتا ہے ۔ شور ایسا ہے کہ کان پڑی آواز سُنائی نہیں دیتی ۔ مگر معلوم یہ ہوتا ہے کہ ایک دریا اُمڈا ہوا چلا آتا ہے ۔ جس سے نظر کو حیرت کے ساتھ تسکین بھی ہوتی ہے ۔ جب عالمِ محویّت میں قدم بڑھاتا اور بھی قریب ہوتا اور نظر اُٹھاکر دیکھتا ہے ۔ تو پہلے یہ معلُوم ہوتا ہے کہ ایک بلّور کی چادر ہَوا میں لٹکی ہوئی ہے ۔ مگر کسی قدر نیچے آکر اُس چادر کے ٹکڑے ہوکر کئی دھاریں بن جاتی ہیں ۔ اور تھوڑی دُور تک یہی کیفیت رہتی ہے ۔ پھر ہر چھوٹی دھار بڑی بڑی بوُندوں کی شکل میں مُنتقل ہوتی ہے ۔ جن کی جسامت فاصلے کے ساتھ گھٹتی جاتی ہے ۔ یہاں تک کہ جب نیچے پہنچتی ہیں تو چھوٹی ہوتے ہوتے جزوِ لایتجزیٰ کا

ثبوت دیتی ہوئی دھوئیں کی شکل میں نمودار ہوتی ہیں۔ لیکن یہاں کی خاک بھی اکسیر کا حکم رکھتی ہے۔ کہ یہ موہوم اجزائے مائی سطحِ تحتانی سے ملحق ہوتے ہی پھر ایک زوردار چشمہ بن جاتے ہیں۔ یہ نظارہ اِس قدر دلفریب ہے۔ کہ اِنسان گھنٹوں تک عالمِ محویّت میں نظر جمائے کھڑا رہتا ہے۔ پھر دفعۃً خیال آتا ہے کہ شام ہوئی جاتی ہے۔ واپس چلنا چاہیئے۔ مگر شوق کے تقاضے اور ہمّت دلانے نے یہاں تو پہنچا دیا تھا۔ لیکن اب واپسی کارے دارد۔ بہر حال جس طرح بھی ممکن ہے با دلِ ناخواستہ گرتا پڑتا بیٹھتا اُٹھتا جا بجا پانی سے حلق کو تر کرتا ہوا اُوپر پہنچتا ہے۔ اور تھک تھکا کر بدن تختہ سا ہو جاتا ہے۔ اور یہ معلوم ہوتا ہے۔ کہ

مصرع

خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سُنا افسانہ تھا

محمد عزیز مرزا

بندرِ عبّاس

[میرے روز نامچے کا ایک ورق]

۲۷- فروری ۱۹۳۵ء روز چہار شنبہ - بندرِ عبّاس ایک

پورٹ’ ہے جو خلیج فارس کے کنارے پر واقع ہے۔ اِس کی آبادی کوئی چار ہزار آدمیوں کی ہے۔ یہاں ایرانی۔ ہندوستانی۔ حبشی۔ ہندو۔ خوجے۔ ملتانی اور حیدر آباد سندھ کے لوگ آباد ہیں۔ اہلِ سُنّت و جماعت کی تعداد سے شیعوں کی تعداد دو حصّے زیادہ ہے۔ پہلے فرقے کے لوگ تمام تر شافعی مذہب کے ہیں۔ اور اپنے مُجتہد جناب شیخ علی صاحب کے مقلّد ہیں۔ دُوسرے گروہ کے لوگ جناب شیخ محمّد رضا صاحب رشدی کے پیرو ہیں۔ یہاں ایک حاکم رہتے ہیں۔ جن کا نام نائب الحکومت مرزا نصر اللہ خاں ہے۔ یہ اعلیٰ درجے کی تہذیب اور اخلاق سے آراستہ ہیں۔ ‘گورنمنٹ’ ایران سے اِن کی کوئی تنخواہ مقرر نہیں۔ اِنھیں تین لاکھ بیس ہزار پر بندرِ عبّاس اِجارہ دیدیا گیا ہے۔ اِسی میں گُمرک (چونگی) کی آمدنی اور تمام آمدنیاں شامل ہیں۔ یہاں ایک ‘وائس کونسل’ مرزا علی خاں طہرانی بھی ہیں۔ جو کرنل راس ‘برٹش کونسل’ بوشہر کی طرف سے مُقرّر ہیں۔ اِن کی سالانہ تنخواہ دو ہزار آٹھ سو روپیہ مُقرّر ہے اور مقدّماتِ دیوانی میں فی صدی پانچ روپیہ ‘کمیشن’ پاتے ہیں۔ یہاں کے مُقدّمات مرزا نصر اللہ خاں کے سپرد ہیں مگر اِن کا حُکم قطعی نہیں۔ یہ صِرف اپنے حاکِمِ بالا متعینۂ بوشہر کو ‘رپورٹ’ بھیج دیتے ہیں اور اُن کی منظوری

پر مقدمے کے انفصال کا دار و مدار ہے - ہاں - اتنا ہے کہ خفیف جرائم پر یہ تھوڑی بہت سزا دے سکتے ہیں - مثلاً ایک آدھ دن کی قید یا کچھ دُرّے لگا دینا - مگر کوئی بندھا ہوا قانونِ تازیانہ نہیں جس پر پورا پورا عمل کیا جائے - سنگین اور کشت و خون کے مقدموں میں بیانات و اظہارِ گواہ لیکر اور اُن کی مِسل مرتّب کرکے بوشہر یا براہِ راست طہران بھیج دیجاتی ہے اور اُس کے جواب پر مقدمے کا فیصلہ ہوتا ہے - اگر کوئی مقدمہ رعایاے انگریزی کی طرف سے ہے - تو وہ مرزا علی خاں کے اجلاس میں پیش ہوتا ہے - اور اگر مشترک رعایا میں تو انگریزی اور ایرانی حکومتوں کے افسر ملکر اِس کا تصفیہ کرتے ہیں - اور اِس کی رپورٹ، منظوری کے لئے بوشہر روانہ کی جاتی ہے - اگر وہاں کچھ اختلاف ہوتا ہے تو وہ براہِ راست امین السلطان وزیرِ اعظم مالیات کے پاس بھیج دی جاتی ہے -

بندرِ عباس جنوب میں شمیل تک ہے - جس کا تین میل کا فاصلہ ہے - شمال میں محالِ ایسین جو ایک میل تک ہے - مشرق میں میناؤ جو ۴۸ میل اور مغرب میں خمیر تک جس کا سلسلہ ۴۵ میل تک چلا

گیا ہے - علاوہ اِس کے سمندر میں بُستان واقع ہوئے ہیں - اور آرمز - یسرک - کشیم جو جزیرۂ طویل میں ہیں وہ بھی حُدُودِ بندر عبّاس میں داخل ہیں - یہاں ایک مجلسِ تجارت ہے جس میں تجارتی مُقدّمات کا تصفیہ ہوتا ہے - اُس کے پانچ ‘ممبر’ ہیں - جن کو مُقدمات کی تجویز کا کامل اِختیار دیا گیا ہے - اور یہ اپنی رائے لکھکر مرزا نصر اللہ خاں حاکم کے پاس بھیج دیتے ہیں اور اِس کے مُوافق مُجرم سزا یاب ہوتے ہیں - مجلسِ تجارت کی ماہانہ ‘رپورٹ’ مشیرُ الدّولہ وزیرِ صیغۂ تجارت کے پاس طہران بھیجی جاتی ہے -

یہاں کی ‘پولیس’ کی حالت نہایت ردی ہے - میں نے دیکھا کہ سپاہی نیلے رنگ کی وردیاں پہنے کندھوں پر بندوق رکھے گاجریں چباتے پڑے پھرتے رہتے ہیں - اگر اُن کے شانوں پر بندوق نہ ہوتی تو میں کہہ سکتا تھا کہ یہ کوئی نئی خِلقت ہے - ‘پولیس’ میں صرف چالیس سپاہی ہیں - وہ بھی دُبلے پتلے اور نہایت ہی زار و نزار - فاقوں کے مارے چہرے کی ہڈیاں نکلی ہوئی تھیں - تنخواہ پانچ روپیہ مہینہ پاتے ہیں - اِن کا افسر ایک بلوچستانی ہے جس کا نام عبداللہ خاں ہے - یہ بیس روپیہ ماہوار پاتا ہے اور گویا

ہیڈ کانسٹبل ہے - یہاں ایک توپ خانہ اور پانچ توپیں
بھی ہیں اور اِس کا انتظام بھی اِسی شخص کے متعلّق ہے -
اِس بندرگاہ کی سالانہ آمدنی - مستاجری مع محصولِ
زراعت و نخلستان و چونگی وغیرہ تین لاکھ بیس ہزار سے
زائد ہے - درآمدِ اشیا پر فی صدی تین روپیہ آٹھ آنہ
چونگی لی جاتی ہے اور زراعتی مال پر فی صدی دس
روپیہ زمین اور نخلستان کے لگان کا نرالا ڈھنگ ہے -
یعنے جو باغات چالیس برس قبل سے لگائے ہوئے اور
درجِ 'رجسٹر' ہیں - اُن کے پیداوار پہ پانچواں حصّہ محصُول
لیا جاتا ہے - اور اگر کسی شخص کے پاس چند باغات ہوں
یا ایک ہی باغ ہو اور اُس نے اور چھوٹے چھوٹے باغات
خرید کئے یا لگائے ہوں تو اُن کا لگان نہیں دینا پڑتا
ہے - یہاں 'دسمبر' میں گیہوں بوئے جاتے اور 'مارچ' میں
کاٹے جاتے ہیں - 'اگست' میں خُرمے کی فصل تیّار ہوتی
ہے - برسات 'نومبر' سے شرُوع ہوتی ہے اور آخر 'فروری'
تک اِس کا سلسلہ قائم رہتا ہے - یہاں سردی گرمی
دونوں شِدّت کی پڑتی ہیں - بلکہ کوہِ ارمز کے لگ بھگ
ہونے سے گرمی اور بھی چھکّے چھُڑاتی ہے - میں برسات کے
اخیر میں پہنچا مگر دن کو وہ تڑاقے کی گرمی تھی کہ الاماں!

یہاں سے تجارتی مال ممالکِ غیر میں سالانہ ایک کروڑ سے کم کا نہیں جاتا اور اِسی قدر بیرونجات سے بھی یہاں آتا ہے۔ حاجی سید جعفر علی صاحب عَلوی، اجنٹ آغا عبد الحسین صاحب امینُ التجّار یہاں مُقیم رہتے ہیں اور یہ بھی بڑی دُور تک اپنا تجارتی مال بھیجتے ہیں۔ جدّے کو گیہوں اور گوند وغیرہ ایران کو قماشِ پارچہ۔ ریسمان۔ قند۔ زنجبیل۔ لونگ۔ لندن کو شالیں گیہوں۔ السی۔ صدف۔ بصرے کو پتّھر کی سلیں۔ چکیاں گُلِ قرمز۔ بغداد کو تنباکو اور حنا بھیجتے ہیں۔ یہاں لندن سے شمعیں۔ قماش۔ تانبا اور کپڑے وغیرہ۔ چین سے چا۔ برتن۔ چوب چینی اور دارچینی وغیرہ آتی ہے۔

اِس مقام کی کوئی عمارت دلچسپ اور عُمدہ نہیں۔ بندرگاہ کے کنارے پتّھر کے مکانات ہیں۔ جن پر سفید مٹّی لیس دی ہے۔ اور دھنّیاں رکھ کر انھیں خرمے کی پتّیوں سے پٹاؤ کی طرح چھپا دیا ہے۔ تمام مکانات بد نما اور بدشکل ہیں۔ ہاں ایک عمارت حاکمِ بندرِ عبّاس کی کسی قدر اچھّی ہے اور اِس کے دروازے پر ایک اُونچا سا بالا خانہ ہے۔ جو ایک چھوٹے سے مُدوّر بنگلے کی صُورت میں ہے۔ اور وہ کاٹھ کا بنا اور زرد رنگا ہوا ہے۔

یہ عمارت پُرتگیزوں کے ہاتھ کی تین سو برس اُدھر کی بنی ہوئی ہے - مگر کسی قسم کی خوشنمائی اور عمدگی نہیں - اور نہ اِس میں زمانے کی دِل پسند رفتار کے مُوافق کوئی نئی تراش خراش پیدا کی گئی ہے - وہی پُرانی طرز اب تک قائم ہے - یہاں مسجدیں آٹھ ہیں - پانچ سُنّیوں اور تین شیعوں کی - باغِ مستانی میں ہندوؤں کا معبد ہے - یہاں گلیاں دو تین دکھائی دیں - نہایت تنگ اور خراب حالت میں ہیں - بندرِ عبّاس صِرف ایک منڈی ہے جہاں تجارتی مال آتے جاتے رہتے ہیں - یہاں کے مرد بہت میلے کچیلے - اِن کا لباس وہی عمامہ اور عبا - عورتوں کے پہناوے بھی عجب ڈھب کے ہیں - کہنے کو تو مُنہ پر نقاب تھے - جِسم پر برقعہ پڑا تھا - مگر دونوں آنکھیں اور کالے کالے رُخسارے کھُلے تھے - صِرف ناک پر کپڑے کا ایک غِلاف چڑھا تھا اور وہ دیوار کی طرح اُٹھی ہوئی دکھائی دیتی تھی - صُورتیں ایسی کالی بھجنگی کہ دیکھ کر قے آتی تھی - ٹخنوں تک اُونچے اُونچے بندرِ عبّاس کی چھینٹوں کے گھٹنے پہنے ہوئے بازاروں میں اللّے تللّے کر رہی تھیں - بازار نہایت ہی ناپاک - گندہ - مچھلی کی بُو نے دماغ کو اور بھی پراگندہ کر دیا تھا - ایک طرف روٹیاں پک رہی تھیں - ترکاریاں

[illegible] ہر قسم کے رکھے ہوئے تھے - کشمش - پستہ - انار - منقّے - اخروٹ - انجیر - یہاں میں نے انار ایک روپے میں پانچ سیر خرید کیا - دہی یہاں کا میٹھا اور دودھ بھی عُمدہ ہوتا ہے - میں نے بازار میں ایک لڑکے کو دیکھا کہ ایک مشک میں دُودھ بھرے سقّوں کی طرح لوگوں کو کٹورے میں پلاتا اور اُن سے پیسے لیتا جاتا تھا -

اِس بندرگاہ میں - سُنار - لوہار - علاقہ بند - سب طرح کے لوگ رہتے ہیں - بہر حال یہاں کی مجموعی حیثیت اور یہاں کے طرزِ اِنتظام پر نظر دوڑا کر صاف ظاہر ہوتا ہے کہ یہ مقام نہایت ہی پست اور خراب حالت میں ہے - نہ اِس کی صفائی و آراستگی کا لحاظ کیا جاتا ہے اور نہ طرزِ اِنتظام میں وسعت دی جاتی ہے - اگر یہاں ایک مجلسِ زراعت خصوصاً ترقیِ زراعت کے خیال سے قائم کی جائے اور شاہِ کجکلاہ کی جانب سے اُفتادہ زمینیں مزروعہ کی جائیں اور پہاڑوں کے چشموں سے اُن کی آبیاری ہو - تو میں سمجھتا ہوں تھوڑے زمانے میں اِس مقام کی حالتِ ظاہری بالکل بدل جائے اور آمدنی بھی بڑھ جائے - صِرف گمرک کی آمدنی پر قناعت کرنا اور زراعتی قوّت کو نہ اُبھارنا کس قدر خِلافِ مصلحت ہے ! مگر افسوس ! ہماری غفلت

شعاریاں - تن آسانیاں - ہمارا عیش و [illegible] ایت فوائد اور نفع بخش اصول کو اپنے آنچل سے چھپا [illegible] ہے - لوگوں کا گمان تھا کہ حضرت شاہ کا سفرِ یورپ مصالحِ ملکی کے لئے بہت مفید ہوگا - اور شاید یہی خیال حضرت شاہ کے بھی مدِ نظر ہو - مگر تجربے سے معلوم ہوا کہ وہ صرف عجائباتِ عالم اور اُن کی نظربازی کے لحاظ سے تھا - اگر ایسا نہ ہوتا تو تمام مُلک میں سرسبزی پھیل جاتی اور ہوائے مُراد چلنے لگتی - مگر افسوس! ہم چاہتے ہیں - زمانہ نہیں چاہتا -

اِس وقت سمندر کے کنارے پانی کم ہوگیا تھا مگر کیچڑ بہت تھی - میں اپنی کشتی یا ہوڑی میں جانے کے لئے ایک حبشی کی پیٹھ پر سوار ہولیا اور میں شرارت سے اُسے ایڑ بھی مارنے لگا - بگڑا اور بگڑ کر کہنے لگا - "آغا ایں چہ می کُنی؟" - میں نے کہا - "خوش باش - مہمیز می کُنم" - اِس جملے پر نہایت ہنسا - کالی صُورت پر سفید دانت جو ہنسی میں دکھائی دئے تو گویا کالے پانی میں موتی چمکنے لگے - میں اب بڑے جہاز میں پہنچا - تھوڑی دیر میں ہر بونگ مچنے لگا - جہاز کے لنگر اُٹھنے کی تیّاریاں ہونے لگیں - اسبابِ تجارتی لادا جا چُکا - چرخی نے اپنا راگ مالا

بن گیا۔ انجن سے اسٹیم بھی نکلنا شُروع ہوا۔ آخر ساڑھے
بارہ بجے اُس نے رُخصتانہ سیٹی دی اور جہاز سطحِ آب
پر رینگتا چلا۔ میں نے دُور سے بندرِ عبّاس کو جُھک کر
تسلیم کی اور اِشاروں میں کہا کہ اگر صحیح و سلامت واپس
آیا تو پھر حضرت کی صُورت نہ دیکھوں گا۔ جہاز کی روانگی
کے وقت میں عرشے پر چلا گیا جہاں کپتان صاحب موجُود
تھے۔ میں نے اُن سے دُور بین لے کر بندرِ عباس کی
آخری دِید کی۔ اُس وقت چلتا پھرتا نظارہ آنکھوں کو
بہت بھلا معلُوم ہوتا تھا۔ جہاز چُھوٹنے کے قبل حبشی قُلی
جو اسباب لادنے کو آئے تھے وہ بھی اپنی اپنی ہوڑیوں پر
رسّوں کے ذریعے سے اُترنے لگے۔ یہ مال لادتے وقت
اور بوجھ اُٹھاتے وقت محنت بھول جانے کے خیال سے
اپنی بھونڈی اور بے سُری آواز میں کچھ گاتے اور سب کے
سب آسے ایک ہی سُر میں الاپتے ہیں۔ مُجھے اِشتیاق
پیدا ہوا کہ یہ گیت کیونکر لکھوں۔ میں نے ایک حبشی کو بُلایا
اور فارسی زبان میں کہا کہ مُجھے تم اپنا گیت بتاؤ۔ وہ کُچھ
خواندہ تھا۔ اُس نے مُجھے اپنے حبشی گیت کے شُروع کا ایک
ٹکڑا لکھوایا۔ جس نے مارے ہنسی کے لٹا لٹا دیا۔ میں نے
اِس کے مُعاوضے میں مُطربِ خوش نوا کو ایک روپیہ دیا۔

اور اُس کی شرح کا بھی اُمیدوار رہا ۔ مگر افسوس جہاز کھل رہا تھا اور اتنا موقع نہ مِلا کہ اِس کے معنے اور مطالب حل کرتا ۔

سجّاد دہلوی
عظیم آبادی

نمک کا داروغہ

جب نمک کا محکمہ قائم ہوا اور ایک خُدا داد نعمت سے فائدہ اُٹھانے کی عام مُمانعت کردی گئی ۔ تو لوگ دروازہ صدر بند پاکر روزن و شگاف کی فکریں کرنے لگے چاروں طرف خیانت اور غبن اور تحریص کا بازار گرم تھا ۔ پٹوار گری کا مُعزّز اور پُر منفعت عُہدہ چھوڑ چھوڑ کر لوگ صیغۂ نمک کی برقندازی کرتے تھے ۔ اور اِس محکمے کا داروغہ تو وکیلوں کے لئے بھی رشک کا باعث تھا ۔ یہ وہ زمانہ تھا جب انگریزی تعلیم اور عیسائیت مُترادف الفاظ تھے ۔ فارسی کی تعلیم سندِ افتخار تھی ۔ لوگ حُسن اور عشق کی کہانیاں پڑھ پڑھ کر اعلیٰ ترین مدارجِ زندگی کے قابل ہو جاتے تھے ۔ مُنشی بنسی دھر نے بھی زُلیخا کی داستان ختم کی اور مجنوں و فرہاد کے قصّۂ غم کو دریافت کیا

امریکہ یا جنگِ نیل سے عظیم تر واقعہ خیال کرتے ہوئے روزگار کی تلاش میں نکلے اِن کے باپ ایک جہاں دیدہ بزرگ تھے۔ سمجھانے لگے بٹیا کی گھر کی حالت زار دیکھ رہے ہو۔ قرضے سے گردنیں دبی ہوئی ہیں۔ لڑکیاں ہیں وہ گنگا جمنا کی طرح بڑھتی چلی جاتی ہیں۔ میں کگارے کا درخت ہوں نہ معلوم کب گر پڑوں۔ تمھیں گھر کے مالک و مختار ہو۔ مشاہرے اور عہدے کا مطلق لحاظ مت کرنا یہ تو پیر کا مزار ہے۔ نگاہ چڑھاوے اور چادر پر رکھنی چاہیے۔ ایسا کام ڈھونڈھنا جہاں کچھ بالائی رقم کی آمد ہو۔ ماہوار مشاہرہ پورنماشی کا چاند ہے۔ جو ایک دِن دکھائی دیتا ہے۔ اور پھر گھٹتے گھٹتے غائب ہو جاتا ہے۔ بالائی رقم پانی کا بہتا ہوا سوتا ہے۔ جس سے پیاس ہمیشہ بجھتی رہتی ہے۔ مشاہرہ اِنسان دیتا ہے۔ اِسی سے اِس میں برکت نہیں ہوتی۔ بالائی رقم غیب سے مِلتی ہے۔ اِسی سے اِس میں برکت ہوتی ہے۔ اور تم خود عالم و فاضل ہو۔ تمھیں کیا سمجھاؤں یہ معاملہ بہت کچھ ضمیر اور قیافے کی پہچان پر منحصر ہے اِنسان کو دیکھو اُس کی ضرورت کو دیکھو۔ موقع دیکھو اور خُوب غور سے کام لو۔ غرضمند کے ساتھ ہمیشہ بے رحمی اور بے رُخی کر سکتے ہو لیکن بے غرض سے معاملہ کرنا مُشکل

کام ہے۔ اِن باتوں کو گرہ میں باندھ لو۔ میری ساری زندگی کی کمائی ہیں۔

بزرگانہ نصیحتوں کے بعد کچھ دُعائیہ کلمات کی باری آئی۔ بنسی دھر نے سعادتمند لڑکے کی طرح یہ باتیں بہت توجّہ سے سُنیں اور تب گھر سے چل کھڑے ہوئے اِس وسیع دُنیا میں جہاں اپنا اِستقلال اپنا رفیق اپنی ہمّت اپنا مددگار اور اپنی کوشش اپنا مُربّی ہے۔ لیکن اچھے شگون سے چلے تھے۔ خوبیِ قسمت ساتھ تھی۔ صیغۂ نمک کے داروغہ مقرّر ہوگئے۔ مُشاہرہ معقول بالائی رقم کا کچھ ٹھکانا نہ تھا۔ بوڑھے مُنشی جی نے خط پایا تو باغ باغ ہوگئے۔ کلوار کی تسکین و تشفّی کی ایک سند ملی۔ پڑوسیوں کو حسد ہوا اور مہاجنوں کی سخت گیریاں مائل بہ نرمی ہوگئیں۔

۲

جاڑے کے دِن تھے اور رات کا وقت نمک کے برقنداز اور چوکی دار شراب خانے کے دربان بنے ہوئے تھے۔ مُنشی بنسی دھر کو ابھی یہاں آئے چھ ماہ سے زیادہ نہیں ہوئے لیکن اُسی عرصے میں اُن کی فرض شناسی اور دیانت نے افسروں کا اعتبار اور پبلک کی بے اِعتباری حاصل کرلی تھی۔ نمک کے دفتر سے ایک میل پُورب کی جانب جمنا

[illegible] بہتی تھی ۔ [illegible] اس پر کشتیوں کی ایک گذرگاہ بنی ہوئی تھی ۔ داروغہ کمرہ بند کئے میٹھی نیند سوتے تھے یکایک آنکھ کھلی تو ندی کے میٹھے سہانے راگ کے بجائے گاڑیوں کا شور و غل اور ملاحوں کی بلند آوازیں کان میں آئیں ۔ اُٹھ بیٹھے اتنی رات گئے گاڑیاں کیوں دریا کے پار جاتی ہیں ۔ اگر کچھ دغا نہیں ہے تو اِس پردۂ تاریک کی ضرورت کیوں ۔ شُبہے کو اِستدلال نے تقویت دی ۔ وردی پہنی ۔ طپنچہ جیب میں رکھا ۔ اور آن کی آن میں گھوڑا بڑھائے ہوئے دریا کے کنارے آپہنچے دیکھا تو گاڑیوں کی ایک لمبی قطار زُلفِ عنبریں سے بھی زیادہ طُولانی پُل سے اُتر رہی ہے ۔ تحکّمانہ انداز سے بولے ۔

"کِس کی گاڑیاں ہیں؟"

تھوڑی دیر تک سنّاٹا رہا ۔ آدمیوں میں کچھ سرگوشیاں ہوئیں ۔ تب اگلے گاڑی بان نے جواب دیا "پنڈت الوپی دین کی ۔"

"کون پنڈت الوپی دین؟"

"داتا گنج کے ۔"

منشی بنسی دھر چونکے ۔ الوپی دین اِس عِلاقے کا سب سے بڑا اور مُمتاز زمیندار تھا لاکھوں کی ہُنڈیاں

چلتی تھیں۔ غلّے کا کاروبار الگ۔ بڑا صاحب [illegible] حکّام رس بڑے بڑے انگریز افسر اُس کے علاقے میں شکار کھیلنے آتے اور اُس کے مہمان ہوتے بارھوں مہینے سدا برت چلتا تھا۔ پوچھا "کہاں جائیں گے"؟ جواب ملا کہ کانپور کو۔ لیکن اِس سوال پر کہ "اِن میں ہے کیا"؟ ایک خاموشی کا عالم طاری ہوگیا۔ اور داروغہ صاحب کا شبہہ یقین کے دروازے تک آگیا۔ جواب کے ناکام اِنتظار کے بعد ذرا زور سے بولے "کیا تم سب گونگے ہوگئے ہم پوچھتے ہیں اِن میں کیا لدا ہے؟"

* * *

جب کی بھی کوئی جواب نہ ملا تو اُنھوں نے گھوڑے کو ایک گاڑی سے مِلا دیا اور ایک بورے کو ٹٹولا۔ شبہہ یقین سے ہم آغوش تھا۔ یہ نمک کے ڈھیلے تھے۔

پنڈت الوپی دین اپنے سجیلے رتھ پر سوار کچھ سوتے کچھ جاگتے چلے آتے تھے کہ دفعتہً کئی گھبرائے ہوئے گاڑی بانوں نے آکر جگایا۔ اور بولے "مہا راج! دروغا نے گاڑیاں روک دیں اور گھاٹ پر کھڑے آپ کو بلاتے ہیں"۔

پنڈت الوپی دین کو زر علیہ السّلام کی طاقت کا پورا پورا اور عملی تجربہ تھا۔ وہ کہا کرتے تھے کہ دُنیا کا ذِکر ہی کیا دولت کا

سکہ بہشت میں بھی رائج ہے۔ اور اُن کا یہ قول بہت صحیح تھا قانون اور حق و اِنصاف یہ سب دولت کے کھلونے ہیں۔ جن سے وہ حسبِ ضرورت اپنا جی بہلایا کرتی ہے لیٹے لیٹے امیرانہ لاپروائی سے بولے "اچھا چلو ہم آتے ہیں"۔ یہ کہکر پنڈت جی نے بہت اِطمینان سے پان کے بیڑے لگائے۔ اور تب لحاف اوڑھے ہوئے داروغہ جی کے پاس آکر بے تکلّفانہ انداز سے بولے "بابو جی اشیرباد ہم سے ایسی کیا خطا ہوئی کہ گاڑیاں روک دی گئیں ہم برہمنوں پر تو آپ کی نظرِ عنایت ہی رہنی چاہیے۔"

بنسی دھر نے الوپی دین کو پہچانا بے اعتنائی سے بولے "سرکاری حکم"

الوپی دین نے ہنسکر کہا "ہم سرکاری حکم کو نہیں جانتے اور نہ سرکار کو ہمارے سرکار تو آپ ہی ہیں۔ ہمارا اور آپ کا تو گھر کا معاملہ ہے کبھی آپ سے باہر ہو سکتے ہیں۔ آپ نے ناحق تکلیف کی یہ ہو ہی نہیں سکتا کہ اِدھر سے جائیں اور اِس گھاٹ کے دیوتا کو بھینٹ نہ چڑھائیں۔ میں خود آپ کی خدمت میں حاضر ہوتا"

بنسی دھر پر دولت کی اِن شیریں زبانیوں کا کچھ اثر نہ ہوا۔ دیانت داری کا تازہ جوش تھا کڑک کر بولے "ہم اُن نمک حراموں میں نہیں ہیں جو کوڑیوں پر اپنا ایمان بیچتے پھرتے ہیں آپ اِس وقت حراست میں ہیں صبح کو آپ کا باقاعدہ چالان ہوگا۔ بس مجھے زیادہ باتوں

کی فرصت نہیں ہے جمعدار بدلو سنگھ تم اِنھیں حراست میں لے لو۔ میں حکم دیتا ہوں۔"

پنڈت الوپی دین اور اُس کے ہوا خواہوں اور گاڑی بانوں میں ایک ہل چل سی مچ گئی یہ شاید زندگی میں پہلا موقع تھا۔ کہ پنڈت جی کو ایسی ناگوار باتوں کے سُننے کا اِتفاق ہوا۔ بدلو سنگھ آگے بڑھا لیکن فرطِ رُعب سے ہمّت نہ پڑی کہ اُن کا ہاتھ پکڑ سکے الوپی دین نے بھی فرض کو دولت سے ایسا بے نیاز اور ایسا بے غرض کبھی نہیں پایا تھا سکتے میں آگئے خیال کیا کہ یہ ابھی طفلِ مکتب ہے۔ دولت کے ناز و انداز سے مانوس نہیں ہوا اَلھڑ ہے۔ جھجکتا ہے زیادہ ناز برداری کی ضرورت ہے۔ بہت مُنکسرانہ انداز سے بولے "بابو صاحب! ایسا ظُلم نہ کیجیے ہم مِٹ جائیں گے۔ عزّت خاک میں مل جائے گی، آخر آپ کو کیا فائدہ ہوگا۔ بہت ہوا تو تھوڑا سا اِنعام اِکرام مل جائے گا۔ ہم کسی طرح آپ سے باہر تھوڑے ہی ہیں۔"

بنسی دھر نے سخت لہجے میں کہا "ہم ایسی باتیں سُننا نہیں چاہتے۔"

الوپی دین نے جس سہارے کو چٹان سمجھ رکھا تھا وہ پیروں کے نیچے سے کھسکتا ہوا معلوم ہوا خود اعتباری

اور غرورِ دولت کو سخت صدمہ پہنچا۔ لیکن ابھی تک دولت کی تعدادی قوّت کا پورا بھروسا تھا۔ اپنے مختار سے بولے۔ لالہ جی ایک ہزار روپے کا نوٹ بابو صاحب کی نذر کرو آپ اِس وقت بھوکے شیر ہو رہے ہیں۔

بنسی دھر نے گرم ہو کر کہا "ایک ہزار نہیں مجھے ایک لاکھ بھی فرض کے راستے سے نہیں ہٹا سکتا"۔ دولت فرض کی اِس خام کارانہ جسارت اور اِس زاہدانہ نفس کشی پر جھنجھلائی اور اب اِن دونوں طاقتوں کے درمیان بڑے معرکے کی کشمکش شروع ہوئی۔ دولت نے پیچ و تاب کھا کھا کر مایوسانہ جوش کے ساتھ کئی حملے کئے۔ ایک سے پانچ ہزار تک پانچ سے دس، دس سے پندرہ اور پندرہ سے بیس ہزار تک نوبت پہنچی۔ لیکن فرضِ مردانہ ہمت کے ساتھ اِس سپاہِ عظیم کے مقابلے میں یکّہ و تنہا پہاڑ کی طرح اٹل کھڑا تھا۔

الوپی دین مایوسانہ انداز سے بولے۔ اِس سے زیادہ میری ہمت نہیں۔ آیندہ آپ کو اختیار ہے۔ بنسی دھر نے اپنے جمعدار کو للکارا بدلو سنگھ دِل میں داروغہ جی کو گالیاں دیتا ہوا الوپی دین کی طرف بڑھا۔ پنڈت جی گھبرا کر دو تین قدم پیچھے ہٹ گئے۔ اور نہایت منّت آمیز بے کسی

کے ساتھ بولے بابو صاحب ! ایشور کے لئے مجھ پر رحم کیجئے میں پچیس ہزار پر معاملہ کرنے کو تیار ہوں۔

”غیر ممکن“

”تیس ہزار پر؟“ ”غیر ممکن۔“

”کیا چالیس ہزار پر بھی ممکن نہیں؟“

”چالیس ہزار نہیں چالیس لاکھ پر بھی غیر ممکن۔ بدلو سنگھ اس شخص کو فوراً حراست میں لو۔ اب میں ایک لفظ بھی سننا نہیں چاہتا۔“

فرض نے دولت کو پیروں تلے کچل ڈالا الوپی دین نے ایک قوی ہیکل جوان کو ہتکڑیاں لئے ہوئے اپنی طرف آتے دیکھا چاروں طرف مایوسانہ نگاہیں ڈالیں۔ اور تب غش کھا کر زمیں پر گر پڑے۔

۴

دنیا سوتی تھی مگر دنیا کی زبان جاگتی تھی صبح ہوئی تو یہ واقعہ بچے بچے کی زبان پر تھا۔ اور ہر گلی کوچے سے ملامت اور تحقیر کی صدائیں آتی تھیں گویا دنیا میں اب گناہ کا وجود نہیں رہا۔ پانی کو دودھ کے نام سے بیچنے والا گوالا۔ اور فرضی روز نامچے بھرنے والے حکام سرکار۔ اور بغیر ٹکٹ کے ریل پر سفر کرنے والے بابو صاحبان

اور جعلی دستاویزیں بنانے والے سیٹھ اور ساہوکار یہ سب اُس وقت پارساؤں کی طرح گردنیں ہلاتے تھے۔ اور جب دُوسرے دِن پنڈت الوپی دین کا مواخذہ ہوا اور وہ کانسٹیبلوں کے ساتھ شرم سے گردن جھکائے ہوئے عدالت کی طرف چلے۔ ہاتھوں میں ہتکڑیاں دل میں غصہ و غم تو سارے شہر میں ہل چل سی مچ گئی۔ میلوں میں بھی شاید شوقِ نظارہ ایسی اُمنگ پر نہ آتا ہو۔ کثرتِ ہجوم سے سقف و دیوار میں تمیز کرنا مشکل تھا۔

مگر عدالت میں پہنچنے کی دیر تھی پنڈت الوپی دین اِس قلزمِ ناپیدا کنار کے نہنگ تھے حُکّام اِن کے قدر شناس عملے اِن کے نیاز مند۔ وکیل اور مختار اِن کے ناز بردار اور اردلی کے چپراسی اور چوکیدار تو اِن کے درم ناخریدہ غُلام تھے۔ اِنھیں دیکھتے ہی چاروں طرف سے لوگ دوڑے ہر شخص حیرت سے انگشت بدنداں تھا۔ اِس لئے نہیں کہ الوپی دین نے کیوں ایسا فعل کیا۔ بلکہ وہ کیوں قانون کے پنجے میں آئے ایسا شخص جس کے پاس محال کو ممکن کرنے والی دولت اور دیوتاؤں پر جادو ڈالنے والی چرب زبانی ہو کیوں قانون کا شکار بنے۔ حیرت کے بعد ہمدردی کے اظہار ہونے لگے۔ فوراً اُس

حملے کو روکنے کے لئے وکیلوں کا ایک دستہ تیار کیا گیا۔ اور انصاف کے میدان میں فرض اور دولت کی باقاعدہ جنگ شروع ہوئی بنسی دھر خاموش کھڑے تھے۔ یکہ و تنہا بجز سچائی کے اور کچھ پاس نہیں۔ صاف بیانی کے سوا اور کوئی ہتھیار نہیں۔ اِستغاثے کی شہادتیں ضرور تھیں لیکن ترغیبات سے ڈانواڈول حتّیٰ انصاف بھی کچھ اُن کی طرف سے کھچا ہوا نظر آتا تھا۔ یہ ضرور سچ ہے کہ اِنصاف سیم و زر سے بے نیاز ہے۔ لیکن پردے میں وہ اِشتیاق ہے جو ظہور میں ممکن نہیں۔ دعوت اور تحفے کے پردے میں بیٹھ کر دولت زاہد فریب بن جاتی ہے۔ وہ عدالت کا دربار تھا۔ لیکن اُس کے اراکین پر دولت کا نشہ چھایا ہوا تھا۔ مُقدّمہ بہت جلد فیصل ہوگیا۔ 'ڈپٹی مجسٹریٹ' نے تجویز لکھی۔ پنڈت الوپی دین کے خِلاف شہادت نہایت کمزور اور مُہمل ہے۔ وہ ایک صاحبِ ثروت رئیس ہے۔ یہ غیر مُمکن ہے کہ وہ محض چند ہزار کے فائدے کے لئے ایسی کمینہ حرکت کے مُرتکب ہو سکتے۔ داروغہ صاحبِ نمک منشی بنسی دھر پر اگر زیادہ سنگین نہیں تو ایک افسوس ناک غلطی اور خام کارانہ سرگرمی کا الزام ضرور عاید ہوتا ہے۔

ہم خوش ہیں کہ وہ ایک غرض شناس نوجوان ہے۔

لیکن صیغۂ نمک کے اعتدال سے بڑھی ہوئی نمک حلالی نے اُن کے اِمتیاز اور اِدراک کو مغلوب کردیا۔ اُسے آیندہ ہوشیار رہنا چاہیئے ۔ وکیلوں نے یہ تجویز سُنی اور اُچھل پڑے۔ پنڈت الوپی دین مُسکراتے ہوئے باہر نکلے۔ حوالیوں نے روپے برسائے۔ سخاوت اور فراخ حوصلگی کا سیلاب آگیا۔ اور اُس کی لہروں نے عدالت کی بُنیادیں تک ہلا دیں۔ جب بنسی دھر عدالت سے باہر نکلے نگاہیں غرور سے لبریز۔ تو طعن اور تمسخر کے آوازے چاروں طرف سے آنے لگے۔ چپراسیوں اور برقندازوں نے جُھک کر سلام کئے۔ لیکن ایک ایک فقرہ اور ایک ایک اشارہ اِس وقت اِس نشۂ غرور پر ہوائے سرد کا کام کر رہا تھا۔ شاید مُقدمے میں کامیاب ہوکر وہ شخص اِس طرح اکڑتا ہوا نہ چلتا۔ دُنیا نے اِسے پہلے سبق دیدیا تھا۔ اِنصاف اور علم اور پنج حرفی خطابات اور لمبی ڈاڑھیاں۔ اور ڈھیلے ڈھالے چُغے ایک بھی حقیقی عزّت کے مُستحق نہیں۔

۵

لیکن بنسی دھر نے ثروت اور رسوخ سے بَیر مول لیا تھا۔ اِس کی قیمت دینی واجب تھی۔ مشکل سے ایک ہفتہ گُذرا ہوگا کہ معطلی کا پروانہ آپہنچا۔ فرض شناسی کی

سزا ملی ۔ بیچارے دِل شکستہ اور پریشان حال اپنے وطن کو روانہ ہوئے ۔ بوڑھے منشی جی پہلے ہی سے بد ظن ہو رہے تھے کہ چلتے چلتے سمجھایا تھا مگر اِس لڑکے نے ایک نہ سُنی ہم تو کلار اور بوچڑ کے تانے سہیں بڑھاپے میں بھگت بن کر بیٹھیں اور وہاں بس وہی سوکھی تنخواہ ۔ آخر ہم نے بھی نوکری کی ہے اور کوئی عُہدہ دار نہیں تھے لیکن جو کام کیا دِل کھول کر کیا ۔ اور آپ دیانت دار بننے چلے ہیں ۔ گھر میں چاہے اندھیرا رہے مسجد میں ضرور چراغ جلائیں گے حیف ایسی سمجھ پر ۔ پڑھانا لکھانا سب اکارت ہو گیا ۔ اِسی اثناء میں بنسی دھر خستہ حال مکان پر پہنچے اور بوڑھے منشی جی نے رُوداد سُنی تو سر پیٹ لیا اور بولے جی چاہتا ہے کہ اپنا اور تمہارا سر پھوڑ لوں ۔ بہت دیر تک پچھتاتے اور کفِ افسوس ملتے رہے ۔ غُصّے میں کچھ سخت سُست بھی کہا اور بنسی دھر اگر وہاں سے ٹل نہ جائیں تو عجب نہیں تھا کہ یہ غُصّہ عملی صورت اختیار کر لیتا بوڑھی اماں کو بھی صدمہ ہوا جگناتھ اور رامیشور کی آرزوئیں خاک میں مل گئیں ۔ اور بیوی نے تو کئی دِن تک سیدھے منہ سے بات نہیں کی ۔

اِس طرح اپنے یگانوں کی تُرش روئی اور بیگانوں

کی دلدوز ہمدردیاں سہتے سہتے ایک ہفتہ گزر گیا۔ شام کا وقت تھا بوڑھے منشی رام نام کی مالا پھیر رہے تھے کہ ان کے دروازے پر ایک سجا ہوا رتھ آکر رکا سبز اور گلابی پردے پچھائیں نسل کے بیل ان کی گردنوں میں نیلے دھاگے سینگ پیتل سے منڈھے ہوئے۔ منشی جی پیشوائی کو دوڑے۔ دیکھا تو پنڈت الوپی دین ہیں۔ جھک کر ڈنڈوت کی اور مدبرانہ دُر فشانیاں شروع کیں۔ آپ کے قدم اس گھر میں آئے ہمارے نصیب جاگے۔ آپ ہمارے مربّی ہیں۔ آپ کو کون سا منہ دکھلائیں منہ میں کالک لگی ہوئی ہے۔ مگر کیا کریں لڑکا نالائق ہے ناخلف ہے۔ ورنہ آپ سے کیوں منہ چھپاتے۔ ایشور بے چراغ رکھے مگر ایسی اولاد نہ دے۔ بنسی دھر نے الوپی دین کو دیکھا مصافحہ کیا۔ لیکن شانِ خود داری لئے ہوئے فوراً گمان ہوا کہ یہ حضرت مجھے جلانے آئے ہیں غرور نے ندامت کے سامنے سر نہیں جھکایا۔ زبان شرمندۂ معذرت نہیں ہوئی۔ اپنے والد بزرگوار کا خلوصِ رواں سخت ناگوار گزرا یکایک پنڈت جی نے قطع کلام کیا۔ ”نہیں بھائی صاحب ایسا نہ فرمائیے“

بوڑھے منشی جی کی قیافہ شناسی نے جواب دیا اندازِ حیرت سے بولے۔ ”ایسی اولاد کو اور کیا کہوں“ الوپی دین

نے کسی قدر جوش سے کہا "مجھے خوشی ہے اور خاندان کا نام روشن کرنے والا ایسا سپوت پایا کہ آپ کو پتا کا شکر گزار ہونا چاہئے۔ دنیا میں ایسے کتنے انسان ہیں جو دیانت پر اپنا سب کچھ نثار کرنے پر تیار ہوں۔ ونشیدھر جی! اسے زمانہ سازی نہ سمجھئے۔ زمانہ سازی کے لئے مجھے یہاں تک تکلیف کرنے کی ضرورت نہ تھی۔ اس رات کو آپ نے مجھے حکومت کے زور سے حراست میں لیا تھا۔ آج میں خود بخود آپ کی حراست میں آیا ہوں۔ میں نے ہزاروں رئیس اور امیر دیکھے ہزاروں عالی مرتبہ حکام سے سابقہ پڑا لیکن مجھے زیر کیا تو آپ نے جنہوں نے سب کو اپنا اور اپنی دولت کا غلام بنا کر چھوڑ دیا مجھے اجازت ہے کہ آپ سے کوئی سوال کروں؟

منشی ونشیدھر کو ان باتوں میں کچھ خلوص کی بو آئی۔ پنڈت جی کے چہرے کی طرف اٹھتی ہوئی مگر تلاش کی نگاہ سے دیکھا۔ صداقت کی گاڑھی گاڑھی جھلک نظر آئی۔ غرور نے ندامت کو راہ دی شرماتے ہوئے بولے "یہ آپ کی ذرہ نوازی ہے۔ غرض نے مجھے آپ کی شان میں بے ادبی کرنے پر مجبور کیا ورنہ میں تو آپ کا خاکِ پا ہوں۔ جو آپ کا ارشاد ہوگا بحدِ امکان اس کی تعمیل سے انکار نہ کروں گا

الوپی دین نے التجا آمیز نگاہوں سے دیکھ کر کہا۔ "دریا کے کنارے آپ نے میرا سوال رد کر دیا تھا لیکن یہ سوال آپ کو قبول کرنا پڑے گا۔"

بنسی دھر نے جواب دیا۔ "میں کس قابل ہوں لیکن مجھ سے جو کچھ ناچیز خدمت ہو سکے گی اُس میں دریغ نہ ہوگا۔"

الوپی دین نے ایک قانونی تحریر نکالی اور اُسے بنسی دھر کے سامنے رکھ کر بولے "اِس مختار نامے کو ملاحظہ فرمائیے اور اِس پر دستخط کیجیے گا۔ میں برہمن ہوں جب تک یہ سوال پورا نہ کیجیے گا دروازے سے نہ ٹلوں گا۔"

منشی بنسی دھر نے مختار نامے کو پڑھا تو شکریے کے آنسو آنکھوں میں بھر آئے پنڈت الوپی دین نے انھیں اپنی ساری ملکیت کا مختارِ عام قرار دیا تھا۔ چھ ہزار سالانہ تنخواہ جیب خاص کے لیے۔ روزانہ خرچ الگ۔ سواری کے لیے گھوڑے۔ اختیارات غیر محدود کانپتی ہوئی آواز سے بولے "پنڈت جی میں کس زبان سے آپ کا شکریہ ادا کروں کہ آپ نے مجھے ان عنایاتِ بیکراں کے قابل سمجھا لیکن میں آپ سے سچ عرض کرتا ہوں کہ میں اتنے اعلیٰ رتبے کے قابل نہیں ہوں۔"

الوپی دین ہنسکر بولے "اپنے منہ سے اپنی تعریف نہ کیجیے"

بنسی دھر نے متین انداز سے کہا۔ "یوں میں آپ کا غلام ہوں آپ جیسے نورانی اوصاف بزرگ کی خدمت کرنا میرے لئے فخر کی بات ہے لیکن مجھ میں نہ علم ہے نہ فراست نہ وہ تجربہ ہے۔ جو اِن خامیوں پر پردہ ڈال سکے۔ ایسی معزز خِدمات کے لئے ایک بڑے معاملہ فہم اور کارکردہ منشی کی ضرورت ہے"۔

الوپی دین نے قلمدان سے قلم نکالا اور بنسی دھر کے ہاتھ میں دے کر بولے مجھے نہ علم کی ضرورت ہے نہ فراست کی نہ کارکردگی کی اور نہ معاملہ فہمی کی اِن سنگریزوں کے جوہر میں بارہا پرکھ چکا ہوں۔ اب حُسنِ تقدیر اور حُسنِ اتّفاق نے مجھے وہ بے بہا موتی دے دیا ہے جس کی آب کے سامنے علم اور فراست کی چمک کوئی چیز نہیں یہ قلم حاضر ہے زیادہ تامّل نہ کیجئے۔ اِس پر آہستہ سے دستخط کیجئے میری پرماتما سے یہی اِلتجا ہے کہ آپ کو سدا وہی ندی کے کنارے والا۔ بے مروّت سخت زبان تُند مزاج لیکن فرض شناس داروغہ بنائے رکھے۔

بنسی دھر کی آنکھوں سے آنسو جھلک پڑے دل کے تنگ ظرف میں اتنا اِحسان نہ سما سکا پنڈت الوپی دین کی طرف ایک بار پھر عقیدت اور پرستش کی نگاہ سے دیکھا

اور مختار نامے پر کانپتے ہوئے ہاتھوں سے دستخط کر دیئے ۔ الوپی دین فرطِ مسرّت سے اُچھل پڑے اور اُنھیں گلے لگا لیا۔

بے غرض مُحسِن

۱

ساون کا مہینہ تھا ریوتی رانی نے پیروں میں مہندی رچائی مانگ چوٹی سنواری اور تب اپنی بُوڑھی ساس سے جاکر بولی "اماں جی آج میں بھی میلا دیکھنے جاؤں گی"

ریوتی پنڈت چنتا من کی بیوی تھی ۔ پنڈت جی نے سرسوتی کی پُوجا میں زیادہ نفع نہ دیکھکر لکشمی دیوی کی مُجاوری کرنی شُروع کی تھی ۔ لین دین کا کار و بار کرتے تھے مگر اور مہاجنوں کے بر خِلاف بجُز خاص خاص حالتوں کے ۲۵ فی صدی سے زیادہ سُود لینا مُناسب نہ سمجھتے تھے۔

ریوتی کی ساس ایک بچّے کو گود میں لئے کھٹولے پر بیٹھی ہوئی تھیں ۔ بہُو کی بات سُنکر بولیں ۔ "بھیگ جاؤ گی تو بچّے کو زُکام ہو جائے گا ۔"

ریوتی ۔ "نہیں امّاں ۔ مُجھے دیر نہ لگے گی ۔ ابھی چلی آؤں گی ۔"

ریوتی کے دو بچّے تھے ۔ ایک لڑکا ۔ دُوسری لڑکی ابھی

گود میں تھی اور لڑکا ہیرا اِن ساتویں سال میں تھا۔ رتیقی نے اسے اچھے اچھے کپڑے پہنائے۔ نظرِ بد سے بچنے کے لئے ماتھے اور گالوں پر کاجل کے ٹیکے لگا دیئے۔ ننّھی بیٹی کے لئے ایک خوش رنگت چُنری دے دی اور اپنی ہمجولیوں کے ساتھ میلا دیکھنے چلی۔

کیرت ساگر کے کنارے عورتوں کا بڑا جمگھٹ تھا نیلگوں گھٹائیں چھائی ہوئی تھیں۔ عورتیں سولہوں سنگار کئے۔ ساگر کے پُر فضا میدان میں۔ ساون کی رِم جھم برکھا کی بہار لوٹ رہی تھیں شاخوں میں جھولے پڑے تھے۔ کوئی جھولا جھولتی کوئی ملار گاتی۔ کوئی ساگر کے کنارے بیٹھی لہروں سے کھیلتی تھی۔ ٹھنڈی ٹھنڈی خوشگوار ہوا۔ پانی کی ہلکی ہلکی پھوہار۔ پہاڑیوں کی نکھری ہوئی ہریالی۔ ہواؤں کے دلفریب جھکولے موسم کو تہ بہ شکن بنائے ہوئے تھے۔

آج گڑیوں کی بِدائی ہے۔ گُڑیاں اپنے سُسرال جائیں گی کنواری لڑکیاں ہاتھ پاؤں میں مہندی رچائے۔ گڑیوں کو گتے کپڑے سے سجائے انہیں بِدا کرنے آئی ہیں۔ انہیں پانی میں بہاتی ہیں اور چہک چہک کے ساون کے گیت گاتی ہیں۔ مگر دامنِ عافیت سے نکلتے ہی ان ناز و نعمت میں پلی ہوئی گڑیوں پر چاروں طرف سے چھڑیوں

اور تالیوں کی بوچھار ہونے لگی۔

دیوکی یہ سیر دیکھ رہی تھی اور ہیرامن ساگر کے زینوں پر اور لڑکوں کے ساتھ گڈیاں پھینکنے میں مصروف تھا۔ زینوں پر کائی لگی ہوئی تھی۔ دفعتہً اس کا پیر پھسلا تو پانی میں جا پڑا۔ دیوکی چیخ مار کر دوڑی اور سر پیٹنے لگی۔ دم کی دم میں وہاں مردوں اور عورتوں کا ایک ہجوم ہو گیا۔ مگر یہ کسی کی انسانیت تقاضا نہ کرتی تھی کہ پانی میں جا کر ممکن ہو تو بچے کی جان بچائے۔ سنوارے ہوئے گیسو نہ بکھر جائیں گے! دھلی ہوئی دھوتی نہ بھیگ جائے گی! کتنے ہی مردوں کے دلوں میں یہ مردانہ خیالات آرہے تھے۔ دس منٹ گذر گئے۔ مگر کوئی شخص کمر ہمت باندھتا نظر نہ آیا۔ غریب دیوکی پچھاڑیں کھا رہی تھی۔ ناگاہ ایک آدمی اپنے گھوڑے پر سوار چلا جاتا تھا۔ یہ اژدہام دیکھ کر اتر پڑا اور ایک تماشائی سے پوچھا۔ "یہ کیسی بھیڑ ہے"؟ تماشائی نے جواب دیا۔ "ایک لڑکا ڈوب گیا ہے"

مسافر۔ کہاں؟

تماشائی۔ "جہاں وہ عورت کھڑی رو رہی ہے"۔

مسافر نے فوراً اپنی گاڑھے کی مرزئی اتاری اور دھوتی کس کر پانی میں کود پڑا۔ چاروں طرف سناٹا چھا گیا

لوگ متحیّر تھے کہ کون شخص ہے ۔ اُس نے پہلا غوطہ لگایا ۔ لڑکے کی ٹوپی ملی دُوسرا غوطہ لگایا تو اُس کی چھڑی ہاتھ لگی ۔ اور تیسرے غوطے کے بعد جب اُوپر آیا تو لڑکا اُس کے گود میں تھا ۔ تماشائیوں نے واہ واہ کا نعرۂ پُر شور بلند کیا ماں نے دوڑ کر بچّے کو لپٹا لیا ۔ اِس اثنار میں پنڈت چنتا من کے اور کئی عزیز آ پہنچے اور لڑکے کو ہوش میں لانے کی فکر کرنے لگے آدھ گھنٹے میں لڑکے نے آنکھیں کھول دیں ۔ لوگوں کی جان میں جان آئی ڈاکٹر صاحب نے کہا اگر لڑکا دو منٹ بھی پانی میں اور رہتا تو بچنا غیر ممکن تھا ۔ مگر جب لوگ اپنے گُم نام مُحسن کو ڈھونڈھنے لگے تو اُس کا کہیں پتہ نہ تھا ۔ چاروں طرف آدمی دوڑائے سارا میلا چھان مارا ۔ مگر وہ نظر نہ آیا ۔

۲

بیس سال گذر گئے پنڈت چنتا من کا کار و بار روز بروز بڑھتا گیا اِس دوران میں اُس کی ماں نے ساتوں جاترائیں کیں ۔ اور مریں تو ان کے نام پر ٹھاکر دوارا تیّار ہوا ۔ ریوتی بہو سے ساس بنی لین دین بھی کھاتہ ہیرا من کے ہاتھ میں آیا ۔ ہیرا من اب ایک وجیہ لحیم شحیم

نوجوان تھا۔ نہایت خلیق نیک مزاج کبھی کبھی باپ سے چھپاکر غریب اسامیوں کو بِلا سُودی قرض دیا کرتا۔ چنتا من نے کئی بار اِس گُناہ کے لئے بیٹے کو آنکھیں دکھائی تھیں اور الگ کر دینے کی دھمکی دی تھی۔ ہیرا من نے ایک بار ایک سنسکرت پاٹھ شالے کے لئے پچاس روپیہ چندہ دیا۔ پنڈت جی اِس پر ایسے برہم ہوئے کہ دو دن تک کھانا نہیں کھایا۔ ایسے ناگوار واقعے آئے دن ہوتے رہتے تھے اِنھیں وُجُوہ سے ہیرا من کی طبیعت باپ سے کچھ کھِچی رہتی تھی۔ مگر اُس کی یہ ساری شرارتیں ہمیشہ ریوتی کی سازش سے ہوا کرتی تھیں جب قصبے کی غریب بدھوائیں یا زمینداروں کے ستائے ہوئے اسامیوں کی عورتیں ریوتی کے پاس آکر ہیرا من کو آنچل پھیلا پھیلا کر دُعائیں دینے لگتیں تو اُسے ایسا معلوم ہوتا کہ مجھ سے زیادہ بھاگوان اور میرے بیٹے سے زیادہ فرشتہ صفت آدمی دُنیا میں کوئی نہ ہوگا۔ تب اُسے بے اختیار وہ دن یاد آجاتا جب ہیرا من کیرت ساگر میں ڈُوب گیا تھا اور اُس آدمی کی تصویر اُس کے نگاہوں کے سامنے کھڑی ہوجاتی جِس نے اُس کے لال کو ڈُوبنے سے بچایا تھا۔ اُس کے تہِ دل سے دُعا نکلتی اور ایسا جی چاہتا

کہ اُسے دیکھ پاتی تو اُس کے پیروں پر گر پڑتی۔ اُسے اب کامل یقین ہوگیا تھا کہ وہ انسان نہ تھا۔ بلکہ کوئی دیوتا تھا۔ وہ اب اُسی کھٹولے پر بیٹھی ہوئی جس پر اُس کی ساس بیٹھتی تھی۔ اپنے دونوں پوتوں کو کھلایا کرتی تھی۔

آج ہیرا من کی ستائیسویں سال گرہ تھی۔ ریوتی کے لئے یہ دن سال بھر کے دنوں میں سب سے زیادہ مبارک تھا۔ آج اِس کا دستِ کرم خوب فیاضی دکھاتا تھا اور یہی ایک بیجا صرف تھا جس میں پنڈت چنتامن بھی اُس کے شریک ہو جاتے تھے۔ آج کے دن وہ بہت خوش ہوتی اور بہت روتی اور آج اپنے گُم نام مُحسن کے لئے اُس کے دل سے جو دُعائیں نکلتیں وہ دل و دماغ کے اعلیٰ ترین جذبات میں رنگی ہوئی تھیں۔ اُسی کی بدولت تو آج مجھے یہ دن اور سُکھ دیکھنا نصیب ہوا ہے!

۳

ایک دن ہیرا من نے آکر ریوتی سے کہا ”اماں سری پور نیلام پر چڑھا ہوا ہے کہو تو میں بھی دام لگاؤں۔“

ریوتی ”سولہوں آنہ ہے“

ہیرامن۔ "سولہو آنہ۔ اچھا گانوں ہے۔ نہ بڑا نہ چھوٹا۔ یہاں سے دس کوس ہے۔ چار ہزار تک بولی چڑھ چکی ہے۔ سو دو سو میں ختم ہو جائے گا۔"

ریوتی۔ "اپنے دادا سے تو پوچھو۔"

ہیرامن۔ "اُن کے ساتھ دو گھنٹے تک سر مغزن کرنے کی کسے فرصت ہے۔"

ہیرامن اب گھر کا مختارِ کل ہو گیا تھا اور چِنتامن کی ایک نہ چلنے پاتی۔ وہ غریب اب عینک لگائے ایک گدے پر بیٹھے اپنا وقت کھانسنے میں صرف کرتے تھے۔

دوسرے دِن ہیرامن کے نام پر سری پور ختم ہو گیا مہاجن سے زمیندار ہوئے۔ اپنے مُنیب اور دو چپراسیوں کو لے کر گانوں کی سیر کرنے چلے۔ سری پور والوں کو خبر ہوئی۔ نئے زمیندار کی پہلی آمد تھی۔ گھر گھر نذرانہ دینے کی تیاریاں ہونے لگیں۔ پانچویں دن شام کے وقت ہیرامن گانوں میں داخل ہوئے۔ دہی اور چاول کا تلک لگایا گیا اور تین سو اسامی پہر رات تک ہاتھ باندھے ہوئے اِن کی خدمت میں کھڑے رہے۔ سویرے مختارِ عام نے اسامیوں کا تعارف کرانا شروع کیا

جو اسامی زمیندار صاحب کے سامنے آتا وہ اپنی بساط کے موافق ایک یا دو روپیہ اُن کے پیروں پر رکھ دیتا دوپہر ہوتے ہوتے وہاں پانچ سو روپیوں کا ڈھیر لگا ہوا تھا۔

ہیرامن کو پہلی بار زمینداری کا مزہ ملا۔ پہلی بار ثروت اور طاقت کا نشہ محسوس ہوا۔ سب نشوں سے زیادہ تیز۔ زیادہ قاتل ثروت کا نشہ ہے جب اسامیوں کی فہرست ختم ہو گئی تو مختار سے بولے "اور کوئی اسامی تو باقی نہیں ہے"؟

مختار "ہاں مہراج۔ ابھی ایک اسامی اور ہے۔ تخت سنگھ"

ہیرامن "وہ کیوں نہیں آیا"

مختار "ذرا سست ہے"

ہیرامن "میں اُن کی سستی اُتاروں گا۔ ذرا کوئی اُسے بُلا لائے"

تھوڑی دیر میں ایک بُوڑھا آدمی لاٹھی ٹیکتا ہوا آیا اور ڈنڈوت کر کے زمین پر بیٹھ گیا۔ نہ نذر نہ نیاز۔ اُس کی یہ گستاخی دیکھ کر ہیرامن کو بخار چڑھ آیا۔ کڑک کر بولے۔ ابھی کسی زمیندار سے پالا نہیں پڑا۔ ایک ایک کی ہیکڑی بھلا دوں گا"

تخت سنگھ نے ہیرامن کی طرف غور سے دیکھ کر جواب

دیا۔ "میرے سامنے بیس زمیندار آئے اور چلے گئے۔ مگر کبھی کسی نے اِس طرح گھُڑکی نہیں دی۔"

یہ کہکر اُس نے لاٹھی اُٹھائی اور اپنے گھر چلا آیا۔

بوڑھی ٹھکرائن نے پوچھا۔ "دیکھا زمیندار کو؟ کیسے آدمی ہیں؟"

تخت سنگھ۔ "اچھّے آدمی ہیں۔ میں انھیں پہچان گیا۔"

ٹھکرائن۔ "کیا تم سے پہلے کی مُلاقات ہے"؟

تخت سنگھ۔ "میری اِن کی بیس برس کی جان پہچان ہے۔ گُڑیوں کے میلے والی بات یاد ہے نہ"؟

اُس دِن سے تخت سنگھ پھر ہیرامن کے پاس نہ آیا۔

۴

چھ مہینے کے بعد ریوتی کو بھی سِری پور دیکھنے کا شوق ہوا۔ وہ اور اُس کی بہو اور بچّے سب سِری پور آئے۔ گانوں کی سب عورتیں اُن سے مِلنے آئیں۔ اِن میں بوڑھی ٹھکرائن بھی تھی۔ اُس کی بات چیت سلیقہ اور تمیز دیکھکر ریوتی دنگ رہ گئی۔ جب وہ چلنے لگی تو ریوتی نے کہا "ٹھکرائن! کبھی کبھی آیا کرنا۔ تم سے مِل کر طبیعت بہت خوش ہوئی"۔ اِس طرح دونوں عورتوں میں رفتہ رفتہ میل ہوگیا۔ یہاں تو یہ کیفیت تھی۔ اور ہیرامن اپنے مختارِ عام کے مُغالطے میں آکر تخت سنگھ کو بے دخل

کرنے کی بندشیں سوچ رہا تھا۔

جیٹھ کی پورنماشی آئی۔ ہیرامن کی سال گرہ کی تیاریاں ہونے لگیں۔ ریوتی چھلنی پر میدہ چھان رہی تھی کہ بوڑھی ٹھکرائن آئی۔ ریوتی نے مسکرا کر کہا۔

”ٹھکرائن۔ ہمارے یہاں کل تمہارا نیوتہ ہے۔“

ٹھکرائن ”تمہارا نیوتہ سر اور آنکھوں پر۔ کون سی برس گانٹھ ہے؟“

ریوتی ”تیسویں“

ٹھکرائن ”نارائن کرے ابھی ایسے ایسے سو دن ہمیں اور دیکھنے نصیب ہوں۔“

ریوتی ”ٹھکرائن تمہاری زبان مبارک ہو۔ بڑے بڑے جنتر منتر کئے ہیں تب تم لوگوں کی دعا سے یہ دن دیکھنا نصیب ہوا ہے۔ یہ تو ساتویں ہی سال میں تھے کہ ان کی جان کے لالے پڑ گئے۔ گڑیوں کا میلا دیکھنے گئی تھی۔ یہ پانی میں گر پڑے۔ بارے ایک مہاتما نے ان کی جان بچائی۔ ان کی جان انھیں کی دی ہوئی ہے۔ بہت تلاش کرایا ان کا نہ پتہ چلا۔ ہر برس گانٹھ پر ان کے نام سے سو روپیہ نکال رکھتی ہوں۔ دو ہزار سے کچھ اونچا ہو گیا ہے۔ بچے کی نیت ہے کہ ان کے نام سے سری پور

میں ایک مندر بنوا دیں۔ سچ مانو ٹھکرائن۔ ایک بار اُن کے درشن مل جاتے تو زندگی سپھل ہو جاتی جی کی ہوس نکال لیتے۔“

ریوتی جب خاموش ہوئی تو ٹھکرائن کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔

دُوسرے دن ایک طرف بیرامن کی سال گرہ کا جشن تھا اور دُوسری طرف تخت سنگھ کے کھیت نیلام ہو رہے تھے۔ ٹھکرائن بولی۔ ”میں ریوتی رانی کے پاس جاکر دہائی مچاتی ہوں۔“

تخت سنگھ نے جواب دیا۔ ”میرے جیتے جی نہیں۔“

۵

اساڑھ کا مہینہ آیا۔ میگھ راج نے اپنی جاں بخش فیاضی دکھائی۔ سری پور کے کسان اپنے اپنے کھیت جوتنے چلے۔ تخت سنگھ کی حسرت ناک اور آرزومند نگاہیں اِن کے ساتھ ساتھ جاتیں یہاں تک کہ زمیں اُنھیں اپنے دامن میں چھپا لیتی۔

تخت سنگھ کے پاس ایک گائے تھی۔ وہ اب دِن کے دِن اُسے چرایا کرتا۔ اُس کی زندگی کا اب یہی ایک سہارا تھا۔ اُس کے اُپلے اور دودھ بیچ کر گزران کرتا۔ کبھی

بھی فاقے کرنا پڑ جاتے یہ سب مُصیبتیں اُس نے جھیلیں۔ مگر اپنی بینوائی کا رونا رونے کے لئے ایک دن بھی ہیرآمن کے پاس نہ گیا۔ ہیرآمن نے اُسے زیر کرنا چاہا تھا مگر خود زیر ہوگیا۔ جیتنے پر بھی اُسے ہار ہوئی پرانے لوہے کو اپنی کمینہ ضِد کی آنچ سے نہ جُھکا سکا۔

ایک دن ریوتی نے کہا "بیٹا! تم نے غریب کو ستایا اچھا نہ کیا"

ہیرآمن نے تیز ہوکر جواب دیا "وہ غریب نہیں ہے۔ اُس کا گھمنڈ میں توڑ دوں گا"

ثروت کے نشے میں متوالا زمیندار وہ چیز توڑنے کی فکر میں تھا جس کا وجود ہی نہ تھا۔ جیسے بے سمجھ بچّہ اپنی پرچھائیں سے لڑنے لگتا ہے۔

۶

سال بھر تخت سنگھ نے جوں توں کرکے کاٹا پھر برسات آئی اِس کا گھر چھایا نہ گیا تھا۔ کئی دن تک مُوسلا دھار مینھ برسا تو مکان کا ایک حصّہ گر پڑا۔ گائے وہاں بندھی ہوئی تھی دب کر مرگئی۔ تخت سنگھ کے بھی سخت چوٹ آئی۔ اُسی دن سے اُسے بُخار آنا شروع ہوا۔ دوا دارو کون کرتا۔ روزی کا سہارا تھا وہ بھی ٹُوٹا۔ ظالم۔ بیدرد مُصیبت نے کُچل ڈالا سارا مکان پانی سے بھرا ہوا۔ گھر

میں اناج کا ایک دانہ نہیں - اندھیرے میں پڑا ہوا کراہ رہا تھا - کہ ریوتی اُس کے گھر گئی تخت سنگھ نے آنکھیں کھولدیں اور پوچھا کون ہے -

ٹھکرائن - "ریوتی رانی ہیں"

تخت سنگھ "میرے دھن بھاگ - مجھ پر بڑی دیا کی"

ریوتی نے شرمندہ ہوکر کہا "ٹھکرائن - ایشور جانتا ہے میں اپنے بیٹے سے حیران ہوں - تمہیں جو تکلیف ہو مجھ سے کہو - تمہارے اُوپر ایسی آفت پڑگئی اور ہم سے خبر تک نہ کی"

یہ کہکر ریوتی نے روپیوں کی ایک چھوٹی سی پوٹلی ٹھکرائن کے سامنے رکھ دی

رُوپیوں کی جھنکار سُن کر تخت سنگھ اُٹھ بیٹھا اور بولا "رانی ہم اِس کے بُھوکے نہیں ہیں - مرتے دم گنہگار نہ کرو-

دُوسرے دِن ہیرا من بھی اپنے ہوا خواہوں کو لئے اُدھر سے جا نکلا - گِرا ہوا مکان دیکھ کر مُسکرایا - اِس کے دِل نے کہا آخر میں نے اِس کا گھمنڈ توڑ دیا - مکان کے اندر جاکر بولا "ٹھاکر اب کیا حال ہے؟"

ٹھاکر نے آہستہ سے کہا "سب ایشور کی دیا ہے - آپ کیسے بھول پڑے؟"

ہیرامن کو دُوسری بار زک ملی۔ اُس کی یہ آرزُو کہ تخت سنگھ میرے پیروں کو آنکھوں سے چُھوئے اب بھی وہ پُوری نہ ہوئی۔ اُسی رات کو غریب آزاد منش۔ ایماندار۔ بے غرض ٹھاکر اِس دُنیا سے رُخصت ہوگیا۔

۷

بوڑھی ٹھکرائن اب دُنیا میں اکیلی تھی۔ کوئی اُس کے غم کا شریک اور اُس کے مرنے پر آنسو بہانے والا نہ تھا۔ بینوائی اور بے مایگی نے غم کی آنچ اور تیز کردی تھی۔ سامانِ فراغت موت کے زخم کو گو بھر نہ سکیں۔ مگر مرہم کا کام ضرور دیتے ہیں۔

فکرِ معاش بُری بلا ہے۔ ٹھکرائن اب کھیت اور چراگاہ سے گوبر چُن لاتی اور اُپلے بنا کر بیچتی اُسے لاٹھی ٹیکتے ہوئے کھیتوں کو جاتے اور گوبر کا ٹوکرا سر پہ رکھ کر بوجھ سے ہانپتے ہوئے آتے دیکھنا سخت دردناک تھا۔ یہاں تک کہ ہیرامن کو بھی اُس پر ترس آگیا۔ ایک دن اُنھوں نے آٹا دال چاول تھالیوں میں رکھ کر اُس پاس بھیجا ریوتی خود لے کر گئی۔ مگر بوڑھی ٹھکرائن آنکھوں میں آنسو بھر کر بولی۔ "ریوتی جب تک آنکھوں سے سُوجھتا ہے اور ہاتھ پیر چلتے ہیں مجھے اور مرنے والے کو گنہگار نہ کرو"

اُس دن سے ہیرامن کو پھر اُس کے ساتھ عملی ہمدردی کرنے کی جرأت نہ ہوئی۔

ایک دن ریوتی نے ٹھکرائن سے اُپلے مول لئے گانوں میں پیسے کے تیس اُپلے بکتے تھے۔ اُس نے چاہا کہ اِس سے بیس ہی اُپلے لوں اُس بِنا، سے ٹھکرائن نے اُس کے یہاں اُپلے لانا بند کر دیا۔

ایسی دیویاں دُنیا میں کتنی ہیں۔ کیا وہ اتنا نہ جانتی تھی کہ ایک رازِ سربستہ زبان پر لا کر میں اپنی جانکاہیوں کا خاتمہ کر سکتی ہوں، مگر پھر وہ احسان کا بدلہ نہ ہو جائے گا۔ مثل مشہور ہے "نیکی کر اور دریا میں ڈال" شاید اِس کے دِل میں کبھی یہ خیال ہی نہیں آیا کہ میں نے ریوتی پر کوئی احسان کیا ہے۔

یہ وضعدار آن پر مرنے والی عورت شوہر کے مرنے کے بعد تین سال تک زندہ رہی۔ یہ زمانہ اُس نے جس تکلیف سے کاٹا اُسے یاد کر کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ کئی کئی دِن فاقے سے گذر جاتے کبھی گوبر نہ ملتا۔ کبھی کوئی اُپلے چُرا لیجاتا۔ ایشور کی مرضی! کسی کا گھر بھرا ہوا ہے کھانے والے نہیں۔ کوئی یوں رو رو کر زندگی کاٹتا ہے۔ بڑھیا نے یہ سب دُکھ جھیلا۔ مگر کبھی کسی کے سامنے

ہاتھ نہیں پھیلایا۔

۸

ہیرا من کی بیسویں سال گرہ آئی۔ ڈھول کی سہانی آواز سنائی دینے لگی۔ ایک طرف گھی کی پوریاں پک رہی تھیں۔ دوسری طرف تیل کی۔ گھی کی موٹے معزز برہمنوں کے لئے تیل کی غریب فاقہ کش نیچوں کے لئے۔

یکایک ایک عورت نے ریوتی سے آکر کہا "ٹھکرائن جانے کیسی ہوئی جاتی ہیں۔ تمھیں بلا رہی ہیں"

ریوتی نے دل میں کہا ایشور آج تو خیریت سے کاٹنا کہیں بڑھیا مر نہ رہی ہو۔ یہ سوچ کر وہ بڑھیا کے پاس نہ گئی۔ ہیرا من نے جب دیکھا اماں نہیں جانا چاہتیں تو خود چلا۔ ٹھکرائن پر اسے کچھ دنوں سے رحم آنے لگا تھا مگر ریوتی مکان کے دروازے تک اسے منع کرنے آئی یہ رحم دل۔ نیک مزاج شریف ریوتی تھی۔

ہیرا من ٹھکرائن کے مکان پر پہنچا تو وہاں بالکل سناٹا چھایا ہوا تھا۔ بوڑھی عورت کا چہرہ زرد تھا اور جاں کندنی کی حالت طاری تھی۔ ہیرا من نے زور سے کہا۔ ٹھکرائن! میں ہوں ہیرا من۔"

ٹھکرائن نے آنکھیں کھولیں اور اشارے سے اسے اپنا

سر نزدیک لانے کو کہا ۔ پھر رُک رُک کر بولی میرے سرہانے پٹاری میں ٹھاکر کی ہڈیاں رکھی ہوئی ہیں میرے سُہاگ کا سیندُور بھی وہیں ہے یہ دونوں پراگ راج بھیج دینا ۔ یہ کہہ کر اُس نے آنکھیں بند کرلیں ۔ ہیرامن نے پٹاری کھولی تو دونوں چیزیں بحفاظت رکھی ہوئی تھیں ۔ ایک پوٹلی میں دس روپے بھی رکھے ہوئے ملے ۔ یہ شاید جانے والے کا زاد راہ تھا ۔

رات کو ٹھکرائن کی تکلیفوں کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ ہوگیا

اُسی رات کو ریوتی نے خواب دیکھا ساون کا میلا ہے گھٹائیں چھائی ہوئی ہیں ۔ میں کیرت ساگر کے کنارے کھڑی ہوں ۔ اتنے میں ہیرامن پانی میں پھسل پڑا ۔ میں چھاتی پیٹ پیٹ کر رونے لگی ۔ دفعتہً ایک بُوڑھا آدمی پانی میں کُودا اور ہیرامن کو نکال لایا ۔ ریوتی اُس کے پیروں پر گر پڑی اور بولی ”آپ کون ہیں ؟“

اُس نے جواب دیا ”میں سری پور میں رہتا ہوں میرا نام تخت سنگھ ہے ۔“

سری پور اب بھی ہیرامن کے قبضے میں ہے ۔ مگر اب اُس کی رونق دو چند ہوگئی ہے وہاں جاؤ تو دُور سے شوالے کا سُنہرا کلس دکھائی دینے لگتا ہے ۔ جس جگہ تخت سنگھ کا

مکان تھا وہاں یہ شوالہ بنا ہوا ہے - اُس کے سامنے ایک پختہ کنواں اور پختہ دھرم سالہ ہے - مسافر یہاں ٹھہرتے ہیں اور تخت سنگھ کا جس گاتے ہیں یہ شوالہ اور دھرم سالہ دونوں اُسی کے نام سے مشہور ہیں -

مہیش داس راجہ بیربر

اِن کا نام اکبر کے ساتھ اِسی طرح آتا ہے - جیسے سکندر کے ساتھ ارسطو کا نام - لیکن جب اِن کی شہرت کو دیکھ کر حالات پر نظر کرو - تو معلوم ہوتا ہے - کہ اقبال ارسطو سے بہت زیادہ لائے تھے - اصل کو دیکھو تو بھاٹ تھے - علم و فضل کو خود ہی سمجھ لو کہ بھاٹ کیا اور اُس کے علم و فضل کی بساط کیا - کتاب تو بالائے طاق رہی - آج تک ایسا اشلوک نہیں دیکھا - جو گنوان پنڈتوں کی سبھا میں فخر کی آواز سے پڑھا جائے - ایک دُہرا نہ سُنا کہ دوستوں میں دُہرایا جائے - لیاقت کو دیکھو تو ٹوڈرمل کجا اور یہ کجا - مہمات اور فتوحات کو دیکھو تو کسی میدان میں تیغ کو نہیں چھوا - اُس پر یہ عالم ہے - کہ سارے اکبری نورتنوں میں ایک دانہ بھی اُن کے قدر و قربت سے لگا

نہیں کھاتا۔

بعض مؤرخ لکھتے ہیں۔ کہ اصلی نام مہیش داس تھا۔ قوم برہمن۔ اور اکثر کہتے ہیں۔ کہ بھاٹ تھے۔ برہیّہ تخلّص کرتے تھے۔ مُلّا صاحب بھاٹ کے ساتھ برہمداس نام لکھتے ہیں۔ کالپی وطن تھا۔ اوّل رامچندر بھٹ کی سرکار میں نوکر تھے۔ جس طرح اور بھاٹ شہروں میں پھرتے ہیں۔ اِسی طرح یہ بھی پھرا کرتے تھے۔ اور اِسی طرح کے کبت کہا کرتے تھے۔

ابتدائے جلوس میں کہیں اکبر سے مِل گئے تھے۔ قسمت کی بات تھی۔ خدا جانے کیا بات بادشاہ کو بھا گئی۔ باتوں ہی باتوں میں کچھ سے کچھ ہو گئے۔

بیشک قُربت اور مُصاحبت کی حیثیت سے کوئی عالیجاہ امیر اور جلیلُ القدر سردار اُن کے رتبے کو نہیں پہنچتا۔ لیکن تاریخِ سلطنت کے سِلسلے میں جو تعلّق اُنھیں ہے۔ وہ نہایت تھوڑا نظر آتا ہے۔

[ذرا دیکھنا۔ مُلّا صاحب اِن کا حال کس طرح لکھتے ہیں] ۹۸۰ھ میں نگرکوٹ حُسین قلی خاں کی تلوار پر فتح ہوا۔ شرح اِس قِصّے کی مُجملاً یہ ہے۔ کہ بادشاہ کو لڑکپن سے برہمنوں بھاٹوں اور اقسامِ طوائفِ ہنود کی طرف

میلانِ خاطر اور التفاتِ خاص تھا۔ اوائل جلوس میں ایک برہمن بھاٹ منگتا برہم داس نام کالپی کا رہنے والا کہ ہنود کے گن گانے اُس کا پیشہ تھا۔ لیکن بڑا سُرتا اور سیانا تھا اُس نے مُلازمت میں آکر تقرّب و ہم زبانی کی بدولت مزاج میں دخل پیدا کیا۔ اور ترقّی کرتے کرتے منصبِ عالی کو پہنچ کر یہ عالم ہوا۔ ع

من تو شُدم تو من شُدی من تن شُدم تو جاں شُدی

اوّل کب رائے (کوئی کبت کہنے والا۔ کب رائے کبت کہنے والوں کا راجہ۔ گویا مَلکُ الشُّعرا) راجہ بیربر خطاب ہوا۔

بُنیاد اِس مُہم کی یہ تھی کہ بادشاہ نے کسی بات پر ناراض ہوکر کانگڑے کی فتح کا حُکم دیا۔ اور راجہ بیربر بناکر ملکِ مذکور اِن کے نام کردیا۔ حُسین قُلی خاں کو فرمان بھیجا۔ کہ کانگڑے پر قبضہ کرکے راجہ بیربر کی جاگیر کردو۔ مصلحت اِس میں یہی ہوگی۔ کہ ہندوؤں کا مقدّس مقام ہے۔ برہمن کا نام درمیان رہے۔ حُسین قلی خاں نے اُمرائے پنجاب کو جمع کیا۔ لشکر اور توپ خانے فراہم کئے۔ قلعہ کُشائی اور پہاڑ کی چڑھائی کے سامان ساتھ لئے۔ راجہ جی کو نشان کا ہاتھی بناکر آگے رکھا اور روانہ ہوا۔

سپہ سالار جس عرق ریزی سے گھاٹیوں میں اُترا۔ اور چڑھائیوں پر چڑھا۔ اُس کے بیان میں مؤرّخوں کے قلم لنگڑے ہوتے ہیں۔ غرض کہیں لڑائی۔ کہیں رسائی سے کانگڑے پر جا پہنچا۔ آزاد۔ ایسی محنت و جانکاہی کے مقاموں میں راجہ جی کیا کرتے ہوں گے؟ چباتے اور نگل جاتے ہوں گے۔ سہراپ کے گھوڑے دوڑاتے پھرتے ہوں گے۔ قلیوں اور مزدوروں کو گالیاں دیتے ہوں گے۔ اور ہنسی ہنسی میں کام نکالتے ہوں گے۔ کانگڑے کا محاصرہ بڑی سختی کے ساتھ ہوا۔ اِس فوج میں کیا ہندو کیا مسلمان سب ہی شامل تھے۔ دھاوے کے جوش میں جو سختیاں ہوئیں۔ اِس میں راجہ جی بدنام بہت ہوئے۔ چونکہ پنجاب پر ابراہیم مرزا باغی ہوکر چڑھ آیا تھا۔ اِس لئے حسین قلی خاں نے صلح کر کے محاصرہ اُٹھایا۔ راجہ کانگڑہ نے بھی غنیمت سمجھا۔ اِس لئے جو شرطیں پیش کیں۔ خوشی سے منظور کیں — چوتھی شرط پر سپہ سالار نے کہا کہ حضور سے یہ ولایت راجہ بیربر کو مرحمت ہوئی تھی۔ اُن کے لئے کچھ خاطر خواہ ہونا چاہئے۔ یہ بھی منظور ہوا اور جو کچھ ہوا۔ اتنا ہوا۔ جس میں ترازو کی تول فقط پانچ من سونا بوزنِ

اکبری رکھا گیا۔ اور ہزاروں روپے کے عجائب و نفائس بادشاہ کے لئے۔ بیربر جی کو اور جھگڑوں سے کیا غرض تھی۔ اپنی دکشنا لے لی اور گھوڑے پر چڑھ کر ہوا ہوئے۔ اکبر گجرات احمدآباد کی طرف مارا مار کوچ کو تیار تھا اُسے سلام کیا اور اسیسیں دیتے لشکر میں شامل ہوگئے۔

اواخرِ ۹۸۰ھ میں راجہ بیربر نے ضیافت کے لئے عرض کیا۔ اور بادشاہ منظور فرما کر اُن کے گھر گئے۔ وہی چیزیں جو کبھی عنایت کی تھیں۔ حاضر کیں۔ نقد کو نثار کیا۔ باقی پیشکش کر دیا اور سر جھکا کر کھڑے ہوگئے۔

آزاد۔ صورتِ حال کچھ اور ہوگی۔ عجب نہیں کہ اہلِ دربار اور اہلِ خلوت نے اُن پر تقاضے شروع کئے ہوں۔ کہ سب اُمرا حضور کی ضیافت کرتے ہیں۔ تم کیوں نہیں کرتے ہو۔ لیکن ظاہر ہے کہ اُمرا لڑائیوں پر جاتے تھے۔ مُلک مارتے تھے۔ حکومتیں کرتے تھے۔ دولتیں کماتے تھے۔ انعام و اکرام بھی پاتے تھے۔ وہ بادشاہ کی ضیافتیں کرتے تھے۔ تو شاہانہ جاہ و جلال سے گھر سجاتے تھے۔ جس کی ادنیٰ بات یہ کہ سوا لاکھ روپے کا چبوترہ باندھتے تھے۔ مخمل و زربفت و کمخواب

راہ میں پا انداز بچھاتے تھے۔ جب قریب پہنچتے تھے۔ تو سونے چاندی کے پھول برساتے تھے دروازے پر پہنچتے تھے۔ تو موتی طبق کے طبق نچھاور کرتے تھے۔ لاکھوں روپے کے تحائف جن میں لعل جواہر۔ شالیں مخمل ہائے زربفت۔ اسلحۂ گراں بہا۔ لونڈیاں حسین۔ غُلام صاحبِ جمال۔ ہاتھی گھوڑے کہاں تک تفصیل لکھوں خُلاصہ یہ کہ۔ جو کماتے تھے۔ سو لٹاتے تھے۔ راجہ بیر بر کے لئے یہ رستے بند تھے۔ اُنھوں نے مُنہ سے کچھ نہ کہا۔ جو کچھ اُنھوں نے دیا تھا۔ وہی اُن کے سامنے رکھ کر کھڑے ہوگئے۔ مگر وہ شرمانے والے نہ تھے۔ کچھ نہ کچھ کہا بھی ہوگا۔ وہ تو حاضر جوابی کی پھلجھڑی تھے۔ آزاد ہوتا تو اتنا ضرور کہتا۔ کہ عطائے شُما بہ لقائے شُما

ہرچہ زیشاں میرسد آخر بدیشاں میرسد

بیر بر دربار سے لے کر محل تک ہر جگہ ہر وقت رہے ہوئے تھے۔ اور اپنی دانائی اور مزاج شناسی کی حِکمت سے ہر بات پر حسبِ مُراد حُکم حاصل کرتے تھے۔ اِسی واسطے راجہ اور مہا راجہ اُمرا اور خوانین لاکھوں روپے کے تحفے بھیجتے تھے۔ بادشاہ بھی اکثر راجاؤں کے پاس انھیں سفیر کرکے بھیجتے تھے۔ یہ نہایت زیرک اور دانا

تھے۔ کچھ تو قومی قربت سے کچھ منصبِ سفارت سے۔ کچھ
اپنے چٹکلوں اور لطیفوں سے وہاں بھی جا کر گھل مل
جاتے تھے۔ اور وہ کام نکال لاتے تھے۔ کہ لشکروں
سے نہ نکلتے تھے۔ ۹۸۴ھ میں بادشاہ نے رائے لون
کرن کے ساتھ راجہ ڈونگرپور کے پاس بھیجا۔ راجہ اپنی
بیٹی کو حرم سرائے اکبری میں داخل کیا چاہتا تھا۔ مگر
بعض باتوں سے رکا ہوا تھا۔ اُنھوں نے جاتے ہی
ایسا منتر مارا۔ کہ سب سوچ بچار بھلا دیئے۔ ہنستے کھیلتے
مبارک سلامت کرتے سواری لے آئے۔

۹۹۱ھ میں زین خاں کوکہ کے ساتھ راجہ رام
چندر کے دربار میں گئے۔ بیربھدر اُس کا بیٹا آنے میں
اندیشہ کرتا تھا۔ اُنھوں نے اُسے بھی باتوں میں لبھا لیا۔
اِسی طرح وغیرہ وغیرہ۔

اِسی سنہ میں راجہ بیربر پر سے بڑی کل بَل ٹلی۔
اکبر نگر چِین کے میدان میں چوگان بازی کر رہے تھے۔
راجہ جی کو گھوڑے نے پھینک دیا۔ خدا جانے صدمے سے
بیہوش ہو گئے۔ یا مسخراپن سے دم چرا گئے۔ پچکارا پچکارا
بڑی محبت سے سر سہلایا۔ اور اُٹھوا کر گھر بھجوایا۔

اِسی سنہ میں ایک دِن میدانِ چوگان بازی

میں بادشاہ ہاتھیوں کی لڑائی کا تماشا دیکھ رہے تھے۔ کہ ادھر تماشا ہو گیا۔ وہ بچاچر ہاتھی سرشوری اور بدمزاجی میں مشہور تھا۔ کہ یکایک دو پیادوں پر دوڑ پڑا۔ وہ بھاگے وہ بچاچر اُن کے پیچھے بھاگا جاتا تھا۔ کہ بیربر سامنے آگئے۔ اُنھیں چھوڑ کر اِن پر جھپٹا۔ راجہ جی بھی بھاگنے کے اوسان بھی نہ رہے۔ بدن کے لدّھڑ۔ عجب عالم ہوا اور انبوہِ خلائق میں غُل اُٹھا۔ اکبر گھوڑا مار کر خود بیچ میں آگئے۔ راجہ جی تو گرتے پڑتے۔ ہانپتے کانپتے بھاگ گئے۔ ہاتھی چند قدم بادشاہ کے پیچھے آ کر تھم گیا۔ واہ رے اکبر تیرا اقبال!

سواد اور باجوڑ کا علاقہ ایک وسیع مُلک پشاور کے مغرب میں ہے۔ اُس کی خاک ہندوستان کی طرح زرخیز اور بار آور ہے۔ اور آب و ہوا کا اعتدال اور موسم کی سردی اِس پر اضافہ۔ شمال میں سلسلۂ ہندو کش۔ مغرب میں کوہِ سُلیمان کا زنجیرہ۔ جنوب میں خیبر کی پہاڑیاں ہیں۔ کہ دریائے سندھ تک پھیلی ہوئی ہیں۔ یہ علاقہ بھی ایک حصّہ افغانستان کا ہے۔ یہاں کے تناور اور دلاور افغان بردرانی کہلاتے ہیں۔ مُلک کی جبلت نے انھیں سرشور اور سینہ زور بنا کر اپنی قوموں میں

ممتاز کیا ہے - اور ہندوکش کی برفانی چوٹیوں تک چڑھا دیا ہے - علاقۂ مذکور میں تیس تیس چالیس چالیس میل کے میدان یا وادی ہیں - اور ہر میدان میں سے پہاڑوں کو چیر کر درّے نکلتے ہیں - یہ اور میدانوں اور وادیوں سے ملتے ہیں - کہ ہوا کی لطافت - زمین کی سبزی - پانی کی روانی میں کشمیر کو جواب دیتی ہیں - یہ وادیاں یا تو درّوں پر ختم ہوتی ہیں - جن کے گرد اونچے اونچے پہاڑ ہیں - یا گھنے گھنے جنگلوں میں جاکر غائب ہوجاتی ہیں - ایسا ملک حملہ آوروں کے لئے سخت دشوار گزار ہوتا ہے - مگر وہاں کے لوگوں کے لئے کچھ بات ہی نہیں - چڑھائی اترائی کے مشّاق ہیں - رستے جانتے ہیں - جھٹ ایک وادی سے دوسری وادی میں جا نکلتے ہیں - کہ جہاں ناواقف آدمی دنوں بلکہ ہفتوں تک پہاڑوں میں ٹکراتا پھرے -

اگرچہ وہاں کے افغان سرشوری اور راہزنی کو اپنا جوہرِ قومی سمجھتے ہیں - لیکن ایک حکمتی شخص نے پیری کا پردہ تان کر اپنا نام پیرِ روشنائی رکھا اور خیلہاے مذکورہ سے بہت جاہلوں کو فراہم کرلیا - کوہستان مذکور جس کا ایک ایک قطعہ قدرتی قلعہ ہے - ان کے لئے پناہ ہوگیا - وہ

کنارِ اٹک سے لے کر پشاور اور کابل تک رستہ مارتے تھے۔ اور لوٹ مار سے آبادیوں کو ویران کرتے تھے۔ بادشاہی حاکم فوجیں لے کر دوڑتے تو وہ سینہ زوری سے سر توڑ مقابلہ کرتے۔ اور دبتے تو اپنے پہاڑوں میں گھس جاتے۔ اِدھر یہ لوگ پھرے۔ اُدھر سے وہ پھر نکلے اور پیچھا مار کر فتح کو شکست کر دیا۔ ۹۹۳ھ میں اکبر نے چاہا کہ اُن کی سخت گردنوں کو توڑ ڈالے۔ اور ملک کا پورا بندوبست کرے۔ زین خاں کوکلتاش کو چند امرا کے ساتھ فوجیں دے کر روانہ کیا۔ وہ لشکرِ شاہی اور سامانِ کوہ کشائی اور رسد کے رستے کر کے ملک میں داخل ہوا۔ پہلے باجوڑ پر ہاتھ ڈالا۔

میرے دوستو! یہ کوہستان ایسا بے ڈھنگا ہے۔ کہ جن لوگوں نے اُدھر کے سفر کئے ہیں۔ وہی وہاں کی مشکلوں کو جانتے ہیں۔ ناواقفوں کی سمجھ میں نہیں آتا۔ جب پہاڑ میں داخل ہوتے ہیں۔ تو پہلے زمین تھوڑی تھوڑی چڑھتی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ پھر دُور سے ابر سا معلوم ہوتا ہے۔ کہ ہمارے سامنے دائیں سے بائیں تک برابر چھایا ہوا ہے۔ اور اُٹھتا چلا آتا ہے۔ جوں جوں آگے بڑھتے چلے جاؤ۔ چھوٹے چھوٹے ٹیلوں کی قطاریں نمودار ہوتی ہیں

اُن کے بیچ میں سے گھس کر آگے بڑھے۔ تو اُن سے اُونچی اُونچی پہاڑیاں شروع ہوئیں۔ ایک قطار کو لانگھا۔ تھوڑی دور چڑھتا ہوا میدان اور پھر وہی قطار آگئی۔ یا تو دو پہاڑ بیچ میں سے پھٹے ہوئے ہیں (درہ) اِن کے بیچ میں سے نکلنا پڑتا ہے۔ یا کسی پہاڑ کی کمر پر سے چڑھتے ہوئے اُوپر ہوکر پار اُتر گئے۔ چڑھائی اور اُترائی ہیں۔ اور پہاڑ کی دھاروں پر۔ دونوں طرف گہرے گہرے گڑھے نظر آتے ہیں۔ کہ دیکھنے کو دل نہیں چاہتا۔ ذرا پاؤں بہکا اور گیا۔ پھر تحت الثریٰ سے ورے ٹھکانا نہیں۔ کہیں میدان آیا کہیں کوسوں [illegible] طرح چڑھے تھے۔ اُسی طرح اُترنا پڑا۔ کہیں برابر چڑھتے گئے۔ رستے میں جا بجا دائیں بائیں درّے آتے ہیں۔ کہیں اور طرف کو رستہ جاتا ہے۔ اور اُن درّوں کے اندر کوسوں تک برابر خلقِ خدا کی بستی ہے۔ جن کا کسی کو حال معلوم نہیں۔ کہیں دو پہاڑوں کے بیچ میں کوسوں تک گلی گلی چلے جاتے ہیں۔ غرض سرابالا (چڑھائی) سراشیب (اُترائی) کمرِ کوہ (چڑھائی کے بیچ میں جو پہاڑ کے پہلو بہ پہلو راہ ہو) گریبانِ کوہ (پہاڑ میں شگاف ہو) تنگیِ کوہ دو پہاڑوں

کے بیچ میں جو نکلی جاتی ہو، تیزیِ کوہ (پہاڑ کی دھار پر جو رستہ چلتا ہو) دامنِ کوہ (پہاڑ کے آتار یا نشیب) ان الفاظ کے معنے وہاں جاکر کھل سکتے ہیں۔ گھر میں بیٹھے تصور کریں تو سمجھ میں نہیں آسکتے۔

یہ تمام پہاڑ بڑے اور چھوٹے چھوٹے درختوں سے چھائے ہوئے ہیں۔ دائیں بائیں پانی کے چشمے اوپر سے اترتے ہیں۔ زمین پر کہیں مہین مہین اور کہیں نہر ہوکر بہتے ہیں یا کہیں دو پہاڑیوں کے بیچ میں ہوکر بہتے ہیں۔ پل یا کشتی بغیر پار اترنا مشکل ہے۔ اور چونکہ پانی بلندی سے گرتا آتا ہے اور پتھروں میں ٹکراتا ہوا بہتا ہے۔ اس لئے اس زور سے بہتا ہے کہ پایاب گزرنا ممکن نہیں۔ گھوڑا ہمت کرے۔ تو پتھروں پر سے پاؤں پھسلتے ہیں۔ ایسے بے ڈھنگے رستوں میں اور تمام دائیں بائیں دروں میں۔ اور دامانِ کوہستان میں افغان آباد ہوتے ہیں۔ دُنبوں اور اونٹوں کی پشم سے کمل۔ نمدے۔ شطرنجیاں اور ٹاٹ بُنتے ہیں۔ ان کی چھوٹی چھوٹی تمبوٹیاں کھڑی کر لیتے ہیں۔ دامنِ کوہ میں کوٹھے کوٹھریاں ڈال لیتے ہیں۔ وہیں کھیتی کرتے ہیں۔ جنگلوں کے سیب۔ بہی۔ ناشپاتی۔ اور انگور ان کے قدرتی باغ ہیں۔ وہی کھاتے ہیں اور مزے سے جیتے

ہیں۔ جب کوئی بیرونی دشمن حملہ کرتا ہے۔ تو سامنے ہوکر مقابلہ کرتے ہیں۔ ایک اونچی پہاڑی پر چڑھ کر نقّارہ بجاتے ہیں۔ جہاں جہاں تک آواز پہنچی۔ ہر شخص کو پہنچنا واجب ہے۔ دو دو تین تین وقت کا کھانا۔ کچھ روٹیاں کچھ آٹے گھر سے باندھے۔ ہتھیار لگائے اور آن موجود ہوئے۔ جب وہ ٹڈّی دَل سامنے پہاڑیوں پر چھایا ہوا نظر آتا ہے تو بادشاہی لشکر جو میدان کے لڑنے والے ہیں۔ دیکھ کر حیران ہو جاتے ہیں۔ اور جب خیال آتا ہے۔ کہ کتنے اور کیسے پہاڑ ہم طے کرکے یہاں تک آئے ہیں۔ پیچھے تو وہ رہے اور آگے یہ بلا۔ نہ زمین کے نہ آسمان کے۔ اُس وقت خُدا یاد آتا ہے۔

جس وقت مقابلہ ہوتا ہے۔ تو افغان نہایت بہادری سے لڑتے ہیں۔ جب دھاوا کرتے ہیں۔ تو توپوں پر آن پڑتے ہیں۔ لیکن بادشاہی لشکروں کے سامنے تھم نہیں سکتے۔ جب دبتے ہیں تو پہاڑوں پر چڑھ جاتے ہیں۔ اور دائیں بائیں کے درّوں میں گھس جاتے ہیں۔ وہ قوی ہیکل اور طاقت مند ہوتے ہیں۔ دیس کے لوگوں کو فقط اونچی زمین پر چڑھنا ہی ایک مصیبت نظر آتی ہے۔ اُن کا یہ عالم ہے۔ کہ زمین یا

دِل و جگر میں گولی یا تیر لگ گیا تو گر پڑے ۔ بازو ران ہاتھ پاؤں میں لگے تو خاطر میں بھی نہیں لاتے ۔ بندر کی طرح درختوں میں گھستے ۔ پہاڑوں پر چڑھتے چلے جاتے ہیں ۔ اِس عالم میں گولی لگی ۔ بہت ہوا تو ہاتھ مارا ۔ ذرا کھجا لیا ۔ جیسے بھڑ نے ڈنک مارا ۔ بلکہ مچھر نے کاٹا ۔

بڑی مشکل جو بادشاہی لشکروں کو پیش آتی ہے ۔ وہ یہ ہے کہ جتنا آگے بڑھتے ہیں ۔ نادان جانتے ہیں ۔ کہ میدان سامنے کھلا ۔ اور حقیقت میں موت کے مُنہ میں گھستے جاتے ہیں ۔ وہ افغان جو سامنے ہٹ کر آگے بھاگ گئے تھے ۔ یا دائیں بائیں درّوں میں گھس گئے تھے ۔ پہاڑیوں کے نیچے جاکر اُوپر چڑھ آتے ہیں ۔ اور درّوں کے اندر کی مخلوق بھی آن پہنچتی ہے ۔ اُوپر سے گولیاں اور تیر برساتے ہیں ۔ ورنہ پتھر ۔ اور حقیقت تو یہ ہے کہ ایسے موقع پر جہاں فوج سمجھ چکی تھی ۔ کہ میدان صاف کرکے آگے بڑھے ہیں ۔ اُن کا فقط غل مچانا کافی ہوتا ہے ۔ اور سامنے کی لڑائی تو کہیں گئی ہی نہیں ۔ وہ میدان تو ہر وقت تیار ہے ۔ جب تک کمر میں آٹا بندھا ہے ۔ لڑ رہے ہیں ہو چکا گھروں کو بھاگ گئے ۔ کچھ رہ گئے ۔ کچھ اور کھانا باندھ لائے ۔ کچھ اور نئے آن شامل ہوئے ۔ غرض بادشاہی

لشکر جتنا آگے بڑھے - اور پچھلی مسافت زیادہ ہو - اتنا ہی رسد کا رستہ بند ہوتا جاتا ہے - اور وہ بند ہوا تو سمجھ لو کہ خبر بند - رسد بند - گویا سب کام بند -

زین خاں نے لڑائی کی شطرنج بہت اسلوب سے پھیلائی - اور بادشاہ کو لکھا کہ لشکرِ اقبال کے بڑھنے کو کوئی روک نہیں سکتا - افغانوں کے بڈھے بڈھے سردار چادریں گلے میں ڈالکر عفو تقصیر کے لئے حاضر ہو گئے ہیں - لیکن جو مقامات قابلِ احتیاط ہیں - اُن کے لئے اور لشکرِ مرتبہ ہونا چاہئے - اِس وقت بیربر کا جہازِ عمر کہ مرادوں کی ہوا میں بھرا چلا جاتا تھا - دفعتہً گرداب میں ڈوبا دربار میں امرِ تجویز طلب یہ تھا کہ کس امیر کو بھیجنا چاہئے - جو ایسے کڈھب رستوں میں لشکر کو لے جائے - اور پیچیدہ صورتوں کو جو وہاں پیش آئیں - سلیقے کے ساتھ سنبھالے - ابوالفضل نے درخواست کی کہ فدوی کو اجازت ہو" - بیربر نے کہا - غلام - بادشاہ نے قرعہ ڈالا - موت کے فرشتے نے بیربر کا نام سامنے دکھایا - اُس کے چٹکلوں اور لطیفوں سے بادشاہ بہت خوش ہوتے تھے - اور ایک دم بھی جدائی گوارا نہ تھی - لیکن خدا جانے کسی جوتشی نے کہہ دیا یا خود ہی خیال

آگیا کہ یہ مُہم بیربر کے نام فتح ہوگی۔ ہرچند جی نہ چاہتا تھا۔ مگر مجبوراً اِجازت دی۔ اور حُکم دیا کہ خاصے کا توپ خانہ بھی ساتھ چاہیے۔ اندازِ محبت خیال کرو کہ جب رُخصت ہونے لگا۔ تو اُس کے بازو پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ بیربر جلدی آنا۔ جس دِن روانہ ہوا۔ شکار سے پھرتے ہوئے خود اُس کے خیمے میں گئے۔ اور بہت سی نشیب و فراز کی باتیں سمجھائیں۔ یہ فوجِ وافی اور سامانِ کافی کے ساتھ روانہ ہوئے۔ ڈوک کی منزل میں پہنچے تو سامنے ایک تنگی تھی۔ افغان دونوں طرف پہاڑوں پر چڑھ کھڑے ہوئے۔ بیربر تو دُور سے کھڑے غُل مچاتے رہے۔ مگر اور اُمرا زور دے کر بڑھے پہاڑ کے جنگلی بے سروپا وحشی ہوتے ہیں۔ اُن کی حقیقت کیا ہے۔ مگر اُنھوں نے اِس شدت سے اور سختی سے فوجِ شاہی کا سامنا کیا کہ اگرچہ بہت سے افغان مارے گئے۔ مگر بادشاہی فوج بھی بہت سی بھاری چوٹیں کھا کر ہٹی اور چونکہ دن کم رہ گیا تھا۔ واجب ہوا کہ دشت کو اُلٹے پھر آئیں۔

بادشاہ بھی سمجھتے تھے کہ مسخرے بھاٹ سے کیا ہوتا ہے۔ کچھ عرصے کے بعد حکیم ابوالفتح کو بھی فوج دے کر

روانہ کیا تھا۔ کہ دشت میں پہنچ کر وہاں کی فوج کو لینا۔ اور کوہِ ملکند کی گھاٹی سے نکل کر زین خاں کے لشکر میں جا مِلنا۔ زین خاں اگرچہ ہندوستان کی ہوا میں سرسبز ہوا تھا۔ لیکن سپاہی زادہ تھا۔ اُس کے باپ دادا اُسی خاک سے اُٹھے تھے۔ اور اُسی خاک میں تلواریں مارتے اور کھاتے دُنیا سے گئے تھے۔ وہ جب مُلکِ باجوڑ میں پہنچا تو جاتے ہی چاروں طرف لڑائی پھیلادی۔ ایسے دھاوے کئے۔ کہ پہاڑ میں بھونچال ڈال دیا۔ ہزاروں افغان قتل کئے۔ اور قبیلے کے قبیلے گھیر لئے۔ بال بچے قید کر لئے۔ اور ایسا تنگ کیا کہ اُن کے ملک اور سردار طنابیں گلے میں ڈال ڈال کر آئے کہ اطاعت کے لئے حاضر ہوئے ہیں۔

زین خاں اب ولایت سواد کی طرف متوجّہ ہوا۔ افغان سامنے کے ٹیلوں اور پہاڑیوں سے ٹِڈّیوں کی طرح اُمنڈ کر دوڑے۔ اور گولیاں اور پتّھر اولوں کی طرح برسانے شروع کئے۔ ہراوّل کو ہٹنا پڑا مگر مقدّمے کی فوج نے ہمّت کی کہ ڈھالیں مُنہ پر لیں۔ اور تلواریں سُونت لیں۔ غرض جس طرح ہوا تنگی سے نکل گئی۔ انھیں دیکھ کر اوروں کے دِلوں میں بھی ہمّت کا جوش سرسرایا۔ غرض

کہ جس طرح ہوا فوج اُوپر چڑھ گئی اور افغان بھاگ کر سامنے کے پہاڑ پر چڑھ گئے۔ زین خاں اُوپر جا کر پھیلا۔ چکدرے میں چھاؤنی ڈال کر گرد مورچے تیار کئے۔ اور قلعہ باندھ لیا۔ چونکہ چکدرہ ولایتِ مذکور کا بیچوں بیچ مقام ہے اور یہاں سے ہر طرف زور پہنچ سکتا ہے۔ اِس لئے سامنے کراکر کا پہاڑ اور بنیر کا عِلاقہ رہ گیا باقی سب ضلع قبضے میں آگیا۔

اِسی عرصے میں راجہ بیربر اور حکیم بھی آگے پیچھے پہنچے۔ اگرچہ راجہ کی اور زین خاں کی پہلے سے چشمک تھی۔ لیکن جب اِن کے آنے کی خبر پہنچی تو حوصلۂ سپہ سالاری کو کام میں لایا۔ اِستقبال کرکے آیا۔ اور رستے ہی میں اِن سے آکر مِلا۔ صفائی اور گرم جوشی سے باتیں کیں۔ پھر آگے بڑھ گیا اور لشکر کے عُبور اور اِنتظامِ راہ میں مصروف رہا۔ وہ دن بھر کھڑا رہا۔ تمام فوجوں اور بھیر اور بار برداریوں کو اُن برف پوش پہاڑوں سے اُتارا اور آپ وہیں اُتر پڑا۔ رات اُسی جگہ گذاری کہ پٹھان پیچھے نہ آن پڑیں۔ حکیم فوج لے کر پہلے قلعۂ چکدرہ پر دوڑ گئے۔ صبح کو قلعے پر سب شامل ہوئے۔ کوکلتاش نے وہاں جشن کیا۔ اِن لوگوں کو

اپنا مہمان قرار دے کر بہت خاطر داری کی ۔ اور مہمانی کے بڑے بڑے سامان کرکے اپنے خیموں پر بلایا ۔ کہ تجویزوں پر اتفاق رائے ہوجائے ۔ اِس مقام پر راجہ پھوٹ بہے ۔ بہت سی شکایتیں کیں ۔ اور کہا کہ بادشاہی توپ خانہ ہمارے ساتھ ہے ۔ بندگانِ دولت کو چاہیئے تھا ۔ کہ اِس کے گرد آکر جمع ہوتے اور یہاں صلاح مشورے کی گفتگو ہوتی ؛

اگرچہ مُناسب یہ تھا کہ کوکلتاش کی سپہ سالاری کے لحاظ سے راجہ بیربر توپ خانہ اُس کے حوالے کردیتے اور سب اِس کے پاس جمع ہوتے ۔ لیکن پھر بھی زین خاں بے تکلّف چلا آیا ۔ اور سب سردار بھی اُس کے ساتھ چلے آئے ۔ البتہ ناگوار گذرا ۔ بدترین اِتّفاق یہ کہ حکیم اور راجہ کی بھی صفائی نہ تھی ۔ یہاں حکیم اور راجہ میں گفتگو بڑھ گئی اور راجہ نے گالیوں تک نوبت پہنچادی ۔ کوکلتاش کے حوصلے کو آفریں ہے ۔ کہ بھڑکتی آگ کو دبایا اور صلاحیت و صفائی کے ساتھ صحبت طے ہوگئی ۔

لیکن تینوں سرداروں میں اِختلاف ہی رہا ۔ بلکہ روز بروز عداوت اور نفاق بڑھتا گیا ۔ ایک کی بات کو ایک نہ مانتا تھا ۔ ہر شخص یہی کہتا تھا ۔ کہ جو میں کہوں

سب اِسی طرح کریں"۔

زین خاں سپاہی زادہ تھا۔ سپاہی کی ہڈی تھا۔ خود بچپن سے لڑائیوں ہی میں جوانی تک پہنچا تھا۔ وہ اِس مُلک کے حال سے بھی واقف تھا۔ اور جانتا تھا کہ اِدھر کے لوگوں سے کیوں کر میدان جیت سکتے ہیں۔ **حکیم** نہایت دانشمند تھا۔ مگر دربار کا دلاور تھا۔ نہ کہ ایسے کُڈھب پہاڑوں کا اور پہاڑی وحشیوں کا۔ تدبیریں خوب نکالتا تھا مگر دُور دُور سے۔ اور یہ ظاہر ہے۔ کہ کہنے اور برتنے میں بڑا فرق ہے۔ اِس کے علاوہ اُسے یہ بھی خیال تھا۔ کہ میں بادشاہ کا مُصاحبِ خاص ہوں وہ تو میری صلاح بغیر کام نہیں کرتے۔ یہ ایسے کیا ہیں۔ **بیربر** جس دِن سے لشکر میں شامل ہوئے تھے جنگلوں اور پہاڑوں کو دیکھ دیکھ کر گھبراتے تھے۔ ہر وقت بدمزاج رہتے تھے۔ اور اپنے مُصاحبوں سے کہتے تھے "حکیم کی ہمراہی اور کوکہ کی کوہ تراشی دیکھئے۔ کہاں پہنچاتی ہے"۔ رستے میں بھی جب مُلاقات ہوجاتی تو بُرا بھلا کہتے اور لڑتے۔ **آزاد** اِس کے دو سبب تھے اول تو یہ کہ وہ محلوں کے شیر تھے۔ نہ مردِ شمشیر۔ دُوسرے بادشاہ کے لاڈلے تھے۔ اِنھیں یہ دعویٰ تھا کہ ہم اس جگہ پہنچ سکتے ہیں

جہاں کوئی جا ہی نہیں سکتا۔ ہمیں اِن کے مزاج میں وہ دخل ہے کہ ٹھہری ٹھہرائی صلاح توڑ دیں۔ زین خاں کیا مال ہے اور حکیم کی کیا حقیقت ہے۔ غرض خود پسندیوں نے مہم کو بگاڑ دیا۔

زین خاں کی رائے یہ تھی۔ کہ میری فوج مدت سے لڑ رہی ہے۔ تمھاری فوج میں سے کچھ چکدرے کی چھاؤنی میں رہے اور اطراف کا بندوبست کرتی رہے۔ کچھ میرے ساتھ شامل ہو کر آگے بڑھے یا تم میں سے جس کا جی چاہے آگے بڑھے۔ راجہ اور حکیم دونوں میں سے ایک بھی اس بات پر راضی نہ ہوئے۔ اُنھوں نے کہا "حضور کا حکم یہ ہے کہ انھیں لوٹ مار کر برباد کردو۔ ملک کی تسخیر اور بندوبست بعد کی تدبیریں ہیں۔ ہم سب ایک لشکر ہو کر مارتے دھاڑتے اِدھر سے آتے ہیں۔ دوسری طرف سے نکل کر حضور کی خدمت میں جا حاضر ہوں"۔ زین خاں نے کہا۔ کس محنت و مشقت سے یہ ملک ہاتھ آیا ہے حیف رہے گا کہ مفت چھوڑ دیں۔ اچھا اگر کچھ بھی نہیں کرتے۔ تو یہی کرو کہ جس رستے آئے ہو۔ اُسی رستے پھر کر چلو کہ انتظام پختہ ہو جائے"۔

راجہ تو اپنے گھمنڈ میں تھے۔ اُنھوں نے ایک نہ سنی۔

اور دُوسرے دِن اپنے ہی رستے روانہ ہوئے - ناچار زین خاں بھی اور اور سردارِ لشکر بھی فوج اور سامان ترتیب دے کر پیچھے پیچھے ہو لئے - اور دن بھر میں پانچ کوس پہاڑ کاٹا - دُوسرے دِن کے لئے قرار پایا کہ رستہ سخت ہے - تنگ تنگ گھاٹیاں اور بڑا پہاڑ سامنے ہے اور تیز چڑھائی ہے - بار برداری - بھیر - بُنگاہ سب ہی کا گُذرنا ہے - اِس لئے آدھ کوس پر جاکر منزل کریں - دُوسرے دِن سویرے سے سوار ہوں کہ آرام سے برف پوش پہاڑ کو پائمال کرتے ہوئے سب آتے جائیں اور خاطر جمع سے منزل پر اُتریں - یہی سب کی صلاح ٹھہری تھی کہ تمام اُمرا کو چٹھیاں بٹ گئیں -

نور کے تڑکے دریائے لشکر نے جُنبش کی - ہراول کی فوج نے ایک ٹیلے پر چڑھ کر نشان کا پھریرا دکھایا تھا کہ افغان نمودار ہوئے - اور دفعتہً اُوپر نیچے - دائیں بائیں سے ہجوم کیا - خیر پہاڑوں میں ایسا ہی ہوتا ہے - بادشاہی لشکر نے مقابلہ کیا - اور انھیں مارتے ہٹاتے آگے بڑھ گئے - جب مقامِ مقررہ پر پہنچے تو ہراوُل اور اُس کے ساتھ جو خیمے ڈیرے والے تھے - اُنھوں نے منزل کر دی -

قسمت کی گردش دیکھو! بیربر کو کسی نے خبر دی تھی کہ "یہاں افغانوں کی طرف سے شبخون کا ڈر ہے۔ چار کوس آگے نکل چلوگے تو پھر کچھ خطر نہیں"۔ یہ منزل پر نہ اُترے آگے بڑھتے چلے گئے۔ دل میں سمجھے کہ دن بہتیرا ہے۔ چار کوس چلنا کیا مشکل ہے۔ اب وہاں پہنچکر نچنت ہوجائیں گے۔ آگے میدان آجائے گا۔ پھر کچھ پروا نہیں۔ اور اُمرا آپ ہی آرہیں گے۔ چلو آگے ہی بڑھ چلو۔ لیکن اِنھوں نے آگرہ اور سیکری کا رستہ دیکھا تھا۔ وہ پہاڑ کب دیکھے تھے۔ اور اُن کی منزلیں کہاں کاٹی تھیں۔ جو لوگ پادشاہی سواری کے ساتھ ڈولہ۔ پالکیوں۔ تام جاموں میں پھریں۔ اُنھیں کیا خبر کہ یہ معاملہ کیا ہے۔ اور شبخون کا موقع کیا ہے۔ اور شبخون ماریں بھی تو پہاڑی کر کیا لیں گے۔ مگر یہ سمجھنا بھی تو جنگی ہی لوگوں کا کام ہے۔ نہ بھاٹوں کا۔ وہ سمجھے کہ جو کچھ ہے۔ یہی چار کوس کا معاملہ ہے۔ آخر تین جنگی لشکر آگے پیچھے چلے۔

آزاد۔ میرے دوستو! وہ مُلک تو دُنیا ہی نئی ہے۔ کیونکر لکھوں کہ تمھارے تصور میں تصویر کھینچوں۔ یہ عالم ہے۔ کہ چاروں طرف پہاڑ۔ درختوں کا بن۔ گھاٹی

ایسی تنگ کہ دو تین آدمی بمشکل چل سکیں۔ رستہ ایسا کہ پتھروں کی اُتار چڑھاؤ پر ایک لکیر سی پڑی ہے۔ اُسی کو سڑک سمجھ لو۔ گھوڑوں ہی کا دل ہے۔ اور اُنھیں کے قدم ہیں۔ کہ چلے جاتے ہیں۔ کبھی دائیں پر۔ کبھی بائیں پر۔ کہیں دونوں طرف کھڈ ہیں کہ دیکھنے کو جی نہیں چاہتا۔ ذرا پاؤں اِدھر اُدھر ہوا۔ لڑکا اور گیا۔ یہ عالم ہوتا ہے۔ کہ نفسی نفسی پڑی ہوتی ہے۔ ایک بھائی لُڑکا جاتا ہے۔ دُوسرا بھائی دیکھتا ہے۔ اور آگے ہی قدم اُٹھاتا جاتا ہے۔ کیا ذِکر جو سنبھالنے کا خیال آئے۔ چلتے چلتے ذرا کھلا آسمان اور کُھلا میدان آیا تو سامنے ایک دیوار پہاڑوں کی معلوم ہوئی جس کی چوٹیاں آسمان سے باتیں کرتی ہیں۔ خیال آتا ہے۔ کہ اِس سے گُذر جائیں گے۔ تو مُشکل آسان ہو جائے گی۔ دِن بھر کی منزل مار کر اُوپر پہنچے۔ وہاں جا کر کچھ میدان آیا۔ اور دُور دُور چوٹیاں دکھائی دیں۔ اُتر کر ایک اور گھاٹی میں جا پڑے کہ پھر وہی آسمانی دیواریں موجود۔ وہ پہاڑ چھاتی پر غم کا پہاڑ ہو جاتے ہیں۔ الٰہی کیوں کر یہ کوہِ غم کٹے۔ دل کہتا ہے کہ بس مر لئے یہیں۔ بعض موقع پہ ایک جانب کو ذرا چھوٹے ٹیلے نمودار

ہوتے ہیں مسافر کا دل تازہ ہو جاتا ہے ۔ کہ بس اب اِن میں سے نکل کر میدان میں چلے جائیں گے مگر اُن سے آگے بڑھ کر ایک میدان آیا ۔ کئی کوس بڑھ کر پھر ایک درے میں گھسنا پڑا ۔ چشموں کی چادریں گرنے کی آوازیں آنے لگیں ۔ آدھ کوس یا کوس بھر کے بعد پھر وہی اندھیر مشرق مغرب تک کا پتہ نہیں یہ کیسے معلوم ہو کہ دِن چڑھا ہے یا ڈھل رہا ہے ۔ اور آبادی کا تو ذکر ہی نہ کرو ۔

غرض بیربر تو اِسی بہلاوے میں آگے بڑھ گئے ۔ کہ ہمت کر کے نکل جاویں گے ۔ تو آج ہی سب کا خاتمہ ہو جائے گا ۔ پیچھے والے آپ ہی چلے آویں گے ۔ مگر یہ آنا دربار یا عیدگاہ سے گھر آنا تو نہ تھا ۔ جو لوگ اُتر پڑے تھے ۔ اور کچھ خیمے لگا چکے تھے ۔ اُنھوں نے جو دیکھا کہ راجہ بیربر کی سواری چلی ۔ اور وہ آگے جاتے ہیں ۔ سمجھے کہ ہمیں حکم غلط پہنچا ۔ یا رائے پلٹ گئی ۔ سب کے ہاتھ پاؤں پھول گئے ۔ جو ابھی آ کر کھڑے ہوئے تھے ۔ وہ دوڑ پڑے ۔ اور جو ڈیرے لگا چکے تھے ۔ یا لگاتے تھے ۔ وہ گھبرا گئے کہ اِن سب کو سمیٹیں ۔ اور بغل میں مار کر بھاگ چلیں ۔ آخر خیمے گرا دئے ۔ کچھ لپیٹے اور کچھ باندھے اور پیچھے پیچھے بھاگے ۔ ہندوستان کے رہنے والے لوگ پہاڑوں سے اور رات

دن کی مار مار۔ ہر وقت کے خوف و خطر سے تنگ ہو ہی رہے تھے۔ یہ حالت دیکھ کر جو خاطر جمع سے پیچھے آتے تھے۔ اُن میں بھی گھبراہٹ پیدا ہوئی اور بے تحاشا آگے کو بھاگے۔ افغانوں کے آدمی بھی انھیں میں ملے چلے آتے تھے۔ اور دائیں بائیں پہاڑوں پر لگے ہوئے تھے۔ انھوں نے جو ہل چل دیکھی۔ لوٹنا شروع کر دیا۔

اگر لشکر شاہی کے لوگ ہوش و حواس درست رکھتے۔ یا بیربر کچھ تھوڑا فوجی دستہ کو دہانے پر روک کر کھڑا ہو جاتا۔ تو اُن لٹیروں کو دھر لینا اور ہٹا دینا کچھ بڑی بات نہ تھی۔ مگر لاڈلے راجہ کو ضرور خیال ہوا ہوگا کہ اتنا بڑا لشکر ہے۔ نکل ہی آئیں گے۔ جو مر جائیں سو مر جائیں۔ تم تو چلو۔ لشکر جو کوسوں کی قطار میں دریا کی طرح چڑھاؤ میں چلا آتا تھا۔ ایک تلاطم میں پڑ گیا۔ افغانوں کا یہ عالم تھا۔ کہ قرینے [illegible] باندھ اپنا کام کئے جاتے تھے۔ رستہ کڈھب۔ گھاٹیاں تنگ۔ بُرا حال ہوا۔ زین خاں بچارہ خوب خوب لڑا۔ آگے بڑھ کر اور پیچھے والوں کو سنبھال کر جان لڑائی۔ مگر کیا کر سکتا تھا۔ مقام بے موقع۔ [illegible] پیچ پیچ آفت

لدے پھندے لوٹ لے گئے ۔ آدمی بھی بے شمار ضائع ہوئے اور جو اُن کے ہاتھ آئے پکڑ کر لے گئے ۔ غرض لڑتے مرتے مارتے چھ کوس آئے ۔

دُوسرے دِن زین خاں نے مقام کیا کہ لوگ لُوٹے پُھوٹے کی مرہم پٹّی کریں ۔ اور ٹھہر کر ذرا دم لیں ۔ آپ راجہ بیربر کے ڈیرے گیا ۔ اور اُمرا کو جمع کرکے مشورے کا جلسہ کیا ۔ اکثر اہلِ لشکر ہندوستانی ہی تھے مُلک اور مُلک کی حالت سے گھبرا گئے تھے ۔ کثرتِ رائے یہی ہوئی کہ نکل چلو ۔ اُس نے کہا کہ "آگے پہاڑ اور ٹیلے بے ڈھب ہیں ۔ لشکر والوں کے دِل ٹوٹ گئے ہیں ۔ افغان دِلیر ہوکر پہاڑوں پر اُمنڈ آئے ہیں لکڑی چارہ پانی دانہ بہت مِلتا ہے ۔ میری صلاح یہی ہے ۔ کہ چند روز قیام کریں ۔ اور اپنی حیثیت دُرست کرکے باغیوں کو ایسی گوشمالی دیں ۔ کہ اُن کے بگڑے ہوئے دماغ دُرست ہوجائیں ۔ اور یہ صلاح نہ ہو تو اُن کے بھائی بند عیال مال مویشی بھی ہمارے قبضے میں ہیں ۔ وہ پیغام سلام کریں گے ۔ اور اِطاعت کرکے عفوِ تقصیر چاہیں گے ۔ قیدی اُن کے حوالے کرکے خاطر جمع کے ساتھ یہاں سے چلیں گے ۔ یہ صلاح بھی

پسند نہ ہو۔ تو حضور میں سب عرضِ حال لکھ کر بھیجیں۔ اور کُمک منگائیں۔ اُدھر سے فوج آ کر پہاڑوں کو روک لے۔ ہم اِدھر سے متوجہ ہوں"۔ لیکن یہ ہندوستانی دال خور جنھوں نے گھر کی ماما پختڑیاں کھائیں۔ پہاڑ اُن سے کب کٹے۔ ایک بات پر بھی صلاح نہ ٹھہری۔ مطلب وہی کہ یہاں سے نکل چلو۔ اور گھر چل کر توری پُھلکے اُڑاؤ

غرض دُوسرے دن کمال اضطراب اور بے سر و سامانی میں خیمے ڈیرے اُکھیڑ روانہ ہوئے۔ بھیر بُنگاہ ہمیشہ پیچھے ہوتی ہے۔ اور افغانوں کا قاعدہ ہے کہ اُنھی پر گرا کرتے ہیں۔ اِس لئے زین خاں آپ چنداول ہوا۔ منزل سے اُٹھتے ہی لڑائی شروع ہوئی۔ افغانوں کا یہ عالم کہ سامنے پہاڑوں پر سے اُمنڈے آتے ہیں۔ کھڈّوں۔ گھاٹیوں اور مارپیچوں میں چھپے بیٹھے ہیں۔ دفعتہً نکل کھڑے ہوتے ہیں۔ ہندوستانی چیخیں مارتے ہیں۔ اور ایک ایک پر گرے پڑتے ہیں۔ جہاں گھاٹی یا درّہ آتا۔ وہاں قیامت آجاتی۔ آدمی اور جانور۔ زندہ اور مُردہ کوئی نہ دیکھتا تھا۔ پامال کئے چلے جاتے تھے۔ سنبھالنے اور اُٹھانے کا تو کیا ذکر۔ سردار اور سپاہی کوئی پُوچھتا نہ تھا۔ زین خاں بچارہ جا بجا

دوڑتا تھا - اور سپر کی طرح جان آگے دھرے دیتا تھا - کہ لوگ آسانی سے گذر جائیں -

جب شام ہوئی تو افغانوں کی ہمت بڑھی - اِدھر اِن کے دِل ٹوٹ گئے - وہ چاروں طرف سے اُمنڈ کر گرے - اور تیر اندازی و سنگ باری کرنے لگے - بادشاہی لشکر اور بھیر میں ایک کُہرام مچ گیا - پہاڑ تہ و بالا ہو گیا - رستہ ایسا تنگ تھا - کہ دو سوار بھی برابر چل نہ سکتے تھے - اور اندھیرا ہو گیا - افغانوں نے بھی موقع پایا - آگے پیچھے اوپر نیچے سے گولی تیر پتھر برسانے شروع کیے - ہاتھی - گھوڑے - آدمی - اُونٹ - گائے - بیل - ایک پر ایک گرتا تھا - قیامت کا نمونہ تھا - اُس دِن بہت آدمی ضائع ہوئے - رات ہوگئی - زین خاں نے مارے غیرت کے چاہا - کہ ایک جگہ اڑ کر راہِ اخلاص میں جان قُربان کردے - ایک سردار دوڑا آیا - اور باگ پکڑ کر اُس انبوہ میں سے نکالا - گھاٹیوں میں اتنے آدمی - گھوڑے - ہاتھی - پڑے تھے کہ رستہ بند ہو گیا تھا - ناچار گھوڑا چھوڑ کر پیادہ ہوا - اور بے راہ ایک پہاڑی پر چڑھ کر بھاگا - ہزار دُشواری سے منزل پر جان پہنچائی - لوگ بھی گھبراہٹ میں کہیں کے کہیں جا پڑے - بعضے سلامت پہنچے - بعض قید ہو گئے -

حکیم ابوالفتح بڑی جان کندن سے منزل پر پہنچے۔ مگر افسوس ہے کہ راجہ بیربر کا پتہ نہ لگا۔ اور وہ کیا ہزاروں آدمی جانوں سے گئے۔ جن میں اکثر بادشاہ شناس اور درباری منصب دار تھے۔ اور قیدیوں کی تو گنتی کہاں۔ غرض ایسی شکستِ فاحش ہوئی کہ تمام اکبری سلطنت میں کبھی اِس خرابی کے ساتھ فوج نہیں بھاگی۔ چالیس پچاس ہزار میں سے کچھ بھی باقی نہ رہا۔ زین خاں اور حکیم ابوالفتح نے کمال بدحالی کے ساتھ اٹک میں آکر دم لیا۔ پٹھانوں کو اتنی لوٹ ہاتھ آئی۔ کہ سات پشت تک بھی نصیب نہ ہوئی ہوگی۔ اِس خبر کے سُننے سے خصوصاً راجہ بیربر کے مرنے سے کہ مُصاحبانِ بزمِ اُنس اور محرمانِ انجمنِ قدس میں سے تھا۔ خاطرِ قدسی پر اِس قدر بارِ غم ہوا۔ کہ گویا ابتدائے جلوس سے آج تک نہ ہوا تھا۔ دو رات دن معمولی دستور نہ کیا۔ بلکہ کھانا تک نہ کھایا۔ مریم مکانی نے بہت سمجھایا۔ بندگانِ عقیدت کیش نے نالہ و زاری کی۔ تو طبیعت کو مجبور کر کے کھانے پینے پر متوجہ ہوئے۔ زین خاں اور حکیم وغیرہ سلام سے محروم کئے گئے۔ لاش کی بڑی تلاش رہی۔ مگر افسوس کہ وہ بھی نہ پائی۔

مُلّا صاحب اِس بات پر بہت خفا ہیں کہ اِس کا رنج کیوں کیا۔ لکھتے ہیں" اور کِن کِن شوخیوں کے ساتھ لکھتے ہیں۔ جو لوگ سلام سے محرُوم ہوئے تھے۔ اُن کی خطا معاف ہوگئی۔ اور چونکہ بیربر جیسے مُصاحب کو آپس کے نفاق میں برباد کیا (اور نفاق تو ثابت تھا۔) اِس لئے چند روز نظر سے مردُود اور کورنش سے محرُوم رہے۔ پھر وہی درجہ جو تھا بلکہ اُس سے بھی بڑھ گئے۔ کسی امیر کے مرنے کا ایسا رنج نہیں کیا جیسا بیربر کا کیا (کہتے تھے) افسوس اُس کی لاش کو گھاٹی میں سے نکال نہ سکے۔ اُسے آگ تو مِل جاتی۔ پھر آپ ہی تسلّی دیتے تھے۔ خیر وہ ساری قیدوں سے آزاد۔ پاک اور الگ تھا۔ نیّرِ اعظم کی روشنی اُس کے پاک کرنے کو کافی ہے۔ اور پاک کرنے کی تو اُسے حاجت بھی نہ تھی۔

آزاد۔ لوگ جانتے تھے۔ کہ بیربر آٹھ پہر بادشاہ کے دِل کا بہلاوا ہے۔ اب جو اِس کے مرنے سے ایسا بیتاب و بیقرار دیکھا تو رنگا رنگ کی خبریں لانے لگے۔ کوئی جاتری آتا اور کہتا کہ "میں جوالاجی سے آتا ہوں۔ جوگیوں کے ایک غول میں بیربر چلا جاتا تھا" کوئی کہتا تھا کہ "سنیاسیوں کے ساتھ بیٹھا کتھا بانچ رہا تھا"۔ بادشاہ کے دِل

کی بیقراری ہر بات کی تصدیق کرتی تھی۔ خود کہتے تھے کہ "وہ علائقِ دُنیا سے الگ تھا اور غیرت والا تھا۔ تعجب کیا ہے۔ شکست کی شرمندگی سے فقیر ہوکر نکل گیا ہو" درباری احمق اِن خیالات کو اور پھیلاتے تھے۔ اور اِن پر حاشیے چڑھاتے تھے۔

لاہور میں روز نئی ہوائی اُڑتی تھی۔ آخر یہاں تک ہوا کہ بادشاہ نے ایک آدمی کانگڑے بھیجا کہ بیربر کو ڈھونڈھ کر لاؤ۔ دیکھا تو کچھ بھی نہ تھا۔ اُس کی زندگی کا ڈھکوسلا اور بادشاہ کا اُس پر یقین ایسا مشہور ہوا کہ جا بجا چرچا ہوگیا۔ یہاں تک کہ کالنجر اِس کی جاگیر تھا۔ وہاں کے منشیوں کی عرضیاں آئیں کہ "یہاں تھا۔ ایک برہمن اِسے پہلے سے خوب جانتا تھا۔ اُس نے تیل ملنے میں خط و خال پہچانے اور یہاں ضرور ہے مگر کہیں چھپا ہوا ہے" حضور سے فوراً کروڑی کے نام فرمان جاری ہوا۔ اِس احمق نے ایک غریب مسافر کو حماقت سے یا ظرافت سے بیربر بنا کر رکھا تھا۔ اب جو فرمان پہنچا۔ اور تحقیق کی۔ تو سمجھا کہ دربار میں سخت ندامت ہوگی بلکہ نوکری کا خطرہ ہے۔ اُس نے حجّام کو تو بھیج دیا۔ اور بے گُناہ مسافر کو مُفت مار ڈالا۔ جواب میں عرضی کردی کہ "یہاں تھا تو سہی مگر قضا نے سعادت پابوس سے محروم

رکھا۔ دربار میں دوبارہ ماتم پرسی ہوئی۔ پھر مرنے کی سوگواریاں ہوئیں۔ کروڑی اور اَور نوکر وہاں کے اِس جُرم میں طلب ہوئے کہ حضور کو کیوں نہ خبر کی۔ قید رہے۔ شکنجۂ سزا میں آئے۔ ہزاروں روپیہ جرمانہ بھرے۔ آخر چھُوٹ گئے۔ واہ مرنے کا بھی مسخرا پن رہا۔ اور لوگوں کی جانوں کو مُفت عذاب میں ڈالا۔

اگرچہ بیربر کا منصب دوہزاری سے زیادہ نہ تھا۔ لیکن عنایت اِس قدر تھی۔ کہ ہزاروں اور لاکھوں کے جواہر۔ برس بلکہ مہینوں میں عطا ہوجاتے۔ صاحبُ السّیف والقلم خطاب میں داخل تھا۔ مراسلوں اور فرمانوں میں قلم آٹھ آٹھ سطریں سیاہ کرلیتا تھا۔ جب اِن کا نام صفحہ پر ٹپکتا تھا۔ اِن کے مرنے کی خبر خود امرائے عالیشان کو لکھ لکھ کر بھیجی۔ چنانچہ عبدالرّحیم خانِ خاناں کے نام ایک چھ صفحے کا طولانی فرمان لکھا ہے۔ ابوالفضل کے پہلے دفتر میں موجود ہے۔ اکبر اُسے ایسا محرمِ راز سمجھتا تھا کہ کسی طرح کا پردہ نہ تھا۔ اِنتہا ہے۔ کہ آرام کے وقت حرم سرا کے اندر بھی بُلا لیتے تھے۔ اور حق پُوچھو تو اُن کے چٹکلوں اور چُہلوں کا وہی وقت تھا کہ خلوتِ خاص اور مقامِ بے تکلّف ہوتا تھا۔

بیربر دینِ الٰہی اکبر شاہی میں داخل تھے۔ اور مُرید باخلاص تھے۔ اور مراتبِ چہارگانہ کی منزلوں میں سب سے آگے دوڑے جاتے تھے۔ مُلّا صاحب ان سے بہت تنگ۔ خفا ہوتے ہیں۔ اکثر یہ تبرا کرتے ہیں۔ کہ ملعون کافر مردود سگ بے دین وغیرہ الفاظ سے زبان آلودہ کرتے ہیں۔ یہ ضرور ہے کہ بیربر جی ہنسی میں اسلام اور اسلام والوں کو بھی جو چاہتے تھے سو کہہ جاتے تھے۔ مسلمان امیروں کو یہ بات ناگوار ہوتی ہوگی۔ چنانچہ شہباز خاں کمبوہ چار ہزاری منصب دار جو اکثر مہموں میں سپہ سالار بھی ہوا۔ (شہر اللہ نام تھا لاہوری تھے) اُس نے بھی ایک موقعِ دربارِ خاص میں اُنھیں ایسا بُرا بھلا کہا کہ بادشاہ کی طبیعت بے لُطف ہوگئی۔ اور خود بیربر کے طرفدار ہوگئے۔ یہ لوگ سمجھتے تھے کہ بیربر ہی بادشاہ کو عقائدِ ہنود کی طرف زیادہ تر کھینچتا ہے۔

صفحہ ۷۷ میں تم نے دیکھ لیا۔ کہ بادشاہ نے شیطان پورہ آباد کیا تھا۔ لیکن خُفیہ دریافت کرتے رہتے تھے اور بڑی احتیاط تھی۔ کہ اُمرا میں سے کوئی وہاں نہ جائے۔ ایک دفعہ خبر دینے والے نے خبر دی کہ بیربر جی کا دامن بھی وہاں سے ناپاک ہوا۔ جانتے تھے کہ بادشاہ

اِس جُرم سے بہت ناراض ہوتے ہیں۔ یہ کوڑہ گھاٹم پور اپنی جاگیر میں چلے گئے۔ اِن کے خبرداروں نے بھی انھیں خبر دی کہ "بھانڈا پُھوٹ گیا ہے"۔ یہ سُن کر بہت گھبرائے۔ اور کہا "میں تو اب جوگی ہو کر نکل جاؤں گا"۔ جب بادشاہ کو خبر ہوئی تو دلجوئی اور خاطرداری کے فرمان لکھے اور بُلا لیا۔

بیربر کے مرنے پر اکبر کی اِس قدر بیقراری اور یادگاری دیکھ کر لوگ تعجُّب کرتے ہیں۔ کہ ایسے عالم فاضل تجربہ کار بہادر سردار دلاور ارکانِ دربار موجُود تھے۔ اور اکثر اِن میں سے اِن کے سامنے ہی مرے تھے۔ یہ کیا سبب کہ بیربر کے برابر کسی کے مرنے کا رنج نہیں ہوا۔ یہ امر کچھ زیادہ غور طلب نہیں۔ ظاہر ہے کہ ہر ایک امیر اپنے کام اور کرتب کا صاحبِ کمال تھا۔ اور ہر ایک کام کے لئے خاص موقع ہوتا تھا۔ مثلاً عُلما و فُضلا کا جلسہ ہو۔ عِلمی تحقیقاتیں ہوں۔ شعر و شاعری ہو۔ وہاں خواہ مخواہ فیضی۔ ابُوالفضل۔ شاہ فتح اللہ۔ حکیم ابُوالفتح۔ حکیم ہمام یاد آویں گے۔ بیربر ایسے تھے۔ کہ کچھ جانیں خواہ نہ جانیں سمجھیں یا نہ سمجھیں دخل در معقُولات کرنے کو موجُود تھے۔ مذاہب تقلیدی تو

اعتراضوں کے زیرِ مشق بن رہے تھے۔ کتاب اور سند سے کچھ بحث ہی نہ تھی۔ کیا ہندو۔ کیا مسلمان۔ زیرِ تحقیقات تھے۔ اُس نے اِس معاملے میں وہ رتبہ پیدا کیا تھا کہ وہ اور ابوالفضل وغیرہ دینِ الٰہی اکبرشاہی کے خلیفہ تھے۔ جب منقولات کا یہ حال ہو تو معقولات کا کیا کہنا ہے۔ اُس میں تو جس کا چاہیں خاکہ اُڑائیں۔ اور جسے چاہیں مسخرا بنائیں۔

مُلکی انتظام اور دفتر کے بندوبست ہوں تو راجہ ٹوڈرمل اور قلّے مذکور یاد آویں گے۔ بیربر اگرچہ اِن کاغذوں کے کیڑے نہ تھے۔ مگر ایک عجیب رقم تھے۔ کچھ تیزیِ فکر کچھ مسخراپن سے وہاں بھی جو عقل میں آتا تھا کہتے تھے۔ بلکہ زبانی جمع خرچ سے سب میزان مستوفی مِلا دیتے تھے۔ اور جب موقع دیکھتے تو مناسبِ وقت کوئی دوہرا۔ کوئی کبت۔ کوئی لطیفے کا گلدستہ بھی تیار کرکے سرِ مجلس حاضر کرتے تھے۔

مہماتِ مُلکی ہوں تو وہاں بھی حاضر۔ بے تلوار جنگ کرتے تھے۔ اور بے توپ۔ توپ خانے اُڑاتے تھے۔ سواری شکاری کے وقت کبھی کوئی اُمرا میں سے پھنس جاتا تھا۔ تو ساتھ ہو لیتا تھا۔ ورنہ اُن کا کیا کام تھا۔ یہ سپاہی

بن کر سیر و شکار کے وقت بھی آگے آگے ہو جاتے۔ اور باتوں کے نون مرچ سے وہیں کباب تیار کرکے کھلاتے۔ لیکن شیر چیتے کی بُو پاتے تو ایک ہاتھی کے ہودے میں چھپ جاتے۔

تفریح کی صحبت ناچ رنگ کے تماشے یا اور اِس قسم کی خلوتیں ہوں تو راجہ اِندر بھی تھے۔ وہاں اِن کے سِوا دُوسرے کو دخل کب ہو سکتا ہے۔ اِن مجلسوں کا سنگار کہو۔ باتوں کا گرم مصالح کہو۔ جو سمجھو بجا ہے۔ پھر خیال کرو کہ ہر دم اُن کا غم اور ہر لحظہ وہ یاد نہ آتے تو کون یاد آتا؟

بڑا افسوس یہ ہے کہ اکبر نے اِن کے لئے کیا کیا کچھ نہ کیا۔ مگر اکبر کے لئے اُنھوں نے کوئی یادگار نہ چھوڑی۔ سنسکرت کے اشلوک تو درکنار۔ بھاٹ کا ایک دُہرا بھی ایسا نہیں جسے دِلوں کی اُمنگ کسی موقع پر بول اُٹھا کرے۔ ہاں اکثر لطیفے ہیں۔ کہ متھرا کے چوبوں اور مندروں کے مہنتوں کی زبان پر ہیں۔ جب مُفت کی رسویوں سے پیٹ پُھلا کر چِت لیٹ جاتے ہیں۔ تو پیٹ پر ہاتھ پھیرتے ہیں ڈکاریں لیتے ہیں۔ اور کہتے ہیں۔ واہ بیربر جی واہ کیا اکبر بادشاہ کو غلام بنایا تھا۔ بعضے کہتے ہیں۔

کہ اگلی جون میں بیربر راجہ تھے - اور اکبر اُن کے داس تھے اور پھر ایک لطیفہ کہتے ہیں - اور کروٹیں لے لے کر گھڑیوں تعریفیں کرتے رہتے ہیں - بڈھے بڈھے پنڈتوں بلکہ پرانے پرانے منشیوں کو بھی یہ لطیفے تاریخ دانی اور تذکرہ مجلس کا سرمایہ ہوتے ہیں -

میں نے چاہا تھا کہ کچھ تصنیف نہیں ملتی تو خاتمۂ احوال میں چند رنگین اور نمکین چٹکلے ہی لکھوں مگر بہت کم لطیفے ایسے ملے - جن میں عالمانہ یا شاعرانہ کسی طرح کا لطف ہو - پرانی پرانی بیاضیں بڑی تلاش سے پیدا کیں اور جہاں لطائفِ بیربر کا نام سنا - وہیں کوشش کا ہاتھ پہنچایا - لیکن جب پڑھنے لگا - تو تہذیب نے ورق میرے ہاتھ سے چھین لیا -

منتخب از فسانۂ آزاد

الغرض نواب صاحب روانہ ہوئے - ریل کے ایک درجے میں بیٹھے - اِن کے بیٹھتے ہی اُسی درجے میں ایک اور صاحب تشریف لائے - وضع مسلمانوں کی سی تھی - شکل صورت سے معلوم ہوتا تھا خاص ولایتی

ہیں - سفید پوش معطّر و معنبر - دو بیگ ایک صراحی - بچھونا بچھایا اور بیٹھے پاس - مگر ابھی تک نواب صاحب سے بات چیت کی نوبت نہیں آئی - ریل چلی تو نواب صاحب نے پوچھا - "آپ کہاں تشریف لے جائیے گا؟" کہا "کئی اسٹیشن ہے یہاں سے" - پوچھا - "نام"؟ کہا "جوزف" پوچھا - "آپ عیسائی ہیں"؟ کہا - "ہاں"

نواب - آپ کی وضع سے نہیں پایا جاتا - جوزف - بجا ہے - ن - دولت خانہ کہاں ہے ؟ جوزف - غریب خانہ اِٹاوے میں ہے - ن - ہاں تو یہ کہیے کہ آپ اِٹاوے کے کاریگر ہیں - جو - جی اُس شہر میں بہت سے آدمی بنے - ن - قاضی بھی کوئی بنا جونپور کا ؟ جو - اُس کی لیاقت نہیں - ن - آپ کس محکمے میں نوکر ہیں ؟ جو - مجھے کیمیا بنانے کا خبط ہے - ن - لاحول و لاقوۃ - جو - اِسی سبب سے تو خبط کہا - ن - اللہ میاں اپنے گدھے کو بھی خشکہ کھلا ہی دیتے ہیں - مگر ہمارے نزدیک کیمیاگر سے زیادہ ابلہ اور کوئی نہیں - جو - ہاں یہ تو اپنے اپنے خیالات ہیں - ن - کیمیا کے پھیر میں ہزاروں آدمی پلٹ گئے - مگر ایک آنچ کی ہمیشہ کسر رہی - کیمیا کا شوق ایک قسم کا

جنون ہے - مگر ہزارہا آدمیوں کو اِسی خبط میں مبتلا پایا۔

ایک مرتبہ ایک ٹھاکر کے یہاں ایک فقیر آئے - مست شاہ - مشہور کیا کہ بڑے زبردست کیمیاگر ہیں - بھیڑیا دھسان خلقت - ایک انبوہِ کثیر ہر دم دروازے پر جمع رہتا تھا - کوئی ایسا نہیں جو سری ٹیک نہ کرے - مست شاہ کے دماغ عرشِ بریں پر تھے - ایک پٹواری نے اِن کی بڑی خدمت کی - مست شاہ ایک مرتبہ اُس کے یہاں گئے - کہا "کنڈے سلگاؤ - اور ایک کوری ہنڈیا لاؤ" - ہنڈیا کو آگ پر رکھا اور کہا "سونا چاہتا ہے تو پیتل لا - اور چاندی چاہتا ہے تو رانگا لا - مگر دو تولے سے زیادہ نہ ہو" - پٹواری فوراً دو تولے پیتل لے آیا - مست شاہ نے پیتل کو ہنڈیا میں رکھ کر آنچ خوب تیز کردی اور دو چار بوٹیاں اُس میں ملائیں - پٹواری خوش کہ دو تولے سونا ملے گا اور کیمیا کا نسخہ الگ ہاتھ آئے گا - مست شاہ آدمی کائیاں تو تھے ہی - اُنھوں نے مداری کے بھی کان کاٹے - اِدھر پٹواری کی آنکھ چوکی - اُدھر پیتل کو نکال کر پھینک دیا اور تولہ بھر سونا اُس کے عوض رکھ دیا - پٹواری سے کہا "بچہ تم یہاں بیٹھا رہنا میں ابھی آتا ہوں - مگر آنچ تیز نہ کرنا" پٹواری

کو وہاں بٹھا کر اور پٹّی پڑھا کر مست شاہ چل دیئے۔ پٹواری ایک گھنٹے تک آمد آمد کا منتظر رہا۔ اُس کے بعد اپنے ایک دوست کی صلاح سے ہنڈیا کھولی۔ اور دستِ پناہ سے پیتل کو نکالا تو چمکتا دمکتا سونا۔ آنکھیں کھل گئیں۔

پٹواری۔ سونا! سونا!۔ دوست۔ اہاہاہا! مست شاہ کہاں چل دیئے؟ پٹواری۔ سونا؟ سچ مچ کا سونا ہے؟ دوست۔ ہاں ہاں جی۔ پٹواری۔ لے اب جگنّا تھ بخش سے جا کر کہو کہ دیکھو یوں کیمیا بناتے ہیں۔ دوست۔ ہم آج سے مست شاہ کے معتقد ہوگئے۔ پٹواری۔ باکمال فقیر ہے۔ دوست۔ اِس میں کیا شک ہے۔

پٹواری اور اُس کے دوست نے محلّے بھر میں دھوم مچا دی کہ مست شاہ نے دم کے دم میں پیتل کو سونا کر دکھایا۔ لوگ دوڑے آئے اور سونا دیکھ کر عش عش کرنے لگے۔

اب سنیئے کہ جس ہنڈیا سے سونا نکلا تھا اُس کو کوئی دو سو آدمیوں نے غور سے دیکھا۔ کوئی جڑی بوٹی پہچاننے کی کوشش کرتا ہے۔ کوئی سونگھ رہا ہے۔ کوئی کھرچ کھرچ کر دیکھتا ہے کہ اِس میں کون شے ہے۔ مگر بے سود۔ پتا نہ ملا۔

پٹواری - کیوں ہے کیمیا سچ یا نہیں ؟ پڑوسی - سچ ہے سچ ہے -

پندرہ بیس آدمی اِدھر اُدھر ڈھونڈھنے نکلے - فرد بشر کی یہی دلی خواہش تھی کہ مست شاہ ہاتھ آجائیں - آخرکار ایک فقیر کی کُٹی میں ٹھاکر گجراج کو مست شاہ ملے -

ٹھاکر - آپ ہی کو تو ہم ڈھونڈھنے نکلے تھے - مست - کیوں ؟ ٹھاکر - اب چلیے - مست - اب نہ جائیں گے - ٹھاکر (ہاتھ جوڑ کر) ہم تو ضرور لے جائیں گے - مست - بھاگ جاؤ - بس اب بھاگ جاؤ - مت دِق کرو - ٹھاکر - (قدموں پر ٹوپی رکھ کر) ضرور لے چلوں گا - مست - تم ہم کو دق کرتے ہو -

فقیر - ہر کا بھیجے سو ہر کا ہوئے -

ٹھاکر نے اُس فقیر سے کہا کہ آپ مہربانی کرکے ہماری سِفارش کیجیے - مست شاہ کی ہم عُمر بھر خِدمت کریں گے - ہم فقط اتنا چاہتے ہیں کہ یہ ہمارے دروازے پر بیٹھے رہیں - مست شاہ نے گھُڑک کر کہا - ہاں تو ہم دربان ہیں - فقیر نے بات بنائی اور کہا نہیں - یہ مطلب نہیں کہ دربانی کیجیے - بلکہ یہ منشا ہے کہ

آپ کی خدمت اِن کے تعلق رہے۔
مست — ہم نہیں سمجھے۔ فقیر۔ اچھا اب آپ اِن
کے ساتھ جائیں۔

مست شاہ بہزار خرابی راضی ہوئے۔ گو دِل میں
سوچتے جاتے تھے کہ چکمہ چل گیا۔ اب ماما پُختیاں اُڑائیں
گے۔ مگر ظاہر میں جانے پر راضی نہیں ہوتے تھے کہ اب فقیر کا
راز کھُل گیا۔ لالچی تو ہیں نہیں کہ اپنے کو باکمال یا
کیمیاگر مشہور کریں۔ اللہ رے زور اور اُف رے مکر!
مست شاہ جس طرف سے نِکل جاتے تھے۔ لوگ
اُنگلیاں اُٹھاتے تھے کہ کیمیاگر فقیر یہی ہیں۔ پیتل سے
سونا اور رانگے سے چاندی بنا لیتے ہیں۔ اور یہ خبر ہی
نہ تھی کہ ایک گُل کِھلنے والا ہے۔ مست شاہ کو ٹھاکرُ
بجراج اپنے گھر لے گئے۔ خلقِ خدا پیچھے پیچھے ساتھ۔
صدہا ضعیفُ الاِعتقاد حضرت کے کمال اور کیمیاگری
کے قائل تھے۔ دس پانچ دِن جب لوگوں کو خُوب
اُلّو بنا چکے تو ایک مہاجن کو پھانسا۔ اِس کو بھی کیمیا
گری کا خبط تھا۔ مہاجن ذرا عقل کے بھی دشمن تھے۔
سیدھے سادے آدمی بھرّے میں آگئے۔ مست شاہ
نے کہا۔ زیور جس قدر لا سکو لا دو۔ آج وہ دِن ہے کہ

ایک تولہ سونے کو پچاس تولہ سونا بن سکتا ہے۔ مہاجن دس ہزار کا زیور لے آیا۔ مست شاہ نے ایک مٹی کی ہنڈیا میں زیور رکھ کر ہنڈیا کو چولھے پر چڑھا دیا۔

مست۔ تم کو ہم نسخہ بتا دیں۔ مہاجن۔ (ہنس کر) واہ واہ۔ نیکی اور پوچھ پوچھ۔ مست۔ پرسوں بتا دیں گے۔ مہاجن۔ مہربانی آپ کی۔ مست۔ مگر چھ ماشے روز سے زیادہ نہ بنانا۔ ورنہ بھگتوگے۔ مہاجن۔ چھ ماشے روز؟ مست۔ بس۔ مہاجن۔ میرے پاس روپیہ پیسہ سب کچھ ہے۔ اس طمع سے میں نہیں سیکھنا چاہتا کہ روپیہ لے۔ توبہ۔ توبہ۔ مگر ہاں یہ چاہتا ہوں کہ بنانا آجائے۔ مست۔ پرسوں شام کے وقت۔ مہاجن۔ اور یہ کب ملے گا؟ مست۔ یہ زیور؟ یہ کل صبح کو مل جائے گا۔ بلکہ اور پچاس گنے زیادہ۔ مہاجن۔ (قدموں پر ٹوپی رکھ کر)۔ بڑے اچھے فقیر ہیں آپ۔ واہ وا واہ! مست۔ تم نے خدمت بھی تو خوب کی۔ مہاجن۔ کیا خدمت کی؟ ہوں ہی کس لائق؟ توبہ! مست۔ آج جاؤ کل شام کو آنا۔

مہاجن۔ زیور چھوڑ کر رخصت ہوا۔ گھر میں گئے تو بیوی نے پوچھا۔ کہو گہنا کہاں رکھا؟ فرمایا ایک فقیر

کے پاس ۔ پچاس گنا دیں گے ۔ بیوی نے سُنتے ہی سر پیٹنا شروع کیا ۔ ہائے ہائے اب گہنا گیا ! فقیر کون ؟ فقیر کا اِعتبار کیا ؟ اور جو لے کر چل دے ؟ بلکہ چلدیا ہو تو عجب نہیں ۔ بیڑی ہے جو دس بارہ ہزار کا زیور پائے اور لے نہ بھاگے ۔ مہاجن نے کہا ۔ واہ بڑا مُعتبر آدمی ہے بیچارہ ۔ ایسی بات ہے بھلا ۔ کل شام کو ایک زیور کے پچاس زیور لو ۔

عورت ۔ بس ہمارا گہنا ہم کو لا دیجئے ۔ مہاجن ۔ شام کو جاؤں گا ۔ عورت ۔ شام کو اُس کا پتہ کہاں ملے گا ؟ مہاجن ۔ تمہاری نیّت البتّہ ڈانوا ڈول ہے ۔ اُس کی نیّت ڈانوا ڈول نہیں ہے ۔ وہ باکمال آدمی ہے ۔ جی ہاں ۔ عورت ۔ ہائے زیور گیا گذرا ۔ بس ۔ مہاجن ۔ واہ وا واہ ۔ وہ بیچارہ نیکی کرے اور تم ایسا کہو ۔ عورت ۔ اے وہ لوٹ کھائے گا ۔ نیکی کے بھروسے بھی نہ رہنا ۔ مہاجن ۔ تو ہم آج تو جاتے بھی نہیں ۔ اور جائیں گے بھی تو شام کو ۔

عورت سمجھ گئی کہ فقیر نے اِن کو اچھی پٹی پڑھائی یہ لاکھ برس تک نہ مانیں گے ۔ چُپکے اُٹھ کر اپنے بھائی کو بُلوایا اور کہا ۔ دس ہزار کا زیور لے گئے تھے ۔ اب

کہتے ہیں - ایک کے پچاس دے گا - ہاری مانتے ہیں نہ جیتی - اب تم چپکے سے دو تین آدمی اُس کے دروازے پر اِدھر اُدھر بٹھا دو - جس میں بھاگنے نہ پائے - اُس کے بھائی نے کہا - ہاں تدبیر تو اچھی ہے مگر ایسا نہ ہو - فقیر مجھکو بد دُعا دے - عورت نے بہت کچھ سمجھایا اور رو رو کر کہا کہ بھائی ! دس ہزار کا زیور ہاتھ سے جاتا ہے - جلد کوئی فکر کرو - اُس کا بھائی اقرار کر گیا کہ ضرور فکر کروں گا - راہ میں سوچا کہ اگر میں خود گیا یا پولیس والوں کو ساتھ لے گیا یا دو چار آدمی اُس کے دروازے پر تعینات کردیئے - اور مست شاہ نے خبر پائی تو ایک دُعائے بد مجھے کہیں کا نہ رکھے گی - اور اگر کچھ بندوبست نہیں کرتا ہُوں تو بہن کا گہنا جاتا ہے - آخر کار جی کڑا کرکے یہ مست شاہ کے پاس گئے -

دروازہ بند - نہ بوڑھا نہ فرزند - سناٹا - دروازے پر دستک دی - آواز نہ آئی - پھر آواز دی - مگر جواب ندارد - پھر پکارا - مگر کوئی نہ بولا - ایک گھنٹے تک دروازے پر غل مچایا کئے - مگر بے سُود - کوئی ہو تو بولے - اور وہاں سناٹا تھا -

اتنے میں ایک عورت نے اندر سے کہا " کس کی تلاش ہے ؟ " مست شاہ کی - شاہ صاحب کے پاس

آتے کیوں نہیں - کھولو - کھولو‘‘ - ’’وہ یہاں نہیں رہتے - چلے گئے - آج دس بارہ دن سے اُن کا پتہ نہیں‘‘ - ’’ہائیں! ہم کو تو آج بلایا تھا کہ مٹھائی حاضر کرنا - چلے کہاں گئے؟‘‘ ’’واہ! مانگنے کی تو اُن کی عادت ہی نہیں - ایسے ویسے تھوڑا ہی ہیں‘‘ - ’’ارے صاحب! ذرا دروازہ تو کھولو - دو دو باتیں کرلیں بس‘‘ - ’’ہمارے میاں باہر ہیں - ہم آپ کے لئے دروازہ کیسے کھول دیں؟ بھلا جو آپ جوان نہ ہوتے تو ہمیں عذر نہ تھا - آپ کے لئے دروازہ کھولیں اور ہمارے میاں آجائیں تو جوتی پیزار ہو مفت میں - ہم نہ کھولیں گے‘‘ - ’’نیک بخت! ابھی آج سویرے ہی تک تو تھے - اِس وقت کہاں چل دیئے؟‘‘ ’’اے ہے! تو میاں وہ اُن کو کبھی کوئی آگرے میں دیکھتا تھا - کبھی کلکتے میں - کبھی حسین آباد - کبھی چھت پر - یہ کون بات ہے - فقیر ہیں یا کوئی گھر گرہست‘‘؟ ’’آپ ہیں کون - اُن کی‘‘؟ ’’کوئی نہیں میاں - مجھ سے کیا مطلب ہے بھلا - جانتی ہوں کہ اچھے فقیر ہیں‘‘ - ’’تو پھر میں جاؤں اب نہ‘‘؟ ’’جی نہیں (مسکرا کر) میں پلنگ نکلواتی ہوں - آپ آرام کیجئے‘‘ - ’’مگر اتنا کہے جاتا ہوں - یہ بات اچھی نہیں ہے - ہاں بھلمنسی نہیں ہے کچھ اِس میں - کب تک چھپے گی کیری پتوں کی آڑ میں -

آخر بکنے لگی ایک روز بچار ہیں "کاہے میں بچار ! اے کوئی گنوار ہے کیا"؟ "گنوار ہو یا جو ہو مگر یہ بات اچھی نہیں ہے - اتنا یاد رکھنا"۔

بیچارے یہاں سے چلے - ایک بز قصّاب سے پوچھا - "کیوں بھئی ! اِس مکان میں کوئی رہتا ہے ؟" بز قصّاب نے کہا - "ایک شاہ جی ہیں - کئی دن سے ٹکے ہیں - پوچھا - "اُس وقت ہیں یا نہیں ہیں"؟ "ابھی دیکھا تھا میں نے"۔ انھوں نے کہا "میرا نام منّا لال ہے - میں مہاجن ہوں - میں چاہتا ہوں کہ اُن سے ملوں"۔

بز قصاب - کیوں ؟ مہاجن - اُن سے گنڈا لینا ہے اور تعویذ - بز قصاب - آپ نے پکارا تھا - کوئی بولا یا نہیں ؟ مہاجن - ہاں - مگر کوئی بولا نہیں - جواب ندارد -

شام کو مہاجن خود گئے - اور جاتے ہی غُل مچایا "کھولو کھولو - دروازہ کھولو - شاہ جی ! شاہ جی صاحب ! اجی شاہ جی صاحب ! ارے کوئی ہے یہاں ؟ کھولو - دروازہ کھول دینا - ایں ! کوئی سنتا ہی نہیں یہاں تو - لاحول ولا قوۃ - اچھے اُلّو ہیں" - جواب ندارد کوئی سنکتا تک نہیں -

بز قصاب - ایک اور بھی کوئی آئے تھے - کیا جانے کیا نام ہے ؟ تو پکارا - کل کوئی بولا چالا نہیں - مہاجن - کہو ! دو-

دروازہ کھول دو۔ کوئی ہے۔ ارے کیا سانپ سونگھ گیا؟ کھولو۔ کھولو۔ کھول دو۔ نہیں ہیں دروازہ توڑ ڈالوں گا۔ کھول دو۔ بس کوئی ہو تو کھولے۔ کوئی ہو تو جواب دے۔ دروازہ بند۔ مکان خالی۔ چو طرفہ سنّاٹا۔ عورت نہ مرد۔ بڑی دیر تک غُل مچایا کئے۔

مہاجن۔ بس اب دِل لگی ہو چکی۔ کھولو۔ بزّ قصاب۔ ہونھ۔ کھولو! وہاں ہے کون جو کھولے۔ واہ واہ! مہاجن۔ اجی شاہ جی! راوی۔ کس کے شاہ جی؟ کہاں کے شاہ جی؟ مہاجن۔ شاہ صاحب۔ اجی شاہ صاحب۔ راوی۔ واہ۔ مہاجن۔ بس اب ہم سمجھ گئے۔ اب سمجھے۔ راوی۔ کیا اب بھی نہ سمجھتے۔ ہائے اب سمجھے۔ مہاجن۔ اجی شاہ جی کھول دو۔ بس بھل منسی اِسی میں ہے کہ جھٹ پٹ دروازہ کھول دو۔ کسی نے جواب ہی نہ دیا اور دیتا کون؟ مکان میں جب کوئی ہو بھی۔ محلّے والوں سے پُوچھنے لگے۔ مہاجن۔ (بزّ قصاب سے) آخر یہ چلے کب سے گئے؟ بزّ قصاب۔ کل تک تو تھے۔ کیا جانے کب چلدیئے۔ مہاجن۔ پھر چلے کب گئے۔ کل یا آج؟ بزّ قصاب موجی آدمی جِدھر کو لہر آئی چلے گئے۔ اب لے ہم کیا جانیں۔ مہاجن۔ تم لوگوں سے گواہی۔ بزّ قصاب۔ اللہ بچائے گواہی سے۔ میاں گواہی کیسی؟ مہاجن۔ (گندھی سے)

کیوں بھئی کچھ معلوم ہے کس طرف گئے ؟ کیا کل تک تھے یہاں ؟ گندھی - جی کون ؟ مہاجن اِس مکان میں کوئی ٹِکا تھا ؟ گندھی - جی ہاں وہ مست شاہ تھے فقیر - مہاجن - اب کہاں ہیں ؟ گندھی - کل رات کو تو ہمارے پاس آئے تھے - عِطر لے گئے تھے - دو تولہ - آج صُبح کو ہم نے دیکھا تھا - مگر پھر نہیں دیکھا - آتے ہوں گے - گندھی کے آدمی نے کہا - اجی صاحب رمتے جوگی تو ہیں ہی - اُن کا کون ٹھکانا - کبھی یہاں - کبھی کلکتے میں - کبھی کہیں - کبھی کہیں - مہاجن - بھائی جان ! اُن کا پتا تو لگاؤ ذرا ہیں کہاں اب ؟ گندھی - کیوں ؟ مہاجن - کام ہے - گندھی - کیا کوئی تعویذ یا گنڈا چاہتے ہو - یا کوئی اور کام ہے ؟ مہاجن کیا بتائیں - بھائی مر گئے ہم تو - ہائے ستم ہے - گندھی - کیوں کیوں ؟ کیا ہو گیا ؟ بتاؤ تو - مہاجن - کیا کہوں یار (آہِ سرد کھینچکر) افسوس ! گندھی ہماری سمجھ ہی میں نہیں آتا کچھ - مہاجن - اب یہ بتائیے کہ مل سکیں گے یا نہیں ؟ نہ مل سکیں تو خیر تھانے پر 'رپوٹ' لکھوائی جائے - گندھی - کیا فوجداری کا معاملہ ہے ؟ توبہ ! توبہ ! یہاں تک نوبت آگئی - افسوس ہوا -

مہاجن نے کئی گھنٹے تک غُل مچایا - اور یہاں تک

چلّایا کہ راہ میں بیسیوں آدمی کھڑے ہوگئے اور حیرت کے ساتھ سوال کرنے لگے ۔

ایک ۔ کیا ہُوا جی کیا ہُوا آخر ؟ دوسرا ۔ کیا رُوپیہ لے کر کوئی حریف بھاگ گیا ؟ تیسرا ۔ اِس میں تو شاہ جی ٹکے تھے ۔ چوتھا ۔ ہوں گے اِسی میں ۔ مگر فقیر آدمی نہیں کھولتے دروازہ ۔ موج ہی تو ہے ۔ پانچواں ۔ یہ تو کہتے ہیں روپیہ لے کر چل دیا ۔ چھٹا ۔ ہائیں ! زبان سڑ جائے گی ۔ ساتواں ۔ یہ گھانس کھا گئے ہیں جی ۔ مست شاہ خود لاکھوں روپیہ ایک ذرا سی بُوٹی سے پیدا کر سکتے ہیں ۔ اُن کو کسی کی کیا پروا ہے ۔ آٹھواں ۔ لیے مرتے ہیں ۔ نواں ۔ کیا بکتے ہو لیے مرتے ہیں ۔ کوئی غریب آدمی ہیں ۔ یا تمھارے سے کنگال ہیں ؟ لکھ پتی آدمی ہیں ۔ لکھ پتی ۔ ایسے ویسے نہیں ہیں ۔ کہنے لگے لئے مرتے ہیں ۔ دسواں ۔ اجی فقیر کے پھیریں کبھی نہ پڑے ۔ اور جو کوئی یہ مشہور کرے کہ میں کیمیا گر ہوں ۔ تو سمجھ جائیے کہ بڑا مکّار ہے ۔ بس یہی ثبُوت ہے اِس کا ۔ مہاجن ۔ ہے تو ایسا ہی ۔ ہائے افسوس ! اب سمجھے یار ۔ تماشائی ۔ کتنے کا زیور تھا کتنے کا ؟ مہاجن ۔ لُٹ گئے بھئی ۔ ہائے کیا گدھا پن کیا ۔ سمجھایا تھا دو ایک نے ہم کو ۔ مگر اِتّفاقِ وقت ۔ نہ سمجھے اُس وقت ۔ تماشائی ۔ اور دیا کب

تھا۔ آپ نے؟ مہاجن۔ آج ہی کا ذکر ہے۔ تماشائی۔ تو اب دروازہ توڑیئے۔ کھڑے منہ کب تک دیکھا کیجیے گا؟

دو چار آدمیوں نے صلاح دی کہ کسی شخص کو دیوار پر چڑھاکر کہو اُدھر کودے اور دروازہ کھول دے۔ آخر یہاں کھڑے کھڑے کب تک رویا کروگے؟ مہاجن کے حواس اُس وقت غائب غلہ تھے۔ ہوش اُڑے ہوئے۔ الغرض آخر کار ایک شخص دیوار پر چڑھ گیا۔ اور اُدھر کود کر اُس نے دروازہ کھولا۔ بھڑ بھڑا کر کوئی پچاس آدمی گھس پڑے۔ کہاں ہے۔ کہاں ہے۔ ایں! پتا ہی نہیں۔ ارے یہاں تو سناٹا ہے۔ کوئی ہے ہی نہیں۔

مہاجن۔ دیکھو۔ دیکھو۔ ذرا دیکھو۔ اِدھر اُدھر ہوگا۔ لوگ۔ اب کہاں دیکھیں؟ مہاجن۔ ہائے ستم! افسوس صد افسوس! لِٹ گئے یارو! لوگ۔ بڑا دھوکا دیا۔ لے دے چلدیئے۔ مہاجن۔ قتل کر گیا۔ لوگ۔ آؤ اِدھر اُدھر پھر دیکھ لیں ذرا۔ شاید کہیں نظر آجائے چھپا بیٹھا ہو۔ کیا عجب ہے۔ یا۔ مہاجن۔ اب آئے گا یا نہیں یہاں؟ لوگ۔ آئے تو آپ سے بھی بڑھ کر پاگل ہے۔ (قہقہہ) مہاجن۔ ہائے افسوس! روپیہ کا روپیہ گیا اور پاگل کے پاگل بنے۔ راوی۔ یکے نقصان مایہ و دیگرے شماتت ہمسایہ۔ مہاجن (بیٹھ کر) کمر ٹوٹ گئی۔ مر مٹے۔ مر مٹے۔ لوگ۔ زیور تھا کہ نقد روپیہ؟ مہاجن۔ مار ڈالا۔ کہیں کا نہ رکھا۔

جھانسا دے کر چل دیا - لوگ - ارے میاں ! تھا کیا - زیور تھا - یا نقد روپیہ - یا نوٹ ؟ نان بائی - نہیں جی نقدی ہوگی - حجام - نہیں - گہنا تھا گہنا - نقدی نہیں تھا - تیلی - پھر ہوا کیا ؟ چور آیا تھا کیا ؟ کون لے کون گیا ؟ برہمن - چور نہیں بڑا چور تھا - ساعت بچار کے آیا تھا - شیخ جی - کس قدر زیور تھا - حضرت ! کیا کوئی رقم کثیر تھی دو چار ہزار کی ؟ برہمن - یہ تو کہتے ہیں دس ہزار روپیہ کا تھا - کیا معلوم کس قدر کا تھا - مگر رونے سے معلوم ہوتا ہے کہ رقم اچھی تھی - دس ہزار بہت ہے - حجام - مونڈ لے گیا - تیلی - اجی ابھی تیل دیکھئے - تیل کی دھار دیکھئے - کہیں چھپا نہ ہو - نان بائی - جی ہاں ایسا ہی تو بڑا مکان ہے - جو ملے نہ تو تنور میں جھونک دوں - برہمن - اب تھانے پر رپٹ تو لکھوا دو - جس میں فوراً بندوبست کریں - نہیں پھر وہ ہاتھ نہ آئے گا منزلوں کی خبر لائے گا - مہاجن - ہاں ! اور نہیں تو رل ہی تو جائے گا - شاید - (جمعدار آیا - دو برق انداز ساتھ) - جمعدار - آپ کا زیور تھا - کس کا زیور تھا ؟ آپ کا ؟ مہاجن - جی ہاں - جمعدار - بھلا کس قدر ہوگا - چاندی کا تھا یا سونے کا ؟ مہاجن - جی نہیں - رانگے کا اور پیتل کا - لوگ - اجی ! یہ بڑے امیر ہیں - سونے ہی سونے کا زیور تھا سب -

جمعدار۔ پھر کیوں ہم کو تکلیف دی ۔ امیر ہیں تو ذرا سے زیور کے لئے روئے کیوں دیتے ہیں ۔ زیور گیا گیا ۔ جانے دو ۔ مہاجن رقم کثیر تھی ۔ جمعدار ۔ پھر ۔

جمعدار صاحب نے کل دالان اور کمرے اور کوٹھریاں دیکھیں ۔ چھت پر گئے ۔ وہاں ڈھونڈا ۔ ڈیوڑھی میں دیکھا مگر بے سُود مست شاہ کا پتا ہی نہیں ۔

مہاجن ۔ (ہاتھ ملکر) بس اب ہم سنکھیا کھا لیں گے اور جان دیں گے ۔ جمعدار ۔ نہیں نہیں ۔ دیکھو ہم پتا لگاتے ہیں ۔ مِل گیا تو واہ واہ اور نہیں مِلا تو پھر مجبوری ہے ہم کیا کریں ۔ کوئی ایسا کرتا ہے ؟ مہاجن ۔ مِل چکا ۔ جمعدار ۔ (علٰحدہ لے جاکر) سچ بتانا کس قدر رُوپیہ تھا کس قدر ؟ مہاجن ۔ رُوپیہ نہیں تھا ۔ زیور تھا ۔ جمعدار ۔ کِس قدر ؟ مہاجن ۔ دس ہزار کا ۔ کچھ اُوپر دس ہزار کا ہوگا کم نہ ہوگا ۔ جمعدار ۔ ٹھیک ٹھیک بتاؤ ۔ ورنہ فائدہ ؟ مہاجن ۔ واہ ری قسمت ۔ جھوٹ بولنے سے مجھے فائدہ ۔ واہ ۔ جمعدار ۔ تم اتنے امیر ہوکر دس ہزار روپے کے لئے روئے دیتے ہو! مہاجن ۔ خوب اچھے خوش! کیا خفیف زخم ہے یہ ؟ جمعدار ۔ اور پڑھے لکھے آدمی ہوکر ۔ مہاجن ۔ اب کچھ فکر کرتے ہو یا باتیں بناتے ہو خالی ؟ جمعدار ۔ فکر کیسی ؟ مہاجن ۔

ناکوں پر آدمی بھیجو۔ شہر میں تلاش کرو۔ جمعدار۔ پہلے تحقیقات کرلیں۔ مہاجن۔ تو یہ تحقیقات ہوتی ہے؟ جمعدار۔ بوچڑ کو بلاؤ۔ بوچڑ۔ میں تو کھڑا ہی ہوں۔ جمعدار۔ وہ جو فقیر اس مکان میں رہتا تھا اس کا کیا حال جانتے ہو؟ صاف صاف بتاؤ جھوٹ نہ بولنا۔ ہاں اتنا یاد رہے۔ بوچڑ۔ مست شاہ کا حال میں کیا جانوں صاحب؟ جمعدار۔ ہاں ہاں یار۔ بوچڑ۔ اور تو کچھ نہیں جانتا۔ اتنا جانتا ہوں کہ سات سیر گوشت کے دام لے کر چلدیئے۔ انھیں کا بھلا ہو۔ کے دن کھائیں گے؟ اس پر لوگوں نے قہقہہ لگایا۔ جمعدار۔ ہاں تم کو بھی لوٹ لیا۔ بوچڑ۔ ملیں گے تو میں بھی پچھاڑوں گا۔ جمعدار۔ جب ملیں نہ۔ ملنے کی امید کس کو ہے؟

جمعدار نے اہل محلہ سے پوچھا کہ مست شاہ کے یہاں کون کون آیا تھا؟ لوگوں نے کہا ایک آنا ہو تو بتائیں۔ دو آتے ہوں تو کہیں۔ دس آتے ہوتے تو نام بتاتے۔ اب کس کس کو بتائیں۔ صبح سے شام تک سیکڑوں ہی آتے جاتے تھے۔ تڑکا ہوا اور لوگوں نے آنا شروع کیا۔ تو آ۔ میں آ۔ یہ آ۔ وہ آیا۔ وہ بھیڑ رہتی تھی۔ وہ بھیڑ رہتی تھی کہ توبہ۔ دوسرے نے کہا کسی قوم کا کسی پیشے کا آدمی نہیں، جو وہاں نہ گیا ہو۔ کچھ لوگ تو کیمیا بنانے کی فکر

میں جاتے تھے۔ کچھ لڑکا مانگنے۔ کوئی زیارت کے لئے۔ کیا بھیڑیا دھسان خلقت ہے۔ دِن رات چہل پہل رہتی تھی۔ جمعدار۔ ہاں بدمعاش تھا۔ نیک آدمی۔ توبہ توبہ! ایسے نیک آدمی ہیں کہ ہم ہی جانتے ہیں۔ دوسرا۔ ہم بتائیں لیے مرتے ہیں یہ ساہوکار۔ مست شاہ سا فقیر اور زیور لے کر چل دے۔ ممکن نہیں۔ تیسرا۔ بیشک۔ چوتھا۔ اجی! دنیا کے لوگ کتے ہوتے ہیں اور ہم نے تو اچھے اچھے فقیروں کو آزمایا تو دھوکا ہی دھوکا پایا۔ جمعدار۔ ہاں یہ تو ہم خوب جانتے ہیں۔ مہاجن۔ اب جو جس کا جی چاہے وہ کہے۔ جمعدار۔ بھائی دس ہزار تو غلط ہے۔ مہاجن۔ اجی! ہم انسپکٹر کے پاس جاتے ہیں تم بیچارے بھلا کیا تحقیقات کرو گے۔ جمعدار۔ اچھا جائیے۔ مہاجن۔ دیکھو سب لوگ گواہ رہنا کہ یہ ہم ہی سے ٹھائیں ٹھائیں کرتے ہیں اور ڈپٹتے ہیں۔ جمعدار۔ عجب لڑ رہے بھئی۔ مہاجن۔ ذرا زبان سنبھالے ہی رہنا۔ جمعدار۔ ہاں اچھا لکھواؤ کیا مال گیا؟ مہاجن۔ دس ہزار کا زیور۔ جمعدار۔ دس ہزار کا زیور گیا۔ (مہاجن نے پہلے چار ہزار کا زیور بتایا۔ پھر آٹھ سو کا۔ اب دس ہزار کا بتایا ہے) یہ فِقرہ جمعدار نے لکھ لیا۔ جمعدار۔ کون کون زیور تھا؟ مہاجن۔ کئی عدد تھے۔ جمعدار (سائل سے دریافت کیا گیا کہ کون کون عدد گیا؟ بولا ہم کو یاد نہیں۔ پوچھا

پھر تم کو قیمت کیونکر دریافت ہوگئی ؟ کہا ہم دس ہزار رُوپیہ سرکار سے بھر لیں گے) یہ فقرہ بھی جمعدار صاحب نے اِظہار میں لکھ لیا - مہاجن - دیر ہوتی جاتی ہے - ناکوں پر آدمی ضرور بھیجنا چاہیئے - ورنہ پھر وہ ہاتھ نہ آئے گا - جمعدار - تو بندہ نواز ! آپ کے لیے قانون خاص نافذ ہو تو ہو - ورنہ ہم تو اپنے ہی طور پر کارروائی کریں گے - مہاجن - خیر کیا مُضائقہ - جمعدار - آپ کا کچھ زیور تو ضرور گیا ہے - کیونکہ آپ کے چہرے پر مُردنی چھائی ہے - مگر دس ہزار تو خیر دو چار سو کا زیور ہوگا - شیخ جی - واہ - یہ اتنے بڑے مالدار اور دو چار سو روپے کے لیے اِس قدر افسردہ خاطر اور پژمُردہ ہوتے - کوئی رقم کثیر گئی ہے - جمعدار - بندہ نواز یہ لوگ زر کے بندے ہیں - ایک پیسا اگر ٹیٹ سے گر پڑے تو روٹی نہ کھائیں - مہاجن - یکے نقصانِ مایہ و دیگرے شماتتِ ہمسایہ - جمعدار - جی بجا ہے - مہاجن - افسوس صد افسوس ! شیخ - لالہ صاحب ہوئی تو غلطی آپ سے ضرور اِس میں شک ہی نہیں - لیکن خُدا بڑا مُسبّبُ الاسباب ہے - مہاجن - غلطی ! غلطی نہیں قبلہ - حماقت سرزد ہوئی - جمعدار - ہاں پھر ہے تو ایسا ہی - مہاجن - دس ہزار رقم کی رقم ہے - توبہ توبہ -

دو چار آدمیوں نے کہا اب ایک کام کیجئے - اُنسپکٹر”

صاحب سے جا کر کہیے۔ جمعدار صاحب تو گول مول آدمی ہیں۔ ہم کو بھی اِن سے پالا پڑ چکا ہے۔ خُدا بھلے مانس کو بچائے اِن سے۔ بد نہیں ہیں۔ مگر عقل جس وقت بٹی تھی۔ یہ غیر حاضر تھے۔ بس یہ بات ہے۔

جمعدار صاحب اور مہاجن تھانے پر آئے۔ پچاسوں آدمی پیچھے پیچھے ساتھ۔ تھانے پر اِنسپکٹر صاحب نے پوچھا۔ یہ بھیڑ کیسی ہے؟ کیا کوئی واردات ہو گئی؟

جمعدار۔ یہ ساہُوکار صاحب آئے ہیں۔ انسپکٹر۔ (شراب کے نشے میں چُور) ساہوکار بُردزنِ مانو بار۔ جمعدار۔ مست شاہ نے دھوکا دیا۔ انسپکٹر۔ مست شاہ۔ جہاں پناہ۔ خرد آگاہ۔ عالی جاہ۔ جمعدار۔ بہت ہی خُوب۔ لیجیے۔ حضرت اب اِنسپکٹر صاحب سے فریاد کیجیے۔ بندگی عرض ہے۔ اِنسپکٹر۔ عرض۔ یا غرض یا فرض یا قرض۔ یا کیا؟ ہائیں! جمعدار۔ رنگ ہے۔ رنگ ہے۔ ترنگ ہے۔ مہاجن۔ معقُول۔ بس اب کسی سے فریاد نہ کریں گے۔ اِنسپکٹر۔ پانی لاؤ۔ پانی۔ پانی لاؤ۔ پانی لاؤ۔ آب۔ آب۔ بیا۔ بیا۔ مہاجن۔ اب ہم تو چلتے ہیں۔ دس بارہ آدمیوں کو شہر بھر میں دوڑائے دیتے ہیں۔ اور دو چار آدمیوں کو ناکے پر اِدھر اُدھر۔ جمعدار۔ نہیں۔ اِنسپکٹر صاحب سے فریاد کیجیے نہ۔ اِنسپکٹر۔ پانی لاؤ (پانی پی کر) شُکر ہے۔

یہ کہہ کر تھوڑا سا پانی سر پر ڈالا - کانسٹبل - حضور ذرا لیٹ رہئے - دوسرا - اندر لیٹئے - صاحب آتے ہوں گے آج - کانسٹبل - ہاں سچ کہا - صاحب آنے والے ہیں آج اور حضور کی یہ کیفیت ہے - جمعدار - لاحول ولا قوۃ - انسپکٹر - ہونہہ - صاحب آنے والے ہیں - جمعدار - ہاں - آنے والے تو ہیں - انسپکٹر - آج تو جمعرات ہے جی - جمعدار - ہاں میاں سچ تو کہتے ہیں - آپ نے صحیح فرمایا - یہ مہاجن کیا کہتے ہیں - انسپکٹر - اِس وقت آپ ہی سُن لیجئے - میں سوتا ہوں ذرا -

مہاجن نے کہا اِنسپکٹر صاحب کے تو اِس وقت ہوش ٹھکانے نہیں ہیں - اب مجھے آزاد کیجئے تو خود کچھ فکر کروں - یہ کہہ کر تھانے پر سے چلے -

شہر بھر میں ہُلڑ مچا ہوا تھا کہ مست شاہ مال مار کے چل دیئے - رنگے سیار تھے - کوئی بولا بنے سدھ تھے - مگر جو حضرات ضعیفُ الاعتقاد مست شاہ کے مُعتقد تھے وہ یہی کہتے تھے کہ مہاجن لئے مرتا ہے - غلط کہتا ہے - اِن لوگوں کو شک کی جگہ یقین تھا کہ مست شاہ پر یہ شخص تہمت تراشتا ہے - لالہ ہرپرشاد سب سے زیادہ مُعتقد تھے - کئی آدمیوں سے لڑ پڑے -

منّو - بھلے کو ہم نہیں پھنسے - ہم سے بھی گہنا مانگا تھا - لالہ ہرپرشاد - چلو بس بکو نہیں - منّو - ہائیں! میں جھوٹ

تھوڑا ہی کہتا ہوں۔ لالہ۔ جھک مارتے ہو۔ شاہ جی خود کروڑوں روپیہ پیدا کر سکتے ہیں۔ خاں صاحب۔ کروڑوں تو خیر۔ مگر ہزاروں تو لے گئے۔ (اس پر قہقہہ پڑا)۔

لالہ ہر پرشاد نے کہا یہ بدگمانی ہے۔ آپ لوگوں کی محض بدگمانی۔ ایسا آپ کو نہیں چاہیئے۔ بے سمجھے بوجھے کسی درویش کو کچھ بُرا بھلا کہنا عقل کے خلاف ہے۔ مہاجن۔ درویش۔ درویش ہونہہ۔ رنگے سیار نہیں کہتے۔ درویش کہاں کے۔ بڑے فقیر تھے۔ درویش لئے پھرتے ہیں۔ فقیر ایسے ہی ہوتے ہیں کہ دس ہزار روپیہ لیا اور لمبے ہوئے۔ خاں۔ مگر حضرت آپ بھی پرلے سرے کے سیدھے آدمی ہیں۔ مہاجن ہو کر ایسا بھونڈا چکمہ کھا گئے! مہاجن۔ اِتفاق۔ خاں۔ دس ہزار کی رقم کثیر آپ نے ایک دم سے حوالے کر دی؟ ایک شخص نے آن کر یوں بیان کیا:۔

میں ناکے پر سے آتا ہوں۔ اِملی کا جو درخت ہے وہاں اُس کے سائے میں ایک فقیر بیٹھا تھا۔ تین چار آدمیوں سے باتیں کر رہا تھا۔ چپکے چپکے۔ وہ کہتے تھے کہ آدھا زیور تقسیم کر دے اور فقیر اِس پر راضی نہیں ہوتا تھا۔ میں چپکے چپکے سُنا کیا۔ جو مجھے یہ معلوم ہو کہ ذات شریف ڈاکوؤں کے بھی چچا ہیں تو میں گردن ناپوں۔ مگر اب یہ کیا معلوم تھا بھلا۔

ظہور بخش۔ نام بدل ڈالتا جو گنہگار نہ کرتا۔

مہاجن۔ ہائے ہائے! ظہور بخش۔ کیا کہیں مہاجن۔ قد کیسا تھا؟ ظہور۔ کیسا کیا معنی۔ میانہ قامت تھا۔ مہاجن۔ اور آنکھیں؟ ظہور۔ ازرق۔ مہاجن۔ بال؟ ظہور۔ بھورے جیسے انگریزوں کے ہوتے ہیں۔ مہاجن۔ بس وہی تھا۔ پہنے کیا تھا؟ ظہور۔ صندلی تہبند اور ڈنڈا ہاتھ میں تھا۔ مہاجن۔ چلو چوکی میں لکھو چل کر۔ ظہور۔ نا صاحب۔ جانے والے کو بھی کچھ کہتا ہوں۔ گواہی کون دے؟ وکیلوں سے کون لڑے؟ صدہا جھگڑے ہیں۔ اور دس بیس دن دوڑے کون؟ مہاجن۔ واہ! ظہور۔ بندہ رخصت می شود۔ مہاجن۔ کیا دل لگی ہے؟

لوگوں نے سمجھایا کہ سرقہ آدمی کا پولیس تک جاتے ہوئے بتانا مخفی ہے۔ ایک شخص کا دس ہزار کا نقصان ہوا اور تم کو ذرا ہمدردی نہیں۔

[illegible] چلو۔ [illegible] اور ظہور بخش کو ساتھ لے کر ناکے پر پہنچے۔ اور املی کے درخت کی طرف چلے تو [illegible] پوچھا کہاں چھپ بیٹھے تھے۔ ظہور بخش نے بتایا۔ سب کے سب ہاتھ [illegible] کر [illegible] گئے۔ پولیس کے ایک کانسٹبل نے کہا ہم پتا لگاتے ہیں۔

نُکّڑ پر بھنگ والے کی دُکان تھی وہاں جاکر دریافت کرنے لگے۔

کانسٹبل۔ یہاں کوئی فقیر آیا تھا؟ بھنگ والا۔ ہم کو تو معلوم نہیں صاحب۔ کانسٹبل۔ تم کتنی دیر سے یہاں بیٹھے ہو؟ بھنگ۔ ہم تو صاحب کئی برس سے دُکان رکھتے ہیں۔ کانسٹبل۔ نہیں بھئی۔ تم ڈرتے کیوں ہو جی؟ بھنگ۔ ہاں ڈرتے تو ہیں۔ کانسٹبل۔ تم تو سودائی ہو گئے۔ تم سے کیا واسطہ؟ تم صاف صاف حال بتا دو۔ بھنگ۔ ہم کو بچا لینا۔ اور بھائی کچہری نہ جانا پڑے۔ کانسٹبل۔ اجی کہو بھی۔ بھنگ۔ کوئی دو گھنٹے ہوئے ہوں گے کہ یہاں دُکان پر آکر بیٹھے تو مجھ سے بھنگ مانگی۔ میں نے گاڑھی گاڑھی بھنگ اچھی گھُٹی ہوئی تھی۔ بنا کر دی۔ دُودھیا۔ اور کالی مرچیں پڑی ہوئی تھیں۔ اور شکر ڈالی تھی صاف شکر۔ شاہ گنج کی۔ پی اور پی کر کہا۔ بچّہ تم اچھے آدمی ہو۔ ایک کوڑی مجھ کو دی۔ میں نے لی تو ہنسے۔ کانسٹبل۔ کوئی اور بھی تھا اُن کے ساتھ؟ بھنگ۔ ہاں تین آدمی تھے۔ کانسٹبل۔ اُنھوں نے بھی پی تھی؟ بھنگ۔ ہاں سب نے۔ کانسٹبل۔ اچھا پھر؟

بھنگ والے کی دُکان پر ایک مزدور بیٹھا تھا۔ اُس نے بیان کیا کہ مست شاہ نے یہاں سے بھنگ پی۔ سامنے

حلوائی کی دُکان پر گئے ۔ اور مست شاہ کا ایک ساتھی چار پائی پر لیٹا ۔ پھر نہیں معلُوم کہ وہ لوگ کدھر گئے ۔ حلوائی سے پُوچھا ۔ کانشٹبل کی صُورت دیکھتے ہی حلوائی کے ہاتھ پاؤں پُھول گئے ۔ پہلے تو حلوائی نے صاف اِنکار کیا ۔ ہمیں نہیں معلُوم ۔ ہم نہیں جانتے وانتے ۔

کانشٹبل ۔ (ڈانٹ کر) بول ۔ بول ۔ نہیں لے چلونگا ۔ تھانے پر وہاں آٹے دال کا بھاؤ معلُوم ہو جائے گا ۔ حلوائی ۔ اب لے ہماری دُکان پر جانے کون کون آتا ہے ۔ ہم کُچھ کسی کو پہچانتے رہتے ہیں ۔ مہاجن ۔ تم ڈرتے کیوں ہو؟ حلوائی ۔ ہم سے مطلب کیا؟ آپ ہی بتائیں ۔

اتنے میں بھنگ والا آیا ۔ اُس نے حلوائی کو سمجھایا ۔ تب حلوائی نے یوں بیان کیا:۔

بھنگ پی کر بُھوک لگی تو ہماری دُکان پر آئے ۔ مٹھائی کھائی ۔ چار آدمی تھے ۔ ایک کوئی شاہ جی تھے اور تین اور ۔ مگر تینوں نے مِلکر ڈیڑھ سیر لڈّو اور تین سُہال برفی کے ساتھ کھائے ۔ ایک آدمی لیٹ رہا ۔ تھوڑی دیر کے بعد کیا جانے کہاں چلدیئے ۔

کانشٹبل ۔ تم کو کیا دیا؟ حلوائی ۔ ہم کو دو رُوپے دیئے ۔ کانشٹبل ۔ تم کو معلُوم ہے کہاں گئے؟ حلوائی ۔ کُچھ نہیں ۔ گئے کہاں

نہیں گئے کہاں - ہم کو کیا معلوم ؟

ایک محرّر نے جو صیغۂ تعمیرات کی طرف سے وہاں مقرّر تھا کہا کہ باہم وہ لوگ باتیں کرتے تھے کہ شاہ فصیح کے تکیے چلو - وہیں گئے ہونگے - کانسٹبل اور مہاجن شاہ فصیح کے تکیے چلے -

مہاجن - دیکھیں پتا ملتا ہے یا نیبو نون ہی چاٹ کر رہ جاتے ہیں - اب تک حال معلوم ہوتا گیا - اب نہیں معلوم کہ آیندہ بھی پتا ملے یا نہ ملے - مشکل ہے ذرا - آسان نہیں اور جو شاہ فصیح کے تکیے پر سب کے سب رل جائیں تو واہ واہ - کانسٹبل شاہ فصیح کے تکیے کا پتا جانتا تھا - باتیں کرتے ہوئے چاروں کانسٹبل اور مہاجن اور ظہور بخش اور دو چار آدمی اور بے فکر چلے -

اثنائے راہ میں مہاجن کا بھائی اور سالا اور بیٹا اور دوست ملے - گاڑی پر سوار آرہے تھے اُتر پڑے - مہاجن سے باتیں ہونے لگیں -

"ہم تو آج بڑی آفت میں پڑ گئے" "کیا بتائیں - یہ کیا سوجھی کیا ؟ ہم ہوتے تو اُس فقیر کی گردن ناپتے - اور کچھ اُسی سے اینٹھ لیتے" "اچھا پھر اب تو ہوا سو ہوا" "یہ کیمیا بنانے کا خبط آپ کو دامن گیر ہے - اِس کا علاج اچھا ہوا - جو

دس ہزار کھو کر بھی آپ کو کیمیا کا خبط نہ رہے تو ہم سمجھیں کہ آپ اچھے رہے۔ گرو ملا۔ لے تو گیا دس ہزار مگر سبق اچھا سکھا گیا۔ اب نہ بھولیں گے۔" "دیکھے نقصانِ مایہ۔ دیگر شماتتِ ہمسایہ"۔ "یہی تو ہے ہی"۔

الغرض مہاجن نے کہا کہ شاہ فصیح کے تکیے کا پتا لگا ہے۔ اُن لوگوں نے کہا گاڑی پر بیٹھ لیجئے اور کانسٹبلوں کو بھی بٹھا لیجئے۔ ہم کرایے کی گاڑی پر ابھی آتے ہیں۔ مہاجن بیٹھے۔ دو کانسٹبل اندر بیٹھے۔ دو باہر۔ گاڑی پر تھوڑی دیر میں لالہ صاحب شاہ فصیح کے تکیے پہنچے۔ اِدھر اُدھر دیکھا تو سناٹا۔ ایک مقام پر آٹھ دس آدمی بیٹھے جوا کھیل رہے ہیں۔

کانسٹبل۔ اِدھر آؤ۔ ایک آدمی۔ حبشی۔ کہو۔ کیا ہے کیا؟

کانسٹبل۔ اِدھر آؤ تقریریں نہ کرو بہت۔ حبشی۔ کیا؟ مہاجن۔ اِدھر آؤ جی۔

دوسرے کانسٹبل نے حبشی کا ہاتھ پکڑا اور گھسیٹ لایا۔ تیسرے کانسٹبل نے اور دو آدمیوں کو گرفتار کیا۔ پوچھا۔ بتاؤ یہاں کوئی فقیر آیا تھا۔ اگر سچ بتا دوگے تو ہم تم کو چھوڑ دیں گے۔ ورنہ جوے کی علت میں دھرے جاؤگے۔

حبشی۔ تو کیا بتائیں کیا؟ کچھ پوچھو تو بتائیں۔ کانسٹبل۔

کوئی فقیر یہاں آیا تھا اِس وقت؟ حبشی آیا ہوگا۔ کانسٹبل۔ نہ بتاؤ گے؟ حبشی۔ ہم تو جوا کھیلنے میں مصروف تھے۔ دیکھا کس نے؟ کانسٹبل۔ اچھا اِن دونوں سے پوچھو۔ ایک۔ صاحب ہم کچھ نہیں جانتے۔ دوسرا۔ ہم نے کوئی فقیر وقیر نہیں دیکھا یہاں۔ کانسٹبل۔ نہیں دیکھا تو نہ سہی۔ لے چلو جی تھانے پر۔ ایک۔ چلو۔ دوسرا۔ چلنے کو چلیے۔ مگر۔ کانسٹبل۔ مگر کیا۔ یہ مگر کیا معنی؟ اِس نے صاف صاف یوں بیان کر دیا۔

"ایک فقیر ابھی اِس وقت آیا تھا۔ اور اُس کے ساتھ تین آدمی اور تھے۔ یہاں آن کر چرس کے دم لگائے۔ گنڈیریاں کھائیں۔ بیٹھے۔ حقہ پیا۔ داؤں لگائے۔ آٹھ روپیہ ہارا۔ تھوڑی دیر کے بعد پھر آیا۔ پھر جوا کھیلا تو چھ روپیہ جیتا۔ چلا تو دو کی بار میں۔"

کانسٹبل نے پوچھا گئے کس طرف؟ کہا یہ ہم کو نہیں معلوم ہے۔ مگر کہتے تھے کہ گمٹ گنج جاتا ہوں۔ اِس پر اُس کے ساتھیوں نے بھی کہا کہ ہاں چلو اور آج رات کو وہیں رہو۔ کانسٹبل۔ بھلا اُن تینوں میں کسی کو پہچانتے بھی ہو؟ ایک۔ نہیں۔ دوسرا۔ ہم بتائیں۔ ہم سے پوچھو نہ۔

کانسٹبل اور مہاجن اور ظہور بخش اور دس پانچ بیٹھ کر کے

ٹکیت گنج جانے ہی کو تھے کہ مہاجن کے اعزہ آن پہنچے۔ پوچھا۔ کچھ پتا لگا؟ مہاجن نے کہا بس کچھ نہ پوچھئے۔ ناکے پر گئے وہاں سناٹا۔ شاہ فصیح کے تکیے پر ملیں گے۔ یہاں آئے۔ اب لوگ کہتے ہیں کہ ٹکیت گنج گئے ہیں۔ وہاں بھی جاتے ہیں۔ ہم تو بس اسی کے ہو رہے۔ کریں کیا؟ خود کردہ را چہ علاج؟ جیسا کیا ویسا اب بھگتیں گے۔ از ماست کہ بر ماست

الغرض وہ لوگ گھر چلے گئے۔ خدمتگار اور گاڑی ان کے لئے چھوڑ دی۔ تھوڑی دیر میں لالہ صاحب ٹکیت گنج پہنچے۔

کانسٹبل۔ (ایک کسان سے) یہاں کوئی فقیر آیا تھا اس وقت؟

مہاجن۔ صندلی کپڑے پہنے تھے۔ کسان۔ ہم ناہیں دیکھا صاحب۔

کانسٹبل۔ (ایک عورت سے) نیک بخت! کوئی فقیر تو ادھر سے نہیں جاتا تھا؟ عورت نے کچھ جواب نہیں دیا۔ کانسٹبل نے آگے بڑھ کر ایک درزی سے پوچھا۔ کہو میاں خلیفہ! شاہ جی تو ادھر سے نہیں گئے تھے اس وقت؟ خلیفہ نے کہا میں نے دیکھا نہیں۔ ہم سیئیں اپنا کہ لوگوں کو دیکھتے پھریں؟

مہاجن۔ یہاں پتا لگنا مشکل ہے۔ کوئی بتاتا ہی نہیں۔

کانسٹبل۔ دیکھئے تو جائیے ہم پتا لگاتے ہیں۔ ایسی بات ہے بھلا کہ مفت کی رٹ ہو۔ مہاجن۔ کچھ نہیں بیکار ہی ہوا آنا۔ مگر پہلے کیا معلوم تھا یہ۔

کانسٹبل دس بارہ قدم اور بڑھا تو دیکھا کہ ایک دروازے پر
دو آدمی بیٹھے ہیں ایک حقہ پیتا ہے۔ دوسرا کچھ سیتا ہے۔ قریب
جاکر کہا۔ یہاں اِس وقت ایک شاہ جی آئے تھے؟ وہ مجرم
ہیں۔ ایک مخبر نے 'رپٹ' بولی اور تمھارا نام لیا اور کہا تم
نے اُس کو چھپا رکھا ہے۔ بس تم بھی مجرم ہوگئے۔ خبردار جو
یہاں سے اُٹھے ہوگے۔ تہور خاں! تہور خاں! (ایک اور
کانسٹبل کا نام تھا) چلے آؤ سب کے سب۔ جو آدمی حقہ
پی رہا تھا اُس سے پوچھا تمھارا کیا نام ہے؟ اُس نے کہا
شیو بخش۔

کانسٹبل۔ کیا پیشہ کرتے ہو؟ ٹھیک بتانا مگر۔ شیو بخش۔
پٹواری گری۔ باپ دادا کے وقت سے ہوتی آئی ہے۔
کانسٹبل۔ زنانہ مکان ہے یا مردانہ؟ شیو۔ مردانہ ہے یہاں۔
کانسٹبل۔ کھولو ہم تلاشی لیں گے۔ ابھی کھولو اِسی دم۔ تم
مجرم ہو۔ شیو۔ دروازہ بند ہے اور آدمی گیا ہے دودھ لانے
کانسٹبل۔ تم خود کھولو۔ شیو۔ کھولنا دشوار ہے۔ ذرا دیر
توقف کرو۔ مہاجن۔ تمھاری سازش پائی جاتی ہے۔ شیو۔
صاحب! سرکاری نوکر ہم بھی ہیں۔ ہم کسی شاہ جی واہ
جی کا جانت ناہیں۔ اور تاوقتیکہ وقفیت نہ ہو کچھ کہے
سُننے سے کیا فائدہ۔ کانسٹبل۔ اب باتیں تو ہوا کریں گی

کل تک - پہلے شاہ جی کا پتا بتاؤ کہ کہاں چھپا آئے ہو؟

شیو - جو ہم چھپا آئے ہوں تو دونوں آنکھیں پھوٹ جائیں -

کانسٹبل - اچھا پھر پتا تو لگاؤ -

جو آدمی بیٹھا سُن رہا تھا اُس نے کانسٹبل کی طرف غور سے دیکھا اور کہا آخر کیوں پوچھتے ہو بھئی جوان؟ کانسٹبل نے کہا کام ہے - ہمیں بتا دو - انعام ملے گا - کہا اچھا کپڑے سینے میں تو کچھ ملتا نہیں - اب مخبری کیا کریں گے - کانسٹبل اور ظہور بخش اور مہاجن وغیرہ درزی کے ساتھ چلے - درزی پہلے تو ایک گڑھیا کی طرف گیا - وہاں سے کترا کر ایک ٹیلے پر پہنچا - وہاں سے نیچے اُترا - تھوڑی دُور پر ایک پرانی اور گری پڑی مسجد میں لے جا کر کہا بس اب یہیں ڈھونڈھ لو - کانسٹبل نے اِدھر اُدھر دیکھا تو یوں کہا -

کانسٹبل - اِدھر آؤ - اِدھر آؤ - دوسرا کانسٹبل - کیا پایا - پایا؟ مہاجن - کہاں ہے - کہاں ہے؟ ذرا کہیں سے چراغ تو لے آؤ - کانسٹبل - ارے یار کپڑے رکھے ہیں یہاں مہاجن - باہر نکال لاؤ - دوسرا کانسٹبل - کپڑے ہی ہیں یا کوئی آدمی بھی ہے؟ دیکھو تو غور سے - تیسرا - آدمی کا پتا ہی نہیں - ہاں کپڑے البتہ رکھے ہیں - ظہور - بھاگ گئے - ہائے

افسوس! بھاگ گئے - ایک بے فکرا - ابھی وہ چمپت ہوئے - ظہور - اب پتا مل چکا - کانشٹبل - یہ نہ کہو - برسوں کے بھاگے ہوئے مجرم تو ہم نے گرفتار کئے - ایسی بات ہے بھلا - ظہور - ہاں - اقبال سرکار کا -

چراغ روشن کرکے ظہور بخش اور دو کانشٹبلوں نے چو طرفہ دیکھا - دو مٹی کے حقے - دو توے - آدھ پاؤ تمباکو مشکبو - ایک تہبند - ایک ٹوپی - دو چادر - ایک لٹھ - چھ آنے پیسے - یہ سامان ملا - سمجھ گئے کہ وہ لوگ یہاں بیٹھے حقہ پی رہے تھے - کانشٹبلوں کو دیکھ کر چمپت ہوئے - مگر استعجاب تھا کہ اس قدر جلد بھاگ کہاں گئے ؟

ظہور - مگر خدا کی قسم خوب پتا ملا - لیکن اب دشوار ہے - کانشٹبل - ہاں یہ نہیں معلوم ہوسکتا کہ یہاں سے کہاں گئے - دوسرا کانشٹبل - مگر پکڑا ضرور جائے گا - بھاگے گا کب تک ؟ مہاجن - دیکھئے - اگر گرفتار ہوجائے اور ہمارا زیور بھی ملے تو کیا پوچھنا ہے - پو بارہ ہیں - ظہور - ہم کو کیا دلواؤگے ؟ مہاجن - دو سو روپے - ظہور - ہاں خدا کرے مل جائے - خدا کرے اسی دم پتا لگے - خوب گل چھرے اڑیں

کانشٹبلوں نے اِدھر اُدھر دیکھا تو ایک جھوپڑا نظر آیا - سب کے سب اُس طرف چپکے چپکے باتیں کرتے چلے -

مہاجن - اِس میں تو کیا چھپتے بھلا - ایسے کچے تھوڑا ہی ہیں کچھ - ظہور - لا حول و لا قوۃ - وہ سب کے سب چوروں کے اُستاد ہوں گے - کانسٹبل - چھپے تو یہاں کیا ہوں گے - مگر شاید کچھ پتا ملے - کوئی شناخت کی چیز مل جائے - جیسے یہ لٹھ مِلا - یا چادر ملی - مہاجن - ایک آدمی جاے پہلے - مگر لٹھ لے کر - خالی نہیں - کانسٹبل - میں جاتا ہوں - لٹھ مجھے دیدو - دیکھو تو سہی - دُوسرا - جُوتا تو اُتار ڈالو - رپ رپ کی آواز تو نہ آئے - کانسٹبل - اچھّا - لو اُتار ڈالا -

لٹھ لے کر کانسٹبل جھوپڑے کے پاس پہنچا - اور غور سے دیکھنے لگا - دُوسرا کانسٹبل بھی آہستہ آہستہ قریب گیا - اور چپکے سے پوچھا - کوئی ہے ؟ اُس نے کہا کیا معلوم - ذرا ٹھہرے رہو - اتنے میں لالہ صاحب بھی چلے - ظہور بخش بھی بڑھے - تھوڑی دیر تک غور کیا کئے - اِس کے بعد جھوپڑے کو گھیر کر غُل مچایا - نکل آ - نکل آ - نکل آ - نہیں حلال ہی کر ڈالوں گا - جھوپڑے میں سے آواز آئی - کون ہے بابا - ہم غریبوں کو کیوں ستاتا ہے - ہم نے تیرا کیا بگاڑا ہے ؟ کانسٹبل - کون ہے تو ؟ فقیر - ہم درویش ہیں بابا - (فقیر باہر آیا) - کانسٹبل - ارے یہ تو بھیک مانگتا ہے - ظہور - تم باکمال درویش ہو نہ جی - کیوں ؟ فقیر - کیا ؟

میں تو بھیک مانگ کھاتا ہوں۔ کانسٹبل۔ کس طرح بھیک مانگتے ہو؟ فقیر۔ دو گھڑی دِن رہے سے جاتا ہوں اور چکّر لگاتا ہوں۔ کانسٹبل۔ مانگتے کیا کہہ کر ہو؟ فقیر۔ کچھ جی میں آئے سائیں کو نذرِ اللہ دو۔ اِس کا نفع خُدا سے لو۔ بھر دے مالک۔ بھر دے۔ بھر دے مولی۔ بھر دے۔ مہاجن۔ ارے اخّاہ۔ یہ یہاں رہتا ہے۔ کانسٹبل۔ کیا آپ جانتے ہیں اِس فقیر کو؟ مہاجن۔ روز روٹی پاتا ہے ہمارے ہاں سے شام کو۔ فقیر۔ کہاں پر مکان ہے بابا؟ مہاجن۔ کٹاری ٹولے میں۔ پھاٹک کے اندر۔ چھتّے کے پاس بڑا مکان۔ فقیر۔ ہاں بابا۔ وہ مکان جہاں پُلّاس باری نوکر ہے نہ؟ میں جانتا ہوں۔ مہاجن۔ ہاں۔ ہاں۔ وہی وہی۔ کانسٹبل۔ اچھا سائیں بتاؤ یہاں اِس وقت کوئی آیا تھا؟ فقیر۔ ہاں بابا۔ ظہور۔ کون آیا تھا؟ فقیر۔ وہ فقیر ہیں ایک مستان شاہ۔ کیمیا بنانے کا بہت شوق ہے۔ وہ تھے اور اُن کے ساتھ دو چار اور بد معاش تھے۔ مہاجن۔ پھر کب تک بیٹھے؟ فقیر۔ یہ تو نہیں معلوم بابا۔ مہاجن۔ کیا کرتے رہے؟ فقیر۔ بابا۔ یہاں مسجد میں بیٹھ کر حُقّہ پیا۔ چبُوترے پر بیٹھے رہے۔ افیم پی۔ پونڈا چھیلا۔ کھایا۔ کچھ باتیں کیں۔ مجھ سے آگ مانگ لے گئے۔

اور دو پیسے دیئے۔ اور میں نہیں جانتا۔ کانشٹبل۔ باتیں کیا کرتے تھے؟ فقیر۔ یہی کچھ سونے کی باتیں تھیں۔ سونے کے کڑے کے دام پر بحث تھی۔ ایک کہتا ہے پانچ سو کا ہے۔ دوسرا کہتا تھا چار سو کا ہے۔ مہاجن۔ ہائے افسوس۔ اُف! ظہور۔ نکل گئے ہاتھ سے۔ مہاجن۔ کمال افسوس ہوا۔ ظہور۔ ہائے جو ذرا پہلے آئیں تو گرفتار کرلیں۔ فقیر۔ کیا بابا کچھ چوری کی تھی؟ مہاجن۔ ہاں چوری کیا! لوٹ لیا۔ بیڑا کیا۔ فقیر۔ ہاں! کیا مال تھا؟ وہی کڑے ہونگے سونے کے۔

مہاجن نے فقیر کے قدموں پر ٹوپی رکھ دی اور کہا۔ سائیں! تم کو اُن روٹیوں کی قسم جو برسوں سے تم ہمارے ہاں سے پاتے ہو۔ سچ سچ بتا دو۔ وہ لوگ کدھر گئے؟ فقیر نے کہا جو مجھکو اُن کا اور کچھ حال ذرا بھی معلوم ہو تو آنکھیں ہی پھوٹیں۔ میں چھپاتا کیوں؟ مگر یہاں ایک بیلدارن رہتی ہے اُس کے یہاں بھی ایسے بدمعاش جمع ہوا کرتے ہیں۔ اُس سے آپ پوچھئے تو شاید کچھ پتا لگے۔

ظہور۔ وہ بیلدارن جو ممو خاں سے لڑی تھی؟ فقیر۔ نہیں بابا یہاں کوئی چھ مہینے سے رہتی ہے۔

مہاجن اور کانشٹبل اور ظہور بخش اِس فقیر کو لیکر چلے۔ تھوڑی دیر میں بیلدارن کے مکان پر پہنچے۔ فقیر نے

کہا۔ اب میں جاتا ہوں۔ جو اُس کو معلوم ہو جائے گا کہ سائیں ساتھ لائے تھے تو کل ہی میرا جنتر پھونک دے گی۔

ظہور۔ اچھا تم جاؤ۔ مہاجن۔ کھولو۔ دروازہ کھولو۔ ظہور۔ بلند آواز سے کہو۔ مہاجن۔ کھولو۔ دروازہ کھولو۔ کوئی ہے اس مکان میں؟ بیلدان۔ ارے ہو کون تم؟ مہاجن۔ ہم ہیں بیلدارن۔ ہم کا نام بھی کچھ ہے۔ یا بس ہم ہی ہم۔ نام بتاؤ۔ مہاجن۔ نور خاں! بیلدارن۔ کہاں سے آئے ہو؟ کس کے پاس آئے ہو؟ مہاجن۔ اجی ہمیں مست شاہ نے یہاں بلایا تھا۔ پتا پوچھتے پوچھتے ہزار خرابی سے مکان ملا۔ بیلدارن۔ وہ تو ابھی ابھی یہاں سے گئے۔ مسجد کے چبوترے پر ہونگے۔ کیا آؤ گے۔ کھولوں؟ مہاجن۔ ہاں۔ ہاں۔ حقہ وقہ نہ پلواؤ گی کیا؟ بیلدارن۔ ٹھہرو آئی۔

مہاجن بشاش۔ کانسٹبل خوش۔ ظہور بخش شاداں کہ اب پتا ملا۔ اب مست شاہ بھاگ نہیں سکتے۔ بھاگ کر جائیں گے کہاں؟ بیلدارن نے منہ دھویا۔ گلوری بنائی۔ کھائی۔ کپڑے بدلے اور دروازہ کھول کر کہا۔ وہ یہاں نہیں ہیں۔ تم حقہ پی لو تو میں بتا دوں کہاں گئے ہیں؟ دروازہ کھولنا تھا کہ مہاجن تڑ سے اندر داخل ہوئے۔ بیلدارن نے مہاجن کو دیکھا تو دھک سے رہ گئی۔ ع۔ کاٹو تو لہو نہیں بدن میں۔ بیلدارن۔ تم کون ہو جی؟ مہاجن۔ بندۂ خدا۔ بیلدارن

یہاں کیا کام تھا؟ مہاجن - یوں ہی چلے آئے - حقہ پلاؤ - بیلدارن - مسلمان ہو؟

مہاجن کی سٹی بھولی کہ اب کہیں کیا - چپ - بیلدارن نے کہا بس چلیے - ہوا کھائیے - نہیں میں غل مچاؤنگی - واہ! اچھے آئے - پرائے مکان میں دھوکا دے کر تم کون ہو آنے والے جی؟

مہاجن - مست شاہ نے بلایا تھا - اُن کے کہنے سے آئے - بیلدارن وہ مست شاہ کون ہیں؟ ہم نے تو نام بھی نہیں سنا -

اتنے میں کانسٹبل اور ظہور بخش بھڑ بھڑا کر اندر داخل ہوئے - تب تو بیلدارن کے حواس غائب ہوئے کہ اب بچنا مشکل ہے - بڑا چکمہ دیا - افسوس ہے ہاتھ ملکر کہا تم لوگوں نے مجھے بڑا دھوکا دیا - مگر اچھا کچھ ہرج نہیں -

کانسٹبل - بتاؤ مست شاہ کہاں ہے؟ بیلدارن - کون - کون شاہ - دوسرا مست شاہ - بیلدارن - ڈھونڈھ لاؤ بتادوں - تیسرا - سنا - یہ کھلی بازی رہنے دینا اس وقت - بتا کہاں ہے - بیلدارن - نام بھی نہیں سنا میں نے - ظہور - ایں! پہلے تو کہا مسجد میں جاؤ - ابھی آئے تھے - مسجد کی طرف گئے ہیں اور اب باتیں بناتی ہے - بیلدارن - کیا مار ڈالوگے؟ ظہور - جو بتادے گی تو بچ جائے گی - نہیں بھیج دی جائے گی - چودہ برس کو - بیلدارن - اُہنہ - اُہنہ

[illegible] منہ بند [illegible] کانسٹبل - بڑی ٹرّی ہے - بیلدارن کیوں کیا تمہارے یاں [illegible] - کچھ وجہ ؟ کانسٹبل - لے چلو جی ساتھ [illegible] - بیہودہ بات - چلو - تم ہمارے گھر میں سے ایک کوڑی [illegible] تو ہم نالش کرکے بھر لیں گے -

مہاجن نے کہا - سنو - ان باتوں سے تو کچھ مطلب نہ نکلے گا - سمجھی ؟ تم یہ چاہو کہ ہم تو چھوڑ دیں - یہ محال ہے - صرف اتنا بتا دو کہ وہ گئے کس طرف ؟ بس اور کچھ نہیں - بیلدارن - ہم نہیں جانتے - مہاجن - تو پھر پہلے کیوں قبولا تھا ؟ بیلدارن - اب ہمارے مکان سے جاؤ - باہر ٹھہرو اور میں اب چلتی ہوں -

کانسٹبل نے کہا - سنو جی - آؤ اِس کے مکان کی تلاشی تو لیں - یہ کرے گی کیا ؟ غُل ہی مچائے گی تو آواز یہاں سے کہیں نہ جائے گی - نالش کرے گی - ہم کہہ دینگے جھک مارتی ہے - لئے مرتی ہے - غلط بکتی ہے - بُہتان ہے - یہ کہہ کر کانسٹبلوں نے تلاشی لینا شروع کی - بیلدارن نے بہت کچھ غُل غپاڑا مچایا - مگر بے سُود - تلاشی لیتے لیتے ظہور بخش نے کہا - یہ کیا ہے ؟ یہ کیا ہے میاں ؟ دیکھا تو سونا -

مہاجن - دیکھوں دیکھوں - یہ تو سونا ہے جی ؟ ظہور - جی ہاں یہ دیکھئے - کانسٹبل - یہ کہاں سے لائی تو ؟ تیری یہ حقیقت

کہ سونا تیرے مکان سے نکلے!

بیلدارن نے چمک کر سب کو گالیاں دینا شروع کیں۔ واہ! کیا خوب! میری کچھ حیثیت ہی نہیں اِن کے نزدیک۔ ذری سا سونا گھر میں پڑا تھا۔ وہ اُٹھا لیا اور لگے ڈانٹنے۔ اِن دھمکیوں میں کوئی اور آتی ہونگی۔ بس اب ہاتھ نہ لگانا کسی شئے کو۔ نہیں مجھ سے بُری کوئی نہیں۔ واہ! کانشٹبل نے جھلّا کر ایک لات لگائی۔ مُردار۔ ایک تو شرماتی نہیں۔ دُوسرے اُوپر سے غُرّاتی ہے۔ اور باتیں بناتی ہے۔ ہٹ الگ۔ بیلدارن خاموش ہورہی۔ سوچی کہ اب بولی تو اور پِٹونگی۔ مہاجن نے کہا یہ تو کڑے کا ٹُکڑا ہے۔ ہائے ہائے! لو صاحب۔ حِصّے بخرے بھی ہوگئے۔ افسوس! یہ اِس قدر ٹکڑا اس کے ہاتھ آیا۔ کانشٹبل نے پُوچھا۔ کیا آپ ہی کا ہے؟ مہاجن نے کہا۔ جی ہاں۔ کمبخت ہی کا زیور ہے۔ افسوس! کمال افسوس کا مقام ہے۔ مگر خیر۔ جو ہوا وہ ہوا۔ اب اگر کچھ بھی عدد مل جائیں تو میں ہزار غنیمت سمجھوں اور لاکھ شُکر بھیجوں۔

ظہور۔ بتادو بیلدارن! بتادو۔ تم سے تو کوئی واسطہ ہی نہیں ہے۔ مست شاہ دھرے جائیں گے یا تم دھری جاؤگی؟ اتنا تو سوچو۔ صاف صاف بتادو تو ابھی ابھی چھوڑدیں۔ کانشٹبل

بس اتنا بتا دو کہ گئے کہاں وہ سب ؟ بیلدارن - اچھا قسم
کھاؤ - کانشٹبل - کس بات کی ؟ بیلدارن - اِس بات کی کہ
تم میرا سونا مجھے دے دوگے - کانشٹبل - لاؤ جی - لو - سونا
اپنا اپنے پاس رکھ لو - بس - اب تو بتا دو - یا اب بھی نہ
بتاؤگی ؟ لے بتاؤ - اب بولو - بیلدارن - اچھا اِس طرف
آؤ - کونے میں بتادوں - مگر ایک ہی آدمی جانا وہاں -
فقط رنگ ڈھنگ دیکھ آنا - کانشٹبل - اِس کے کیا معنی ؟
تم ساتھ چلو اور چلکر بتاؤ - بیلدارن - اچھا سُن لو - کانشٹبل -
بولو - بیلدارن - وہ جہاں گوڑیا بیٹھی جاتی ہیں - وہاں پر
ایک بُوڑھی رہتی ہے - اُس کے مکان پر جائیے اور کہئے
ہم کو مست شاہ نے بُلایا ہے - ہمارا نام عابد علی ہے - وہ ہمارے
سالے ہیں - عورت دروازہ کھول دے گی - بس - ظہور -
ہم کو اِن کے کہنے کا یقین نہیں آتا - سب غلط بتایا -
بیلدارن - اچھا پھر ہم لاچار ہیں - جو بات تھی وہ کہہ دی -
جاکے دیکھ لو - بات ہی کیا ہے - دو قدم پہ تو یہاں سے ہے
تین کانشٹبل اور مہاجن گئے - ایک کانشٹبل اور ظہور
بخش بیٹھے رہے - بیلدارن نے سونا اپنے پاس رکھا - اور کہا - اب
پکڑے لئے جائیں گے - چوراہے پر جہاں گوڑیا بیٹھی جاتی تھیں -
سب کے سب پہنچے - اب بوڑھی کا مکان کیوں کر ملے ؟

ایک عورت پانی بھر کے لاتی تھی۔ اس سے کانسٹبل نے پوچھا یہاں بوڑھی کا مکان کون ہے؟ اس نے کہا کون بوڑھی بڈھی بڑھیا؟ کانسٹبل نے کہا۔ نہیں وہ نہیں۔ بوڑھی عورت۔ عورت نے مسکرا کر کہا۔ بوڑھی نہیں وہ جوان ہے۔ اس کا نام بوڑھی ہے۔ یہ مکان ہے سامنے والا۔ اس مکان کے دروازے پہ جا کر کانسٹبل نے کہا کھولو۔ دروازہ کھولو۔ جھٹ پٹ۔ اندر سے کسی نے کہا۔ کون ہے؟

کانسٹبل۔ ہم مست شاہ کے پاس آئے ہیں۔ (مہاجن سے) کیا نام بتایا؟ اجی! اس وقت نام ہی بھولے جاتے ہیں۔ مہاجن۔ بھلا سا نام تھا۔ دوسرا کانسٹبل۔ حامد علی۔ مہاجن۔ عابد علی۔ عابد علی۔ خوب یاد آیا۔ (پھر کسی نے پوچھا۔ کون ہے؟) مہاجن۔ عابد علی۔ پوچھا کہاں آئے ہو؟ کہا۔ مست شاہ کے پاس۔ کس نے بلایا ہے؟ کہا مست شاہ نے۔ پوچھا۔ تم ان کو کیونکر جانتے ہو؟ کہا ہمارے سالے ہیں۔ دروازے کے پاس آن کر ایک عورت نے کہا۔ وہ آئے تھے مگر چلے گئے۔ کچھ معلوم ہے تم کو؟ کچھ خوشخبری تھی یا نہیں؟ مہاجن۔ ہاں ہاں۔ معلوم نہیں یوں ہی۔ ہم کو اور نہ معلوم ہو۔ عورت۔ کیا معلوم ہے؟ مہاجن۔ وہی زیور والا معاملہ۔ اسی کے واسطے تو بلایا تھا۔ عورت۔ ہاں۔

بڑی رقم ہاتھ لگی۔ مہاجن۔ کھولو تو دروازہ۔ یہاں کب تک کھڑے رہیں؟

عورت نے دروازہ کھولدیا۔ مہاجن اور کانسٹبل فوراً سب کے سب اندر گھس پڑے۔ عورت دنگ ہوگئی۔ چپ چاپ۔ کانسٹبل نے کہا سچ بتاؤ مست شاہ کہاں چھپے ہیں؟ عورت نے کہا آئے تو تھے یہاں اور ان کے ساتھ دو چار اور بھی آدمی تھے۔ مگر ریل گھر گئے ہیں۔ کہیں باہر نہ۔ مہاجن نے کہا یہ عورت سیدھی سادی بھولی بھالی معلوم ہوتی ہے۔ وہ بیلدارن البتہ بڑے کاٹے پھانس کی عورت ہے۔ گھنٹوں تتولی ہی نہیں۔ ایسی شریر۔ مگر اس بیچاری نے ترت سے بتا دیا۔ اب ٹھیک ٹھیک بتاؤ۔ کیا حال ہے؟ مست شاہ کہاں ہیں؟ ریل گھر گئے یا کہیں اور؟ کانسٹبل نے کہا۔ اگر صاف صاف کہدیں گی تو اچھا۔ ورنہ بھگتیں گی۔ اس میں شک ہی نہیں۔ ہم فقط اتنا کہہ دیں گے کہ مست شاہ کو اس کے گھر میں دو آدمیوں نے دیکھا تھا۔ چلئے گواہی دلوادی۔ دھر لی گئیں۔ عورت نے کہا۔ کہتی تو جاتی ہوں کہ ریل گھر گئے۔ پھر اب کیونکر کہوں؟ سب نے ملکر مشورہ کیا۔ یا الٰہی۔ کیا مصیبت ہے۔ گھر سے تھانے پر آئے۔ وہاں سے تانگے گئے۔ وہاں سے

شاہ فصیح کے تکیے ۔ وہاں سے ٹکیت گنج ۔ پھر بیلدارن کے ہاں ۔ وہاں سے یہاں ۔ اب یہاں سے ریل گھر جائیں ۔ لاحول ولا قوۃ ۔ بڑی مصیبت پڑی ۔ مہاجن نے کہا ۔ پھر چلنا تو ضرور ہے ۔ ہم تم سب کو خوش کر دیں گے ۔

کانشٹبل ۔ جو زیور مل گیا تو خواہی نخواہی لیں گے انعام اور بھرپور انعام ۔ نہیں ملا تو پھر کیا لیں گے ؟ دوسرا ۔ اجی ملے اور پھر ملے ۔ ریل پر پتا لگے گا ۔ تیسرا ۔ اللہ کرے پتا لگے ۔ تو لالہ جی سے خوب انعام ملے ۔

سب کی صلاح ہوئی کہ ریل گھر چلیں ۔ ٹکیت گنج کے تھانے پر جو جمعدار تھا ۔ اس کو بلا لائے اور کہا ۔ اس کی حفاظت کیجئے ۔ اس کے ہاں سے چوری کا مال نکلا ہے ۔ جمعدار نے کہا ۔ چل چوکی پر ۔ تیرا باپ کہاں ہے ؟ کہا آتا ہوگا ۔ اتنے میں اس کا باپ بھی آیا ۔ حال سن کر رونے لگا ۔ مکان اس کے سپرد کر دیا گیا ۔ کانشٹبل اور مہاجن اور ظہور بخش وغیرہ ایک کرایے کی گاڑی پر ریل گھر چلے ۔ پہنچے تو ریل اسی وقت روانہ ہوئی ۔

مہاجن ۔ (گھبرا کر) روک لینا ۔ روک لینا ۔ ڈاکو جاتا ہے ۔ روک لو ۔ خدا کے لئے ذرا روک لو ۔ ریل کا سپاہی ۔ ہائیں ! اب آپ کے روکے ریل رک رہے گی ؟ دوسرا سپاہی ۔ واہ رک چکی ۔ چلئے ۔ اب

اپنا کام کیجیے۔

مہاجن نے اسٹیشن ماسٹر سے کہا۔ سن کر خاموش ہوئے۔ پوچھا دس ہزار کا زیور تھا؟ دو چار انگریز۔ دو چار کرانی۔ دو چار بابو کھڑے ہوگئے۔ اور لالہ کو خوب بنایا۔ کیمیا گر تھا۔ دس کے پچاس خوب ہوئے۔

اسٹیشن ماسٹر۔ اس کا حلیہ بتاؤ ہم تار دیتے ہیں۔ مہاجن نے حلیہ بتایا تار دیا کہ اس شخص کو ریل پر تلاش کر کے فوراً گرفتار کر لو۔

مہاجن اپنا سا منہ لے کر واپس آئے اور گھر گئے۔ محلے بھر میں دھوم ہوگئی کہ لالہ آئے اور چور کا پتا بھی لگایا۔ جوق جوق آدمی جمع ہونے لگے۔ جو آتا ہے اس سے مفصل حال کہنا پڑتا ہے۔ مست شاہ نے وہ رنگ جمایا تھا کہ نصف شہر اس کے کمال اور اس کی کیمیا گری کا معتقد تھا۔ مگر جب سے یہ خبر مشہور ہوئی۔ اکثر آدمی کیمیا کو محض ڈھکوسلا سمجھنے لگے۔ اس موقع پر ایک مرد معمر نے خوب 'اسپیچ' دی تھی۔

یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ ایک برق انداز نے جھپٹ کر اس شخص کو گرفتار کر لیا۔ جس سے نواب صاحب ہمکلام تھے۔ اور اتنے ہی میں گاڑی ایک اسٹیشن پہ ٹھہری۔

درجے کے لوگ متحیّر و ششدر کہ یا الٰہی یہ کس قصور پر بیچارہ دھرا گیا۔ چُپ چاپ بیٹھا کیمیا گر کی روایت سُنتا تھا۔ دفعتہً یہ برق انداز بلا کی طرح نازل ہوا۔ سب نے مل کر غل مچایا اور برق انداز کو سمجھایا۔

ایک۔ چھوڑ دو۔ چھوڑ دو۔ ہائیں! ہائیں! دوسرا۔ چھوڑ دو میاں۔ آخر اِس بیچارے کا قصور تو بتاؤ کچھ۔ بے وجہ بے سبب گرفتار کرنا کیا معنی؟ چھوڑ دو۔ تم ہو کون؟ تیسرا۔ اچھا ہاتھ تو چھوڑ دو۔ بھاگ کر جائیں گے کہاں؟ چوتھا۔ تم کو دھوکا ہوا ہے بھئی جوان! یہ کوئی چور نہیں ہیں۔ پانچواں ارے میاں! گرفتاری کی وجہ تو بیان کرو۔ یا شہر شملہ ہے ایک بھلے مانس کو پکڑ لیا۔ چھٹا۔ بھنگ تو نہیں پیے ہے؟ کانسٹبل نے کہا۔ آپ لوگ اِن سے واقف نہیں ہیں۔ پھر اِس شخص سے پوچھا۔ آپ کا کیا نام ہے؟ کہا۔ ہمارا نام کمال الدین ہے۔ کانسٹبل نے مسکرا کر جواب دیا۔ واہ! کمال الدین کہیں اور رہتے ہونگے۔ آپ مست شاہ ہیں۔ حضرت نے لاکھ کوشش کی کہ ہاتھ چھڑا کر بھاگ جائیں۔ مگر بے سود۔ کانسٹبل نے جبر غٹّو کیا۔

اتنے میں غل غپاڑے کی آواز سن کر اسٹیشن ماسٹر بھی آئے۔ بڑے تن و توش کے۔ بنگالی بابو (صاحب توند)

لبی دھوتی پہنے - اسٹیشن ماسٹروں کی وردی کی ٹوپی سر پر رکھے - انگریزی لکڑ توڑ - بوٹ "رپ رپ" کرتے آئے - اسٹیشن ماسٹر - "وِل" یہ گول (غل) کاہے کرنے مانگتا ہے؟ یہ کیا گول مال کر رکھا ہے؟ ریل کا جمعدار - یہاں کیا غُل مچاتے ہو جی؟ برقنداز - یہ مجرم ہے - ہم نے اِس کا حُلیہ ملایا - چار اسٹیشنوں تک ہم بھلے بیٹھے اور حُلیہ ملاتے آئے - اور میں دیکھتا آیا کہ یہ وہی شخص ہے - بولا تو نہیں میں - مگر تاک میں رہا کہ بھاگ نہ جائے - جب یہاں ریل ٹھہری - اور میں جانتا تو تھا ہی کہ یہاں آدھ گھنٹے تک ٹھہرتی ہے - میں نے فوراً ہاتھ پکڑ لیے - اب آپ حُلیہ ملا لیں - اسٹیشن ماسٹر نے حُلیہ ملایا اور کہا - اوہ! یہ بڑا بُرا بات - ایسا ناپھک (موافق) بے ایمانی کرنا نہیں چاہیے - مست شاہ بولے - خداوند! لئے مرتے ہیں - اِس سے مجھ سے لاگ ڈانٹ ہو گئی تھی - صرف میرے پھنسانے کے لیے اِنھوں نے مجھے پکڑ لیا - لوگوں نے کہا - حضرت! آپ لاکھ باتیں بنائیے ایک نہ چلے گی - ریل پر جو مسافر بیٹھے تھے وہ متحیر کہ یا خدا عجب حُسنِ اتفاق ہے کہ نواب صاحب یہ قصہ بیان ہی کر رہے تھے - ہنوز ختم بھی نہ ہوا تھا کہ مست شاہ کی زیارت حاصل ہوئی - اسٹیشن ماسٹر نے نواب صاحب سے پوچھا کہ آپ تو

ہمیشہ ’فرسٹ کلاس‘ پر آتے تھے۔ ابکی ’تھرڈ‘ میں کیوں آئے؟ نواب صاحب نے ’ٹکٹ‘ دکھا کر کہا ابکی بھی ’فرسٹ‘ ہی ’کلاس‘ میں آیا ہوں۔ ایک اسٹیشن پر اُترا تو ریل چلنے ہی کو تھی اور میں باہر لپک کر مارے جلدی کے اِس درجہ میں بیٹھ گیا۔ اب یہاں سے درجہ بدل لونگا۔ اِس وقت بڑی دل لگی ہوئی۔ میں یہی قصہ کئی اسٹیشن سے کہتا چلا آتا تھا۔ اور لطف یہ کہ مست شاہ ہی سے بیان کر رہا تھا۔ اِسٹیشن ماسٹر بہت ہنسے۔ جو لوگ ریل کے اِس درجہ پر بیٹھے تھے۔ انھوں نے بھی خُوب قہقہے لگائے۔ ایک نے کہا۔ بھئی حُسنِ اِتّفاق اِسے کہتے ہیں۔ مست شاہ نے حُسنِ اِتّفاق کا کلمہ سُن کر دِل ہی دِل میں کہا کہ اِن کے نزدیک حُسنِ اِتّفاق ہے۔ شامتِ اعمال نہیں کہتے۔ دُوسرے صاحب بولے۔ ہنسی تو ہمیں اِس پر آتی ہے کہ خود بدولت ہی سے کہتے جاتے ہیں۔ تیسرے مُسافر نے کہا۔ مگر حضرت! یہ قصّہ سُنتے سُنتے مست شاہ کا رنگ فق ہو ہو جاتا تھا۔ اِس کی کئی مُسافروں نے شہادت دی۔ برق انداز بولا میں نے بہزار خرابی پہچانا۔ بڑی دیر تک حُلیہ مِلایا کیا اور سوچا کہ گرفتار کروں یا نہیں۔ ایسا نہ ہو۔ وہ نہ ہوں۔ کوئی اور ہو تو مُجھے نادم ہونا پڑے۔

پیادوں میں نوکری کی تو کیا ہوا؟ شرافت اِس سے ہماری نہیں گئی۔

مست شاہ زمانے بھر کے نیاریے۔ گرگِ باران دیدہ۔ ہزاروں کو ٹھگ چکے تھے۔ نہایت اِستقلال سے مُسکراکر باتیں کرتے تھے۔ گویا بالکل جرم سے واقف ہی نہ تھے۔

مست۔ واللہ ہمیں اِس وقت ہنسی آتی ہے۔ خُدا جانے کیا سبب ہے اِس مہینے میں دو مرتبہ گرفتار کیا گیا۔ ایک دفعہ ناؤ پر پکڑا گیا کہ مست شاہ ہے۔ اب میں قسمیں کھاتا ہوں کہ مست شاہ کمبخت سے اصلا واسطہ نہیں۔ میں کمال الدین ہوں۔ مگر کوئی مانے ہی نہیں۔ بات ساری یہ ہے کہ مست شاہ مردُود ہمارا ہمشکل ہے۔ خیر۔ ہم سرکار سے لڑ تو سکتے ہی نہیں۔ مگر دس پانچ دن میں مونچھوں پر تاؤ دیتے آتے ہیں۔

نواب۔ کیا سچ مُچ ایسا ہی ہے؟ **مست** معلُوم ہی ہوجائے گا۔ **ن**۔ ہیں آپ ہی۔ **م**۔ دُرست۔ **ن**۔ کہئے وہ دس ہزار کہاں ہیں؟ **م**۔ واہ! آپ کو کیوں بتائیں؟ **ن**۔ حضرت! ہیں تو آپ چالاک آدمی۔ **م**۔ بڑے۔ **ن**۔ ہم کو کیمیا بنانا نہیں سِکھا دیتے؟ **م**۔ کُچھ زیور تو لائیے پہلے۔ **ن**۔ ہاں صحیح ہے۔ **مسافر**۔ اتنی پڑیں گی بے بھاؤ کی کہ یاد ہی تو کروگے۔

بے شرم" زیور تو لاؤ پہلے" م۔ شکر ہے خداوندا! آج یہ کلمہ سننے میں آیا۔ ہائے! ہائے! کرم لیکھ نا مٹے۔ کرو کوئی لاکھن چترائی۔ ن (مسافر سے) اِس گفتگو سے کیا فائدہ؟ م۔ کہنے دیجئے حضور۔ ن۔ نہیں ایسا نہیں چاہیئے۔

اتنے میں چنگی کا چپراسی آیا۔ اور مست شاہ کو دیکھ کر مسکرایا۔ نواب صاحب نے کہا۔ کیا مسکراتے ہو میاں؟ چپراسی بولا۔ کچھ نہیں حضور۔ یہ صاحب تمہارے ہم کو بھی ٹھگ چکے ہیں۔ مگر اِس وقت بھیس بدلے ہیں۔ بڑے بھائی! سلام۔ مست شاہ نے مسکرا کر کہا۔ جیتے رہو۔ اچھے تھے؟ بہت دن بعد دکھائی دیئے۔ کہاں رہے؟

ن۔ تم کو کیوں کر ٹھگا تھا؟ چپراسی کچھ نہ پوچھئے حضور۔ مگر آج صاحب تمہارے دھرے تو گئے۔ اُس دِن رنگے کپڑے پہنے تھے۔ کنٹھا ہاتھ میں اور دس پانچ شہری اِردگرد۔ ہمارے پاس آکر بیٹھے۔ باتیں واتیں کیں۔ مال جو محصولی تھا باتوں ہی باتوں نکال لے گئے۔ میرے فرشتے خاں کو بھی نہ معلوم ہوا۔ دُوسرے دن ہم سے ایک آدمی نے آن کر کہا۔ ن۔ اِن کا مکان جانتے ہو؟ چپراسی۔ جی نہیں۔ اسٹیشن ماسٹر یہ چاپ رسی (چپراسی) شاچ (سچ) بولتے کہ جھوٹ؟ م۔ شاچ۔ شاچ۔ شب شاچ۔ بابو شاب۔ (اِس پر قہقہہ پڑا۔

مگر واہ رے استقلال!)۔ ن۔ بڑے اُستاد ہیں۔ ماسٹر۔ بڑا بدماش (بدمعاش) ہے۔ م۔ شُکر ہے خُداوندا! شُکر ہے۔ چپراسی۔ جانو بڑے وہ ہیں۔ اللہ سے مِلے ہوئے۔ مُسافر۔ آنکھوں سے شرارت برستی ہے۔ کانسٹبل۔ مہاجن نے اِشتہار دیا ہے کہ جو تلاش کرے گا اُس کو پانچ سو اِنعام کے دونگا۔ ن۔ تو پھر کیا کہنا ہے؟ م۔ ہاں اب چاندی ہے تمھاری۔ مُسافر۔ آپ ہی کی بدولت (اِس پر ایک اور قہقہہ پڑا)۔ ماسٹر۔ اِس کو دیکھتا رہو۔ ن۔ بھاگنے والا نہیں ہے۔ کانسٹبل۔ کیا مجال حضور۔ میں تو ایسا رگیدُوں کہ یاد کرے۔

مست شاہ نے نواب صاحب سے کہا۔ حضور! یہ آپ ہی کی بدولت ہم آج دھرے گئے۔ یہ آپ نہ طُول طویل قصّہ چھیڑتے نہ ہم پر اِس قدر مُصیبت پڑتی۔ مگر آپ مُجھے اپنا پتا بتائیں تو کل ہی آپ کو لکھ بھیجوں۔ مگر واہ رے مست شاہ! خود تو مال لے دے کے چل دیئے ہم کو اچھا اُلو بنایا۔ نواب صاحب نے کہا۔ حضرت! اب آپ کی بات کا ہم کو بھی یقین نہیں آتا۔ آپ واقعی بڑے چالاک آدمی ہیں۔ کبھی ہنسنا اور کبھی مسکرانا اور کبھی خُدا کو یاد کرنا اور کبھی کچھ اور کبھی کچھ۔ یہ سب باتیں بہ ہیئتِ مجموعی۔ صاف دلالت کرتی ہیں کہ مست شاہ

آپ ہی ہیں۔

اتنے میں صاحب ‘انسپکٹر پولیس’ آئے۔ برق انداز نے اپنے صیغے کے قواعد کے مطابق سلام کیا۔ اور کہا۔ خداوندا! ایک مجرم کو گرفتار کیا۔

انسپکٹر۔ کیسا مجرم؟ برقنداز۔ اشتہاری ہے۔ انسپکٹر۔ ہاں۔ اہو ہو ہو۔ کہاں ہے؟ مست (نواب صاحب کی طرف اشارہ کرکے) یہ کھڑا ہے حضور! (اس پر لوگوں نے قہقہہ لگایا۔)۔ برقنداز۔ خداوند یہی ہے۔ انسپکٹر۔ کیا نام ہے تمھارا؟ م۔ کمال الدین المتخلّص بکمال۔ انسپکٹر۔ یوں! شاعر بھی ہیں آپ۔ م۔ کیسے کچھ۔ انسپکٹر۔ شاگرد کس کے ہو؟ م۔ روح القدس۔ انسپکٹر۔ ہاں جی بتاؤ۔ کیا ہوا؟ پکڑے کہاں گئے؟ م۔ اسی ریل پر خداوند! ابھی ابھی تو گرفتار کیا ہے۔ انسپکٹر۔ جرم کیا ہے؟ م۔ حضور! ایک مہاجن سے دس ہزار روپے کا زیور لائے اور وعدہ کیا تھا کہ یہ پچاس ہزار کا ہوجائے گا۔ ہم کیمیا کے زور سے پانچ حصّے زیادہ دیں گے۔ مہاجن کوئی گدھا تھا پھنس گیا۔ حضرت لے کر بھاگ کھڑے ہوئے۔

انسپکٹر صاحب کے کان میں مست شاہ نے کہا۔ سنئے ‘اجیٹن’ صاحب۔ میں مست شاہ ہوں یا مستان شاہ

یا گودڑ شاہ - قسم خدا کی اگر تم نے مجھ کو نہ بچا دیا تو تلسی داس والے مقدمے میں جو رشوت تم نے لی ہے اُس کا کچّا چٹّھا کہہ سناؤں گا - اور جب جیل خانے سے واپس آؤنگا تو تمھاری جان لونگا - پیچھے شکایت کا موقع تم کو نہ ہو - میں نے ابھی سے جتا دیا ہے -

انسپکٹر - شہید مردوں سے بھی دل لگی - ہم سے اُڑتے ہو - لے اب تم رہا ہو کر آؤ تو نوکری چھوڑ دوں - الگ ہٹ نابکار - مَ - بہت خوب دیکھئے گا - گالی دی ہے آپ نے - انسپکٹر - ابھی پٹوگے بھی - مَ - واسطے خدا کے ذرا چونچ سنبھالو - انسپکٹر - چپ نالائق - برق انداز - یہاں کچھ نہ کہئے حضور - تھانے پر چلنے دیجئے - پھر ہم سب کسر نکال لیں گے - اتنا گدیاؤں کہ چھٹی کا دودھ یاد آئے - انسپکٹر - اچھا - مَ - خیر - سمجھا جائے گا -

مست شاہ کو دو برق انداز تھانے پر لے گئے - انسپکٹر نے سکھا دیا تھا کہ جب شام ہو تو کوٹھری میں بند کر کے اتنا ٹھونکنا کہ عمر بھر یاد رہے - مگر زخم نہ ہو - نشان نہ ہو - خون نہ نکلے - برق انداز بولا ادھ مرا کر دوں تو سہی - کیمیا بنانے چلے تھے - اب دیکھو ہم اُلّو بناتے ہیں - مست شاہ مسکرائے ہمیں پیٹوگے نہ ؟ پھر ہرج ہی کیا ہے کہ ہمیں

آج تم پیٹو - دس دن میں ہم تمہاری خبر لیں گے - اور ایسی کہ عمر بھر نہ بھولو -

برق انداز - اچھا چلو تو - تم - چلتے تو ہیں - دوسرا برق انداز - اب کیا راستے ہی میں پٹوگے ؟ تم - (مسکرا کر) بندگی - انسپکٹر اور بیحیا بھی ہے - تم - اچھا - دیکھو - حیا اور بیحیائی کا حال معلوم ہوتا ہے -

مست شاہ بحراستِ پولیس تھانے پر آئے - تھانے دار سے برق اندازوں نے بیان کیا کہ جو فقیر مہاجن کو دھوکا دے کر بھاگ گیا تھا اور دس ہزار کا زیور نقوہ اُڑایا تھا - وہ پکڑا گیا - تھانے دار بہت خوش ہوئے - پوچھا کہاں ہے ؟ کہا یہ حاضر ہے - مست شاہ بنے بیٹھے حضرت -

تھانہ دار - اخّاہ یہی ذاتِ شریف ہیں ! تم - جی حضور - تھانہ دار - مست شاہ آپ ہی ہیں ؟ تم - جی حضور - تھانہ دار خوب مال مارا ؟ تم - جی حضور - تھانہ دار - ہاں یہ تو مسخرے بھی ہیں - اِن سے ذرا اور طرح کا برتاؤ کرنا ہوگا - یہ باتوں کے آدمی نہیں معلوم ہوتے - لاتوں کے آدمی ہیں - برق انداز - انسپکٹر صاحب کو للکارتے تھے - تھانہ دار - ہاں ! یہ تیزی ؟ اچھا بچا بنا کے چھوڑوں تو سہی - سب مشیخت دم کے دم میں نکل جائے گی - بولو کیا نام ہے تمہارا ؟ بتاؤ

جھٹ پٹ - م - برق اندازوں سے پوچھ لو - چٹ پٹ - تھانہ دار : جھلا کر - کچھ خبطی ہے کیا ؟ م - معلوم تو خبطی ہی ہوتا ہے - برق انداز - چپ - نہیں پٹے گا - تھانہ دار - کچھ نہ کہو - کچھ نہ کہو - دیکھو ہم ان کی درستی کئے دیتے ہیں - اور ایسی کہ عمر بھر یاد کریں - ابھی ذرا خاموش رہو - م - بیشک - تھانہ دار - نام بتاؤ - م - برق انداز کو ہمارا نام معلوم ہے - تھانہ دار - کیا نام ہے جی : اس کا ؟ م - بتاؤ - ہم نے اپنا نام کیا بتایا تھا ؟ وہی نام بتاؤ - کہا نہیں تھا ؟ اس وقت بھول گئے ؟ تھانہ دار - اس قدر حجت کرتے ہو مگر صاف صاف بیان نہیں کردیتے کہ نام کیا ہے - بڑے شریر اور بدذات ہو - م - وہ تو صورت ہی کہے دیتی ہے - برق انداز - انھوں نے جمالُ الدین نام بتایا تھا ؟ تھانہ دار - جمالُ الدین تمھارا نام ہے ؟ ہم کو دق نہ کرو - م - جمالُ الدین کہیں اور رہتے ہونگے - ہم سے صاحب سلامت بھی نہیں ہے - تھانہ دار - تو مردِ آدمی نام کیوں نہیں بتاتے ؟ م - جیم با کاف بدل کنند تا نامِ من گردد - تھانہ دار - کیا ؟ یہ تو فارسی بولنے لگے - کیا نام بتایا ؟ اب سیدھے طور سے نام بتاؤ ورنہ سیدھے بنائے جاؤگے - برق انداز - صاحب یہ یوں مان چکے - ناکوں دم کردیا وہاں - تھانہ دار - ارے بدبخت ! نام تجھ

کمبخت کا ہے یا گمنام ہے تو شیطان ؟ تم - کیا خوب شیطان اور گمنام - ہاں انتہا ہے کہ آپ شیطان سے بھی زیادہ مشہور ہیں - تھانہ دار - رہ - اگر نام نہ بتادیا تو قسم خدا کی باندھ کر اتنا پیٹونگا اِتنا پیٹونگا کہ یاد ہی کروگے تمام عمر - نالائق - تم - اجی برق انداز نے ہمارا نام جمالُ الدّین بتایا تھا - کہو ہاں - اب ہم کہتے ہیں کہ جیم کو کاف سے بدلو تو ہمارا نام سمجھو - تھانہ دار - کمالُ الدّین ؟ تم - یہ بات - لانا ہاتھ - کیوں تھا مُعمّا یا نہیں ؟

اتنے میں انسپکٹر صاحب آئے - بول بدمعاش - اب تو ہمارے بس میں ہے یا ہم تیرے بس میں ؟ بہت بڑھ بڑھ کے باتیں بناتا تھا - اب بول - تھانہ دار سے کہا - اِس نے آسمان سر پر اُٹھا لیا تھا مانتا ہی نہ تھا - مجھ سے کان میں آکر کہا کہ سُنو جی میں مست شاہ ہوں یا مستان شاہ - اگر تم نے مجھے رِہا نہ کیا تو مار ہی ڈالوں گا - اور تم نے جو رِشوت لی تھی تُلسی داس والے مُقدمے میں - تھانہ دار نے کہا - جی ہاں یہاں بھی نادر شاہی کی لے رہے ہیں - دو ایک اینڈی بینڈی بھی سُنائیں - مجھے نام ہی نہ بتایا - مُعمّا بولے - کبھی پہیلی کہی - جان عذاب میں ہوگئی - ناک میں دم آگیا - اب میں اِن کو پیٹنے ہی کو تھا - مگر بچ گئے -

اور دیکھ لیجئے گا۔ بے پٹے نہ جائیں گے۔ اِن کی زبان رُکے گی نہیں اور میں کب تک ضبط کرونگا۔

انسپکٹر۔ میں خود اِسی فکر میں ہوں۔ م۔ واللہ آپ کو خُدا کی قسم سچ کہئے گا۔ یہ فکر ہے؟ انسپکٹر۔ مسخرا ہے کوئی۔ تھانہ دار۔ دیکھئے مسخرا بنا نکلا جاتا ہے۔ برق انداز لیجاؤں کوٹھری میں اور دو چار گھونسے لگادوں؟ م۔ (اُٹھ کر) آؤ۔ برق انداز۔ چلو۔ دوسرا برق انداز۔ ہاں! یہ دعویٰ؟ آچل۔ اتنا پٹے کہ عُمر بھر یاد کرے۔ ہم بیس تو اکیلا۔

نواب صاحب گاڑی پر سوار ہوئے۔ اُن کو اِس مُقدمے سے کچھ واسطہ نہ تھا۔ مگر اسٹیشن ماسٹر سے کہا کہ آپ ہم کو اِطلاع دیجئے گا۔

مسیح المُلک ایک بے رحم امیر کی حکایت

لال کنوے پر جو نواب بدل بیگ خاں ایک مشہور نواب رہتے ہیں اُن کے بزرگوں میں کوئی نواب مسیح المُلک ہو گزرے ہیں۔ اِسم تو اُن کا بادشاہی طبیبوں میں تھا۔ مگر

بادشاہ کے مزاج میں کچھ ایسا درخور اُن کو ہو گیا تھا کہ سلطنت کے کُل معاملات اُن کے اِختیار میں تھے - ایسا اِختیار پا کر مسیح الملک کو لازم تھا کہ متوسّلانِ شاہی کی دلجوئی، غریبوں کی پرورش، اور مظلوموں کی داد رسی کرتے - لیکن اُنھوں نے تو کچھ ایسے ہاتھ پاؤں نکالے کہ تھوڑے ہی دنوں میں ایک دُنیا کو شاکی اور ایک عالم کو فریادی بنا لیا - جِس سے سنو شکایت - جِس سے پُوچھو گِلہ - صدہا آدمی جو دس دس پُشت کے مُلازم اور موروثی نمک خوار ہونے کی وجہ سے دل و جان سے خیر خواہِ بادشاہ تھے - نہ خطا - نہ گُناہ - موقُوف کرا دیئے - مسیح الملک کے آوردوں کے سِوائے کوئی شخص ایسا نہ بچا جِس کی تنخواہ میں تھوڑی بہت کمی نہ ہوئی ہو - یوں ہی تنخواہ چھٹے مہینے مِلا کرتی تھی - حکیم گردی میں تو برسوں پر نوبت پہنچنے لگی - اور اُس میں بھی کچھ ایسی کاٹ چھانٹ لگائی جاتی کہ دس والے کو چھ اور چھ والے کو چار بمشکل پلّے پڑتے - بیوؤں اور یتیموں اور اپاہجوں کی معافیاں بے دریغ ضبط کر لیں - بادشاہ تک اِن سب باتوں کی فریادیں پہنچتی تھیں - جب کبھی پُوچھتے تو مسیح الملک یہ سمجھا دیتے کہ حضُورِ والا خزانے میں ٹکا نہیں رہا - کروڑوں کا قرضہ ہو گیا ہے - میں کہتا ہوں کہ جِس طرح ہو سکے قرضہ

چُکا دوں۔ دو چار برس میں سب انتظام ہوا جاتا ہے۔ عُمر بھر حضُور کا نمک کھاتے رہے اور اِس سرکار کی بدولت ہزاروں چین کیے۔ چند روز کے لیے اگر سب مِل کر تھوڑی تکلیف جھیل لیں تو حضُور بارِ قرض سے سُبکدوش ہوئے جاسکتے ہیں۔ اِس پر بھی بادشاہ یہی فرماتے کہ لوگوں کو بےدِل ستاتے ہو۔ بلا سے میرے مصارف میں کمی ہو تو ہو لیکن غریبوں کی تھوڑی اوقات ہے اِن کو مت ستاؤ۔ قرضہ چار برس میں نہیں تو دس برس میں ادا ہو رہے گا۔ لیکن یہ تھوڑی اوقات کے لوگ زیادہ سختی کرنے سے تمام ہو جائیں گے۔ خُدا نخواستہ اگر اِن میں سے ایک بھی کھسکا تو ہزاروں رُوپیہ خرچ کرنے سے بھی ایسا آدمی ملنا دُشوار ہے۔ اِن میں کا ایک ایک آدمی جانا بُوجھا اور آزمایا ہوا ہے۔ اور دیکھو جو چاہنا سو کرنا خیرات کی رقموں میں خبردار جو تم نے کمی کی۔ اوّل تو وہ خیرات ہی کیا ہے؟ حساب کیا جائے تو پہاڑ کے آگے رائی۔ مگر خیر۔ جس قدر ہے نہایت ہی ضرُوری ہے۔ مسیح الملک کے دل پر تو نیکی کا پرتو بھی نہیں پڑا تھا۔ فیاضی اور نفعِ رسانیِ خلائق اور رحم سے وہ بالکل بے نصیب تھا۔ بادشاہ کی باتوں کا اُس پر مطلق اثر نہ ہوتا۔ آخر ظالم کی عمر کوتاہ۔ بچا کی شامت جو آئی بیٹی کا بیاہ کرنے اُٹھے۔

پہلا کام تھا۔ پس و پیش کچھ نہ سوچا۔ لوگوں کے حق مار مار کر
زور و ظلم سے جو کچھ جمع کیا تھا سب خرچ کر ڈالا۔ بلکہ
ہزاروں کا قرضہ سر کر لیا۔ اور نام و نمود کے پیچھے مر مٹے۔
شادی کے سامان دیکھ کر جہاں پناہ کو بدگمانی ہوئی۔ اور
ستم رسیدوں کو کہنے سُننے کا موقع مِلا۔ غرض دفترِ شاہی
سے نام کٹ گیا۔ نام کا کٹنا تھا کہ قرضخواہوں نے تنگ
کرنا شروع کیا۔ مُتوسّلانِ شاہی ناراض تو تھے ہی۔ راہ
میں چلتے پھرتے آوازے کسنے لگے۔ مسیحُ الملک سے سوائے
اِس کے اور کچھ نہ بن پڑی کہ کعبتہ اللہ جائیں۔ نَو سَو
چوہے کھا کے بِلّی حج کو چلی۔ سفر کا نام سُن کر نوکر چاکروں
نے ٹکا سا جواب دیا۔ گھر کے لونڈی غلام کنّی کاٹ گئے۔
اتنی بڑی بھیڑ میں سے صرف ایک کنیز ہوشمند نام ساتھ
ہوئی۔ اِس کو حکیم صاحب کی چھوٹی بیٹی نازپرورد سے
ساتھ کھیلنے اور ہمعمری کی وجہ سے بڑی محبّت تھی۔ اور
اِسی تعلّق سے اُس نے نازپرورد کی رفاقت اختیار کی۔
ہوشمند تھی تو کنیززادی مگر بڑی ہی عقلمند اور اسم بامُسمّٰی
تھی۔ گو عقلمندی کے سبب سب اہلِ خدمت میں مُمتاز
اور سلیقہ مند اور صاحبِ شعور تھی۔ مگر اُس کی عقل
آزادی چاہتی تھی۔ اپنی حالت کو نہایت ناپسند کرتی اور

جی ہی جی میں غور کیا کرتی کہ گھر میں تین قسم کے آدمی ہیں۔ ایک تو خود گھر والے۔ جن کو سب طرح کا آرام اور اختیار حاصل ہے۔ دوسرے نوکر لوگ گھر والوں کی ٹہل خدمت تو کرتے ہیں۔ مگر خاطر خواہ اپنی مزدوری لیتے ہیں اور جب کوئی نوکری سے ناخوش ہوتا ہے تو چھوڑ کر چلدیتا ہے۔ تیسرے ہم لوگ ہیں۔ جو لونڈی غلام کہلاتے ہیں۔ ہماری محنت اور مصیبت کی کچھ انتہا نہیں۔ نہ ہم چھوڑ کر کہیں جا سکتے نہ کچھ تنخواہ کا استحقاق رکھتے۔ سب میں ہم ہی کمبخت گئے گزرے ہوئے ہیں۔

ہوشمند اس کے سبب کی تفتیش میں تھی کہ آخر میں نے ایسا قصور کیا کیا ہے کہ اس کی پاداش میں مجھ کو عمر قید ہے۔ بہتیرا سوچتی کچھ پتا نہیں چلتا تھا۔ دو ایک مرتبہ اس نے قصد کیا کہ اپنی ہمجنسوں میں اس کا تذکرہ کرے۔ مگر کسی کو اس دل و دماغ کا نہ پایا۔ وہ لوگ سب کے سب اسی قدر عقل رکھتے تھے کہ کسی دن کام زیادہ پڑ گیا یا مارے پیٹے گئے۔ تھوڑی دیر کو روئے دھوئے۔ پھر ویسے کے ویسے۔ **مصرعہ۔** چکنے گھڑے پہ بوند پڑی اور پھسل پڑی۔ مگر ہوشمند ہمیشہ اپنے تئیں لئے رہتی تھی۔ مارنا پیٹنا کیسا؟ کوئی سخت بات بھی کہتا تو مہینوں اس پر صدمہ رہتا۔ ہر وقت اپنی

حالت اُس کو پیشِ نظر رہتی۔ اور اِسی وجہ سے سدا اُداس رہا کرتی تھی۔ اکیلی ہوتی تو کبھی اپنی مصیبت پر رویا بھی کرتی۔ آزادی کا تصوّر اِس کے ذہن میں ایسا سمایا تھا کہ کوئی چیز اُس کو خوش نہ آتی۔ اور جس قدر ہوشمند آزادی کی خواہشمند تھی اُسی قدر گھر والوں کی نظروں میں ذلیل تھی۔ خصوصاً نازپرورد اُس کی دماغداری سے نہایت جلتی اور کہا کرتی تھی "لونڈی ہوکر اِس کے یہ دماغ ہیں۔ جھونپڑیوں میں رہنا اور محلوں کے خواب دیکھنا"۔ ہوشمند نے اپنے ذہن میں چپکے چپکے اپنی نسبت یہ تحقیق کیا کہ چورانوے کے قحط میں اُس کی ماں کو اُس کا نانا دو روٹیوں پر بیچ گیا تھا اُس وقت اُس کی ماں چھ سات برس کی تھی۔ جب بڑی ہوئی تو حکیم صاحب نے کسی اپنے غُلام سے نکاح کردیا۔ یہی ہوشمند ایک لڑکی ہوئی تھی کہ ماں باپ دونوں مرگئے۔ ہوشمند کو جب یہ حال دریافت ہوا تو دل میں کہنے لگی کہ البتہ اِس گھر کا مجھ پر یہ بہت بڑا اِحسان ہے کہ مجھ کو اور میری ماں کو پرورش کیا۔ مگر نرے حقِ پرورش سے یہ لازم نہیں آتا کہ میں تمام عُمر کے لئے ایسی ذِلّت اور مُصیبت میں رکھی جاؤں۔ حقِ پرورش جیسا مجھ پر ویسا خود گھر کے بال بچّوں پر۔ پس کیا سبب کہ میں بڑی ہوکر لونڈی رہوں

اور یہ لوگ برابری کے درجے میں سمجھے جائیں؟ یہی نہ کہ میرا نانا قحط میں دو روٹیوں کا حاجتمند تھا اور اُس وقت دو روٹیاں دے کر اِن لوگوں نے میرے نانا کی جان بچائی؛ لیکن جب اِن کو اتنا مقدور تھا تو ان پر بھی میرے نانا کی مدد کرنی فرض تھی۔ دُنیا میں اِس سے بڑھ بڑھ کر لوگ سلُوک کرتے ہیں۔ لیکن کوئی کسی کو غُلام نہیں بنا لیتا۔ اور یہ بھی سمجھ میں نہیں آتا کہ نانا نے میری ماں کو بیچ کیونکر دیا؟ ضرور میری ماں اُن کی بیٹی تھی۔ مگر کسی کو کسی کے بیچ دینے کا اختیار تو ٹھیک نہیں معلوم ہوتا۔ غرض اِس طرح کے بیسیوں منصوبے ہوشمند کے ذہن میں بھرے تھے۔

جب حکیم صاحب کا کام بگڑا اور سب لونڈی غُلام شُترِ بے مہار کی طرح چلتے پھرتے نظر آئے۔ ہوشمند کی نسبت بھی کسی کو اِطمینان نہ تھا۔ بلکہ سب کے بعد اُس کا ٹھہرا رہنا اور کار و خدمت میں پہلے سے زیادہ تندہ ہونا سب کو موجبِ حیرت تھا۔ آخر جب روانگی میں دو دِن رہ گئے تو نازپرورد نے خود کہا کہ "کیوں ہوشمند! وہ آزادی جس کی تمنّا تم کو برسوں سے تھی۔ اب یہ وقت ہے بسم اللہ جہاں جی چاہے چلی جاؤ"۔ ہوشمند نے کہا

البتہ میں آزادی کی بڑی قدر کرتی ہوں مگر اُس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ میں اِس گھر سے چلی جاؤں۔ آپ سے جُدائی اِختیار کروں۔ دُنیا میں اِس گھر کے سوا مجھ کو کسی سے تعلق نہیں۔ اگر اِس بگڑے وقت میں میری جان بھی آپ کے کام آئے اور حقِ نمک اور حقِ پرورش ادا ہو جائے تو مجھ کو اُس کے صرف کرنے میں بھی انشاء اللہ دریغ نہ ہوگا"۔

غرض حکیم صاحب بی بی اور چھوٹی بیٹی اور ہوشمند کو ساتھ لے بمبئی پہنچے۔ اور یہاں جواہرِ بیش بہا جو پاس تھے بیچ۔ سامانِ ضروری اور نقد رُوپیہ جہاز میں رکھ۔ سولھویں دِن جدّہ میں جا داخل ہوئے۔ حج کو ابھی بہت توقف تھا۔ یہ صلاح ہوئی کہ چلو پہلے مدینہ ہو آئیں۔ راہ میں بدوؤں نے آگھیرا۔ مال و متاع ذرا ذرا کر کے لُوٹ لیا۔ ہوشمند اور نازپرورد دونوں کو جابر بدوی پکڑ کر لے گیا۔ اور گھر لے جا بی بی کے حوالے کیا کہ لو اِن دونوں کو لونڈی بناؤ۔ گھر کی ٹہل خدمت اِن سے لو۔ جب ریحانہ اور ضمیران کا نکاح کریں گے تو یہی لونڈیاں اُن کے جہیز میں دے دیں گے۔ بیچاری نازپرورد کے حق میں تو گویا مصیبت کا پہاڑ ٹُوٹ پڑا۔ گھر چھُوٹا۔ ماں باپ

چھوٹے ۔ عزیز و بیگانے چھوٹے ۔ بیگم سے لونڈی بنی ۔ اور اُس پر طُرّہ یہ کہ لونڈی بھی بنی تو نکمّی اور ذلیل ۔ جابر کے گھر چھالیا کترنی نہ تھی ۔ پان بنانے نہ تھے ۔ ورنہ شاید قہرِ درویش بر جانِ درویش نازپرورد کر بھی گزرتی یہاں تو بھیڑ بکریوں اور اُونٹنیوں کو چرانا ۔ پانی پلانا ۔ دُودھ دُوہنا ۔ گھر کا پیسنا پکانا ۔ یہ کام تھے ۔ سو اِن میں کوئی بھی نازپرورد کے بس کا نہ تھا ۔ نازپرورد کو دِن رات رونے سے کام تھا ۔ اُس کی مصیبت کو دیکھ دیکھ ہوشمند کا کلیجا بھی مُنہ کو آ جاتا تھا ۔

دو چار دِن تو کسی نے اُن سے کچھ پُوچھا گچھا نہیں ۔ جابر اپنی بی بی بیٹیوں سے شاید اُن کے بارے میں کچھ کہتا سُنتا ہو ۔ سو اُنھوں نے سمجھا نہیں ۔ نازپرورد تو روتی ہی رہی ۔ مگر ہوشمند نے گھر کے کام کاج میں ہاتھ لگانا شروع کر دیا ۔

ایک دن جابر اپنی بی بی سے باتیں کرتا تھا اور نازپرورد کی طرف آنکھیں نکال نکال دیکھتا بھی جاتا تھا ۔ ہوشمند سمجھی کہ اب اُس کو نازپرورد کا رونا اور کام نہ کرنا ناگوار ہے ۔ ڈری اور نازپرورد سے جا کر کہا کہ تقدیر کا جو لکھا تھا سو ہوا اور جو کچھ اور لکھا ہے سو

ہوگا۔ مگر رونے سے حاصل کیا؟ پانچ پانچ چھ چھ دن ہوئے دانہ تک آپ کے منہ میں نہیں گیا۔ آنکھیں تمام سوج گئی ہیں۔ ذرا دل کو مضبوط کیجئے"۔ یہ کہنا تھا کہ نازپرورد اور بھی بے اختیار ہو کر رونے لگی۔ تھوڑی دیر بعد پھر ہوشمند نے کہنا شروع کیا کہ "رونا کچھ آج تھوڑا ہی ختم ہوا جاتا ہے۔ یہ تو عمر بھر کو روگ لگا۔ جیئیں گے تو بہتیرا رولیں گے"۔

نازپرورد۔ کیا کروں؟ دل ہے کہ اندر سے امڈا چلا آتا ہے۔

ہوشمند۔ سچ ہے۔ مصیبت سی مصیبت ہے۔ جتنا رنج کیجئے تھوڑا ہے۔ مگر میں کہتی ہوں اس کا انجام کیا ہوگا؟

نازپرورد۔ میں اسی طرح اپنی جان دونگی۔ ہوشمند۔ اے کاش! جان کا دینا اپنے اختیار میں ہوتا تو بھلی ہی بات نہ ہوتی۔ مجھ کو مرنا قبول تھا مگر آپ کی تکلیف دیکھنے کا یارا نہیں۔ نازپرورد۔ غش پر غش تو مجھ کو آنے ہی لگے ہیں۔ دو ایک دن میں جان بھی نکل جائے گی۔

ہوشمند۔ سب کچھ تو ہوا مگر خدا نے اس وقت تک بے حرمتی نہیں کی۔ اب مجھ کو اس کا بھی کھٹکا ہے۔ نازپرورد (یہ سن کر چونک پڑی اور پوچھا) کیا؟ ہوشمند۔ وہ بدو جو ہم کو پکڑ کر لایا ہے۔ اس کا نام جابر ہے۔ آج وہ اپنی

بی بی سے باتیں کر رہا تھا۔ اور آپ کی طرف آنکھیں نکال نکال کر دیکھتا جاتا تھا۔ اُس کے تیور اچھے نظر نہیں آتے۔ نازپرورد۔ آخر کیا کہتا تھا؟ ہوشمند۔ اپنی بولی میں بہت دیر تک نہیں معلوم کیا کہتا رہا۔ مگر تھا ضرور آپ ہی کا مذکور۔ نازپرورد۔ تم کو کیا معلوم ہوا کہ وہ کیا چاہتا ہے؟ (آج یہ پہلا مرتبہ تھا کہ نازپرورد ساری عمر میں ہوشمند سے تم کہہ کر بولی)۔ ہوشمند۔ میرے قیاس میں وہ یہی چاہتا ہے کہ آپ رونا دھونا موقوف کرکے کام کاج کریں۔ یہ کہنا تھا کہ نازپرورد پھر بیتاب ہوگئی۔ اور بہت دیر کے بعد سنبھل کر کہنے لگی کہ اگر میں اُس کی مرضی کے موافق نہ کرونگی تو یہی نہ کہ مجھ کو مار ڈالے گا۔ سو میں خود جان دینے کو موجود ہوں۔ ہوشمند۔ مرنے پر آپ سے زیادہ میں دلیر ہوں۔ مگر وہی خوف ہے کہ شاید اُس نے جان سے نہ مارا اور کچھ بے حرمتی کی۔ نازپرورد۔ پھر کیا کرنا چاہیئے؟ ہوشمند۔ سنگ آمد و سخت آمد اُٹھنا چاہیئے۔ نازپرورد۔ تم جانتی ہو۔ مجھ کو کچھ کام کرنا نہیں آتا۔ ہوشمند۔ کام تو میں کرلونگی۔ صرف آپ میرے ساتھ چلتی پھرتی رہیئے۔ نازپرورد۔ کیا یہاں سے رہائی کی کوئی تدبیر نہیں؟ ہوشمند۔ کون تدبیر ہے؟ نازپرورد۔ رات کو چھپ کر بھاگ چلیں۔ ہوشمند۔ اجنبی ملک۔ اجنبی لوگ۔ نہ شہروں کے نام معلوم۔ نہ کہیں کی راہ معلوم۔

پاؤں ہیں چلنے کا بوتا نہیں۔ کہاں بھاگ کر جا سکتے ہیں؟ نازپرورد۔ ابّا کی کچھ خبر نہیں؟ ہوشمند۔ کچھ نہیں۔ نازپرورد یہ جابر تو ضرور جانتا ہوگا؟ ہوشمند۔ بیشک۔ مگر پوچھے کون؟ اوّل تو اس کی بولی نہیں آتی۔ دوسرے وہ کچھ اس طرح کا سخت مزاج آدمی معلوم ہوتا ہے کہ خود اسی کی بیٹیوں کا اس کی صورت دیکھنے سے دم فنا ہوتا ہے۔ ڈر کے مارے سامنے تک تو جاتیں ہی نہیں۔ نازپرورد۔ عورتوں میں کوئی بھلی مانس ہے؟ ہوشمند۔ ابھی کیا معلوم۔ مگر بڑی بیٹی ضمیران کچھ ملنسار معلوم ہوتی ہے۔ وہ جب ہم لوگوں کی طرف دیکھتی ہے تو اس کی نگاہ میں ایک رحم پایا جاتا ہے۔ نازپرورد۔ چلو۔ اسی سے اپنی مصیبت بیان کریں۔ ہوشمند۔ کس زبان میں؟ نازپرورد۔ کچھ اشاروں ہی سے اس کو سمجھائیں۔ ہوشمند۔ ابھی جلدی نہیں کرنی چاہیئے۔ نازپرورد۔ زبان کے نہ جاننے کی کیسی خرابی آبنی ہے۔ ہوشمند۔ میں تو سمجھتی ہوں کہ زبان کا نہ آنا اس وقت ہم کو بہت فائدہ دے رہا ہے۔ اوّل تو اگر ہم کوئی کام ان لوگوں کی مرضی کے موافق نہ کر سکیں تو نہ سمجھنے کا تعذر معقول ہے۔ دوسرے میرے اور آپ کے ارادے ان پر ظاہر نہیں ہوسکتے۔ بے تکلف ہم لوگ باتیں کیا

کریں۔ اِن کو خاک خبر نہیں ہوتی۔ نازپرورد۔ جابر کی بی بی اور بیٹیاں تو اپنے ہاتھوں سب کام کرتی ہیں۔ اب کیا یہ لوگ سارا کام ہمارے سر ڈال کر الگ ہوجائیں گی؟

ہوشمند۔ نہیں۔ یہ تو اِن لوگوں میں ایک بڑا عمدہ دستور معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ لونڈی غلاموں کو کام اور کھانے اور کپڑے اور سب باتوں میں گھر والوں کے ساتھ برابر رکھتے ہیں۔

غرض ہوشمند کے ڈھارس دلانے سے نازپرورد بھی اُٹھنے بیٹھنے لگی۔ مگر کام کی عادت تو تھی ہی نہیں۔ اُس پر سے دل غمزدہ۔ کچھ ہوتا ہواتا نہ تھا۔ اور بے سلیقگی کے سبب سے جس کام کو ہاتھ بھی لگاتی خراب کرتی۔ جابر کے گھر والے اُس کو نری احمق اور نری کام چور جانتے تھے۔ وہ تو ہوشمند ہر ایک کام میں اُس کی شریک ہوجاتی تھی۔ اِس سے نازپرورد کا پردہ ڈھکا چلا گیا۔ ورنہ خدا جانے کیا نوبت ہوتی؟ ہوشمند اپنی ہڈیاں پیلتی اور اکیلے دم پر تمام مصیبت جھیلتی۔ مگر نازپرورد کی تکلیف گوارا نہ کرتی۔ اور جہاں تک ہوسکتا اُس کو کسی کام میں ہاتھ نہ لگانے دیتی۔ جابر بدوی کے گھر جاکر نازپرورد کو اپنی ساری حقیقت کھل گئی۔ ہوشمند کے ساتھ اپنی حالت

کو مقابلہ کرتی تو آپ اپنی نظروں میں تھوڑی ہو کر رہ جاتی ۔ اب اُس نے جانا کہ جِن لوگوں کو نظرِ حقارت سے دیکھتی تھی ۔ واقع میں وہی بڑے کام کے تھے ۔ اور میں ہی بڑی نکمی ۔ بے مصرف ۔ دُوسروں کی محتاج ۔ دُوسروں کی دست نِگر ہوں ۔

اب اُس نے سمجھا کہ آزادی بڑی چیز ہے ۔ اور دُوسروں کی لونڈی ہو کر رہنا کتنی بڑی تکلیف کی بات ہے ؟ اب اُس کو ہوشمند کی قدر آئی کہ آزادی کی تمنّا اُس کو بیجا نہ تھی ۔ اِس پر بھی یہ غنیمت تھا کہ جابر کے گھر یہ دونوں ایسی ذلیل نہ تھیں جیسی کہ خود اُس کے اپنے گھر کی لونڈیاں ۔ یہاں تو جِس طرح ضمیران اور ریحانہ جابر کی دونوں بیٹیاں رہتی تھیں ۔ اُسی طرح نازپرورد اور ہوشمند تھیں ۔ کھانا ایک ۔ کپڑا ایک ۔ سب کام برابر یہ نہیں کہ دِلّی ۔ لکھنؤ کی بیگموں کی طرح جابر کی بی بی بیٹیاں پلنگوں پر لدی بیٹھی رہیں ۔ اور ہِل کر پانی تک نہ پییں ۔ کچھ ایک جابر پر کیا موقوف تھا؟ اُس مُلک کا دستور ہی ایسا ہے ۔ بڑے امیر کیوں نہ ہوں ۔ کام کرنا عار نہیں سمجھتے ۔

جابر تھا تو لٹیرا ۔ مگر خوشحال تھا ۔ سَو اُونٹ تو لدّو تھے ۔

ہزار کے قریب بھیڑ بکریاں رہی ہونگی ۔ یہی اُس کا دھن دولت تھا ۔ اور جو کبھی برس دو برس میں کچھ لوٹ ہاتھ لگ گئی تو وہ علاوہ ۔ با ایں ہمہ اُس کی اور اُس کے گھر والوں کی زندگی نہایت سادگی اور بے تکلّفی کے ساتھ تھی ۔ ہر شخص سیر چشم ۔ مہماں نواز ۔ سخی ۔ دلیر ۔ محنتی ۔ جفاکش ۔ وعدے کا سچّا ۔ اور قول کا پکّا ۔

ہر چند کہ یہ سب باتیں مدّت تک نازپرورد کو عجیب معلوم ہوتی رہیں ۔ مگر چونکہ سب میں نیکی کا پرتو تھا ۔ رفتہ رفتہ نازپرورد اُن کو پسند کرنے لگی ۔ اور ہوشمند سے کبھی کبھی کہا بھی کرتی کہ "یہ جنگلی بدّو گو وحشی ہیں ۔ مگر بہت باتیں میں اِن میں شہر والوں سے بہتر پاتی ہوں"

ہوشمند ۔ ایک بات تو مجھ کو بھی اِس مُلک کی بہت پسند آئی ۔ وہ یہ کہ عورتوں کی اِس طرف زیادہ قدر ہے ۔

نازپرورد ۔ آخر اس کا سبب کیا معلوم ہوتا ہے ؟ ہوشمند ۔ ایک تو یہ کہ عورتیں اپنی رائے سے شادی کرتی ہیں ۔ اب دیکھئے ضمیران کی باتیں اِدھر اُدھر سے آتی ہیں اور ضمیران بے تأمّل اُن میں گفتگو کرتی ہے ۔ ہمارے ہندوستان میں اوّل تو لڑکیوں کو ایسی چھوٹی سی عمر میں بیاہ دیتے ہیں کہ اُن کو ایسی باتوں کی تمیز نہیں ہوتی ۔

اور جو لڑکی بڑی عُمر کی بھی ہو جائے تو اپنی شادی میں وہ کچھ بول نہیں سکتی۔ اِس کو بیحیائی قرار دے رکھا ہے۔ دُوسرے عورتوں کی زیادہ قدر ہونے کا ایک بڑا سبب اور ہے۔ وہ یہ کہ نکاح کے بارے میں جیسی آزادی مردوں کو ہے۔ ویسی ہی عورتوں کو ہے۔ مرد یہاں کئی کئی نکاح کرتے ہیں۔ عورتوں کا بھی یہی حال ہے۔ طلاق یہاں عیب نہیں۔ دُوسرا نکاح عورتوں کو یہاں منع نہیں۔ ریحانہ اور ضمیران کی ماں عذراء کا حال آپ کو معلُوم ہے؟ یہ جابر ساتویں جگہ ہے اور پھر دیکھئے تمام گاؤں میں ساری بیبیاں عذراء کی کیسی عزّت کرتی ہیں؟ نکاح کا تعلّق اِس مُلک میں ایسا قوی تعلّق نہیں ہے جیسا ہمارے مُلک میں ہے۔ تھوڑے تھوڑے مہر ہوتے ہیں۔ مرد ناخوش ہوا۔ فوراً طلاق دے دی۔ عورت ناراض ہوئی جھٹ سے خلع کرلیا۔ پھر اب یہ نہیں کہ طلاقن ہے تو کوئی اُس کو عیب لگائے۔ نہیں ہزاروں اُس کے خواہاں۔ سیکڑوں اُس کے طالب۔ ہمارے ہندوستان میں مردوں نے اپنی آزادی تو قائم رکھی۔ جس کو مقدور ہوا دو دو تین تین چار چار بیبیاں کرلیتے ہیں۔ عورتوں پر قید ہے۔ کسی حالت میں دُوسرا

نکاح نہیں کرسکتیں۔ اِس سبب سے مرد کے مُقابلے میں عورت بہت دبی ہوئی ہے۔

اِس اثنا میں ضمیران کا نکاح بھی ٹھہر گیا۔ مُغیرہ اُن بدوؤں کا ایک سردار تھا۔ اُسی کے بیٹے ثابت سے بات قرار پائی۔ جابر کے گھر تو بڑی خوشیاں ہونے لگیں مگر ہوشمند اور نازپرورد کے غم پھر تازہ ہوگئے۔ کیونکہ جابر اسی نیت سے ہوشمند اور نازپرورد کو لایا تھا کہ اپنی بیٹیوں کے جہیز میں دے۔ سو اب ہوشمند اور نازپرورد کے ایک دوسرے سے جُدا ہونے کا وقت آ پہنچا۔ جابر نے ضمیران کو اختیار دیا کہ ہوشمند اور نازپرورد سے جس کو پسند کر لے۔ ضمیران نے ہوشمند ہی کو لیا۔ ضمیران مزاج کی ایسی نیک تھی کہ اگر ہوشمند کہتی سُنتی تو وہ اُس کی عوض نازپرورد کو لے لیتی۔ مگر باوجودیکہ نازپرورد کی جُدائی نہایت شاق تھی۔ ہوشمند نے ضمیران کے ساتھ اپنا ہی جانا مُناسب سمجھا۔ اِس واسطے کہ اتنی مُدت جابر کے یہاں رہی اور کسی وقت فکرِ آزادی سے غافل نہ تھی۔ مگر کوئی سبیل نہ نکلی۔ ہرچند کوئی وجہ اُمید کی نہ تھی۔ مگر ہوشمند کا دل اندر سے خود بخود گواہی دیتا تھا کہ مُغیرہ کے گھر جا کر ضرور کوئی صُورت رہائی کی نکلے گی۔ اور اِس اُمید کو ہوشمند نے اِس طرح

وُثوق کے ساتھ نازپرورد کے رُوبرو بیان کیا کہ اُس کو تسلّی ہوگئی - ضمیران کا بیاہ ہوا تو وہ بھی سادہ اور بےتکلّف شرعی نکاح تھا - اور مہمانی اور جہیز کا سامان بھی اتنا مُختصر کہ اگر جابر دہلی یا لکھنؤ میں ایسا مقدور رکھکر یوں بیٹی کا بیاہ کرلیتا تو دُنیا تھُڑی تھُڑی کرتی -

غرض ضمیران ماں باپ سے رُخصت ہوکر مُغیرہ کے گھر آئی - ہوشمند ساتھ تھی - تھوڑے دِنوں کے بعد کیا اِتّفاق ہوا کہ ہوشمند ثابت اور ضمیران کو کھانا کھلاتی تھی - ثابت کے ہاتھ پر جو ہوشمند کی نگاہ جاپڑی تو اُس کو بعینہٖ اُسی طرح کی انگوٹھی پہنے دیکھا جیسی حکیم صاحب پہنے رہا کرتے تھے - تا بہ دیر غور سے دیکھتی رہی - وہی حلقہ تھا - وہی نگین - ایک دو دفعہ موقع پاکر ثابت کے سونے کی حالت میں بھی ہوشمند نے اُس انگوٹھی کو دیکھا اور اچھی طرح یقین کرلیا کہ ضرور انگوٹھی ہے حکیم صاحب کے ہاتھ کی - اب اِس بات کے درپے ہوئی کہ یہ انگوٹھی ثابت تک کیونکر پہونچی - بدّو بڑے لڑاکو ہوتے ہیں - اور چھوٹی چھوٹی باتوں میں کُشت و خُون پر آمادہ ہو جاتے ہیں - ضمیران کو سسرال گئے ہوئے تیسرا یا چوتھا مہینا تھا کہ دفعتہً مُغیرہ کے یہاں لڑائی کی تیّاریاں ہونے لگیں - اور

اُس نے یہ صلاح کی کہ عورتوں کو شیخ بصرہ کے گھر پہنچا دے - یہ ایسی بات نہ تھی کہ ہیشمنہ کو اُس کی وجہ معلوم ہونے میں کچھ دِقّت ہوتی - تھوڑی ہی سی تفتیش سے یہ امر دریافت ہوا کہ مُغیرہ بدوؤں کے ایک بڑے گروہ کا سردار ہے - اور وہ لوگ جہاں کہیں لُوٹ مار کریں - مُغیرہ کو گھر بیٹھے عُشر یعنے دسواں حصّہ بھیج دیتے ہیں - پار سال حج سے پہلے مدینے کی راہ میں ہند کا قافلہ لُوٹا گیا اور اُس لُوٹ میں شدّاد نامی - مُغیرہ کے گروہ کا ایک شخص بھی شریک تھا - اُس نے لُوٹ میں جس قدر حصّہ پایا تھا - اُس کے عُشر کے عوض ایک انگوٹھی جو ثابت کے ہاتھ میں تھی - مُغیرہ کو دی - اب چند روز ہوئے مُغیرہ کو یہ خبر پہنچی کہ شدّاد میرِ قافلہ کو بھی پکڑ لایا تھا - اور اُس کو غلام بنانا چاہا - وہ شخص پیر مرد تھا - اُس نے کہا کہ میں ضعیف ہوں - کار و خدمت کے لائق نہیں - مُجھ کو غلام بنانے سے تجھ کو کیا حاصل ہوگا - تب اُس سے یہ شرط کی کہ تُو مُجھ کو ہزار درہم دے تو چھوڑ دوں - وہ پیر مرد ہندی طبیب بھی تھا چنانچہ مکے میں آکر کچھ اپنے پیشے سے کمایا اور کچھ اپنے ہموطنوں سے لیا اور ہزار درہم شدّاد کو دیئے - مُغیرہ نے اُس ہزار درہم کا عُشر شدّاد سے مانگ بھیجا شدّاد

نے اِنکار کیا۔ اِسی بات پر تکرار بڑھتے بڑھتے لڑائی ٹھہری پہلے تو شدّاد نے اُس ہزار درہم سے اِنکار کیا۔ مُغیرہ کو پکّی خبر ملی تھی کہ وہ طبیبِ ہندی ہنوز مکّے میں ہے۔ اُس نے اپنے دوست شریفِ مکّہ کی معرفت دریافت کرایا تو ہزار درہم کا ملنا صحیح تھا۔ مُغیرہ نے عُشر کے لئے تنگ طلبی کی۔

اب تو ہوشمند کو حکیم صاحب کا ٹھیک پتا مِل گیا۔ نہایت خوش ہوئی اور جی میں کہنے لگی ”ہائے پَر ہوتے تو اِسی وقت اُڑکر جاتی اور نازپرورد کو خوشخبری سُناتی“ حقیقتِ حال سُننے کے ساتھ ہوشمند دل میں منصوبے کرنے لگی کہ حکیم صاحب مکّے میں ہیں تو وہاں سال در سال ہرطرف سے آدمی حج کو جاتے ہیں۔ کہلا بھیجنا کچھ مُشکل نہیں۔

مُغیرہ اور شدّاد میں جو لڑائی ہونے والی تھی۔ حج کے دِن قریب آجانے کی وجہ سے وہ بھی مُلتوی ہوگئی۔

ہوشمند نے تحقیق کیا تو متوکّل نامی ایک مُعلّم مُغیرہ کے گاؤں کا رہنے والا ہندی لوگوں کو مناسکِ حج کی تعلیم کے لئے ہر سال مکّے جایا کرتا تھا۔ یہ شخص ایک طرح کا مُجاور تھا۔ یلملم میں جہاز سے اُترتے اُترتے ہندیوں کو جا لیا اور دس بیس کو حج کرا دیا۔ اُنھوں نے اِس خِدمت کے صِلے میں جو کچھ دے دیا۔ یہی متوکّل کی معاش تھی۔

متوکّل بڑا نیک دل اور خدا پرست آدمی تھا۔ اور بدّو اُس کے زُہد و صلاح کے بہت معتقد تھے۔ خصوصاً مُغیرہ۔ ہوشمند جو کچھ مُغیرہ کے گھر سے پاتی اپنا پیٹ کاٹ کر متوکّل کے گھر دے آتی۔ رفتہ رفتہ جب ہوشمند نے متوکّل سے اچھی طرح تعارُف پیدا کرلیا اور اُس کی دینداری اور امانت پر اُس کو اِعتماد ہوگیا تو اُس نے متوکّل سے کہا کہ ”مجھ کو آپ سے ایک حاجت ہے وہ یہ کہ آپ مکّے جائیے تو شریفِ مکّہ کے پتے سے ایک ہندی طبیب مسیحُ المُلک کا پتا لگا کر اتنا اُن سے کہہ دیجئے کہ نازپرورد نے جو بیرُ الاعراب میں جابر بدوی کے پاس ہے آپ کو سلام کہہ دیا ہے“۔ متوکّل نے بہت وُثوق کے ساتھ وعدہ کیا کہ ”اِنشاء اللہ تعالیٰ تمھارا یہ پیام میں مسیحُ المُلک تک پہنچا دُونگا“۔ غرض یہ کہ جاتے کے ساتھ متوکّل نے مسیحُ المُلک کو ڈھونڈا تو جلدی سے پتا مل گیا۔ اِس واسطے کہ مسیحُ المُلک خود شریفِ مکّہ کے یہاں معالج تھے۔ جوں ہی مسیحُ المُلک نے نازپرورد کا نام سُنا۔ بے اختیار آنکھ سے آنسو نکل پڑے۔

متوکّل چونکہ خدا پرست آدمی تھا مسیحُ المُلک کو روتے دیکھ۔ پُوچھنے لگا کہ ”اگر آپ کی مصیبت میں مجھ سے کچھ

مدد ہو سکے تو انشاء اللہ تعالیٰ میں دریغ نہ کرونگا"۔ تب مسیح الملک نے اپنے لوٹے جانے اور قید رہنے کا قصہ بیان کرکے کہا کہ "ناز پرورد بدبخت کی بیٹی ہے۔ آپ مجھ کو صرف اتنی بات بتائیے کہ اُس کی رہائی کی عمدہ تدبیر کیا ہے"۔ متوکل نے کہا "تمام اعراب اگرچہ خود سر ہیں مگر شریفِ مکہ کا ادب کرتے ہیں۔ اگر شریف ساعی ہوں تو آپ کی بیٹی کی رہائی بہت سہل ہے"۔ مسیح الملک یہ سُن کر بہت خوش ہوئے اور فوراً شریفِ مکہ سے جاکر عرضِ حال کیا۔ شریف نے اُسی وقت نامہ لکھ دیا اور اپنا خاص خادم مسیح الملک کے ساتھ کر دیا۔ مسیح الملک خادمِ شریف کو ساتھ لے بیر الاعراب میں گئے۔ اور جابر کو شریف کا نامہ دیا۔ جابر نے خط پڑھتے کے ساتھ مسیح الملک کو بہت خاطر داری سے اپنے گھر میں لے جانا چاہا۔ مسیح الملک نے تامّل کیا۔ جابر۔ "یہ امر ہرگز قرینِ انصاف نہیں ہے کہ آپ کی بیٹی برس روز میرے اہل و عیال میں داخل رہے اور میں اُس کی ناموس کا حافظ رہوں اور آپ کو اجنبی سمجھوں"۔ غرض جابر مسیح الملک کو گھر کے اندر لے گیا۔ ناز پرورد باپ کو دیکھتے ہی دوڑ۔ قدموں سے لپٹ گئی۔ اور جُدائی کے حالات جو دونوں کو یاد آئے

تو بیٹی باپ دونوں ایسی ڈاڑھیں مار مار کر روئے کہ جابر کے گھر بھر کے دِل ہِل گئے۔ ؎

وہ رو رو کے اِس طرح دونوں ملے
کہ جس طرح ساون سے بھادوں ملے

نازپرورد نے تھمتے کے ساتھ اپنی ماں کی خیریت پوچھی مسیح الملک۔ "تمہاری مفارقت میں زندہ در گور ہے"۔ پھر ہر ایک نے اپنی اپنی مصیبت کا تذکرہ کیا۔

مسیح الملک پر متوکل سے نازپرورد کا سلام اور پتا سُن کر۔ ایک شادی مرگ کی حالت طاری ہوگئی تھی۔ اُس وقت اُس نے متوکل سے کچھ اور نہیں پوچھا۔ اِس واسطے مسیح الملک کو اِس وقت تک ہوشمند کا حال معلوم نہیں تھا۔ بلکہ جب اُس نے ہوشمند کو نازپرورد کے پاس نہیں پایا تو یہ جانا کہ شاید وہ کہیں اور ہوگی۔

نازپرورد نے مسیح الملک سے پوچھا کہ "میرا پتا آپ کو معلوم کیونکر ہوا"؟ مسیح الملک۔ مجھ سے متوکل نامی ایک معلم نے تمہارا سلام اور پتا بیان کیا۔ نازپرورد۔ میں تو متوکل کے نام سے بھی واقف نہیں۔ شاید خدائے تعالیٰ نے میری مصیبت پر رحم کر کے رجال الغیب میں سے کسی کو آپ کے پاس بھیجا ہو۔ یا ہوشمند یہاں تھی۔ اُس نے کسی سے کچھ

تذکرہ کیا ہو۔ مگر مجھ کو معلوم نہیں۔ مسیح الملک۔ ہوشمند بھی
تمھارے ساتھ تھی؟ نازپرورد۔ شروع سے۔ وہ تو اب
پانچواں مہینا ہے کہ جابر کی بیٹی ضمیران کے جہیز میں
دی گئی اور اُس کے ساتھ روانہ ہوئی۔ مسیح الملک۔
ضمیران کہاں بیاہی گئی؟ نازپرورد۔ یہاں سے چھ یا
سات منزل کوئی مقام عمرانہ ہے۔ وہاں مغیرہ کے بیٹے
ثابت سے۔ مسیح الملک۔ متوکل کا سخت عجب ہے۔ نازپرورد
فی الواقع عجب ہے۔ جابر سے پوچھیے۔ شاید کوئی شخص
بیرالاعراب میں اِس نام کا ہو۔ مسیح الملک نے جابر سے
پوچھا تو اُس نے کہا یہاں تو نہیں ہے۔ عمرانہ میں ایک
متعلم ہے۔ تب تو مسیح الملک اور نازپرورد کو یقین ہوا
کہ اُس کی رہائی میں ہوشمند نے تحریک کی ہے۔ تب
نازپرورد نے ہوشمند کی وفاداریاں اور اُس کے اِحسان
اور دلجوئیاں سب مسیح الملک سے بیان کیں۔

مسیح الملک نے دِل میں کہا کہ ہرگز اقتضاے حمیّت
و مروّت نہیں ہے کہ میں نازپرورد کو لے جاؤں اور ہوشمند
کی رہائی میں سعی نہ کروں"۔ یہ سوچ اُس نے عمرانہ جانے
کا اِرادہ کیا اور جابر سے منزلوں کا حال پوچھنے لگا۔ جابر
نے کہا کہ آج شام تک ایک قاصد عمرانہ سے آنے والا ہے۔

اُس سے ٹھیک حال معلوم ہوگا"۔ گھڑی بھر رات گئے قاصد آیا اور ہوشمند بھی اُس کے ساتھ تھی۔ مسیح الملک کو دیکھتے ہی قدموں پر سر رکھ دیا۔ مسیح الملک نے پوچھا تو اپنا حال بیان کیا کہ "متوکل جو حج سے واپس آیا تو میں نے اپنے پیام کا حال اُس سے پوچھا۔ معلوم ہوا کہ آپ ملے اور چھوٹی بیوی کی رہائی کی تدبیر ہو گئی۔ اور شریف کا نامہ لے کر آپ بیرُ الاعراب روانہ ہوئے۔ متوکل نے مجھ سے آپ کا ماجرا پوچھا۔ میں نے شروع سے آخر تک بیان کیا۔ تب اُس نے مجھ سے پوچھا کہ تُو نے اپنی رہائی کی کچھ فکر نہ کی؟ میں نے جواب دیا کہ مجھ کو رہائی کی ضرورت نہیں۔ میں تو جنم کی کنیز ہوں۔ جن کو ضرورت ہے۔ خدا اُن کو نصیب کرے۔ متوکل کو نہیں معلوم کیا سوجھی اور کیا مغیرہ سے کہا۔ غرض مجھ کو آزاد کر دیا۔ میں نے کہا کہ میں یہ احسان اپنے سر نہیں لے سکتی تاوقتیکہ اپنی بیوی کو آزاد نہ دیکھ لوں۔ یہاں قاصد آنے والا تھا۔ مجھ کو اُس کے ساتھ کر دیا"۔

یوں خدا نے نازپرورد اور ہوشمند دونوں کی رہائی کی۔ اور مسیح الملک ہنسی خوشی دونوں کو ساتھ لے۔ جابیہ سے رخصت ہوئے۔ مسیح الملک نے ہوشمند کو بیٹی اور نازپرورد نے اُس کو اپنی بہن بنایا۔

منتخب از موعظۂ حسنہ

خط ۱

تمھارے خط نے جو بعد الاصلاح ملفوف ہے مجھ کو سخت رنج پہنچایا۔ میں نے تم کو انگریزی کی طمع سے جدا کیا سو میں دیکھتا ہوں کہ انگریزی۔ عربی دونوں جانا چاہتی ہیں عربی تو یقیناً جا چکی۔ رہی انگریزی سو میں پاتا ہوں کہ ایسی مکروہ غلطیاں تمھاری چٹھی میں ہیں کہ تنزّلِ اِستعداد اُس سے ظاہر ہے۔ تمھاری انگریزی اب ایسی ہونی چاہیے کہ میں اُس میں کوئی غلطی گرفت نہ کر سکوں اِس واسطے کہ میں انگریزی داں نہیں ہوں نہ مجھ کو انگریزی کا شوق نہ خدا کے فضل سے انگریزی کی ضرورت لیکن جب ایسی فاش غلطیاں دیکھوں تو کیوں کر صبر کروں۔ تمھارا یہی حال رہا تو میری برسوں کی محنت دہلی میں ضائع کر دوگے میں نے تم سے بار بار کہا کہ خطوط کی اِصلاح ضرور ہے۔ کسی کو دِکھا لیا کرو اور جو اصلاح دے اُس کو خیال رکھو تم نے ایسی خود رائی اِختیار کی ہے کہ تم کو میرے کہنے کی مُطلق پروا نہیں ہوتی اگر یہی انگریزی ہے جو تم نے لکھی تو لعنت بر ہیچ۔ میں نے صرف موٹی موٹی غلطیاں گرفت کیں۔ اگر

عبارت کی عمدگی اور محاورات پر نظر کرتا تو ایک حرف باقی نہ رہتا۔ بے شک تمھارے ایسے خطوط سے مجھ کو اندازہ ملا کرے گا کہ تم کیا کرتے ہو۔ تم کو دہلی میں منطقی نہیں ملتے تو کیا اب اتنے بڑے شہر میں کوئی اتنا نہیں کہ تم کو انگریزی میں اصلاح دے دیا کرے مگر تم سمجھتے ہو کہ دہلی اعظم گڑھ ہے اور تمھارا باپ وہاں کا بھی حاکم ہے۔ اگر تمھارا یہی حال ہے تو دہلی میں رہنا تمھارے حق میں زبون ہے۔ میں اس کالج سے باز آیا۔ بلا سے انگریزی میرے یہاں عمدہ نہیں عربی تو ہے۔ خطِ اصلاحی کو حسبِ عادت عجلت سے مت پڑھو بلکہ بہ غور۔ غالب ہے کہ سوالاتِ عربی کا جواب تم خوب سمجھ لوگے۔ ۲۰۔ فروری ۱۸۷۶ء تحصیل نگرا

خط ۲

بیوی صاحب کو سلام کے بعد معلوم ہو۔ یہ بھی ایک دنیا کا دستور قرار پا گیا ہے کہ جب کسی کا کوئی عزیز قریب مرجاتا ہے لوگ اس کی ماتم پرسی کیا کرتے ہیں۔ میں تم کو یہ خط اس دستور کے مطابق نہیں لکھتا کیوں کہ مصیبت تنہا تم پر نہیں مجھ پر بھی ہے۔ میاں بی بی کا عجب رشتہ ہے کہ مرد و عورت نکاح کے ہو جانے سے دنیا کی سب چیزوں میں شریک ہو جاتے ہیں یہ بات کسی اور رشتے

ہیں نہیں پائی جاتی ہے۔ میرا تمھارا مال مشترک۔ گھر مشترک۔ کھانا پینا مشترک۔ اولاد مشترک۔ آبرو مشترک۔ خوشی مشترک۔ رنج و غم مشترک۔ اگر وہ لڑکی جیتی تو کیا تمھاری اکیلی کی بیٹی ہوتی؟ نہیں میری تمھاری دونوں کی۔ پس اب اگر مر گئی تو کیا تمھاری اکیلی بیٹی مری؟ نہیں۔ میری تمھاری دونوں کی پھر بھی میں اِس کو تسلیم کرتا ہوں کہ تم کو اُس سے بڑا قوی تعلّق تھا۔ لیکن رُوحانی تعلُّق کی وجہ سے شاید جس دن وہ مری ہے میرا دل خود بخود بیقرار تھا اور میں نے اُسی گھبراہٹ میں میاں بشیر کو خط بھی لکھا۔ تاریخ مِلا کر دیکھو۔ غالب ہے کہ خط کی تاریخ اور اُس کے مرنے کی تاریخ ایک ہوگی۔ اِنّا لِلّٰہ و اِنّا اِلیہِ راجعُون۔ ظہیر۔ نصیر وغیرہ کے مرنے سے یہ تو بخوبی تجربہ کر چُکے کہ موت پر اِنسان کا کچھ اختیار نہیں چلتا۔ رہا رنج وہ بھی رفتہ رفتہ کم ہو جاتا ہے۔ میں تم پر الزام نہیں لگاتا۔ اپنا حال بیان کرتا ہوں کہ نصیر کو کِس قدر پیار کرتا تھا۔ اُس کی قبر میری آنکھوں کے سامنے ہے اور میں سوتا بھی ہوں۔ ہنستا بولتا بھی ہوں۔ دُنیا کا کوئی کام مجھ سے نہیں چھوٹا۔ تو جب ظہیر نصیر کے رنج کو ہم نے چند سال میں بھلا دیا۔ تو یہ لڑکی بیچاری کے دِن کی تھی۔ آخر پھر دُنیا اور دُنیا کے کام۔ کتابوں میں

بہت ٹھیک لکھا ہے کہ دانا اور احمق صبر دونوں کرتے ہیں مگر فرق اتنا ہوتا ہے کہ احمق رو دھو کر چپ کرتا ہے اور دانا شروع سے خدا پر نظر کر کے چپ ہو رہتا ہے غرض صبر تو آخر کرنا پڑے گا۔ پس کیا فائدہ کہ اپنا ثواب ضائع کریں دل کو مضبوط کر آنسو پونچھ سنبھل بیٹھو۔ خدا ہمارا مالک ہے۔ اس نے دیا۔ اس نے لیا۔ خدا کو ہم سے عداوت نہیں بیر نہیں۔ جو کچھ کرتا ہے ہمارے نفع کے لئے کرتا ہے۔ لیکن اپنی کم فہمی کی وجہ سے ہم ان مصلحتوں کے سمجھنے سے قاصر ہیں۔ دنیا کے انتظام پر نظر کرو تو تن درستی۔ مال۔ اولاد۔ حکومت۔ شرافت۔ دین داری۔ ہزاروں طرح کی نعمتیں ہیں اور یہ نعمتیں خداوند کریم نے اپنی مرضی کے مطابق لوگوں میں تقسیم کی ہیں۔ ہم کو بھی اس نے اپنی رحمتوں میں سے بہت بڑا حصہ عطا فرمایا ہے تو کیا ہم ٹھیکہ دار ہیں کہ خدا کی سب نعمتیں اپنے گھر میں گھسیٹ کر بھر لیں اور پھر اولاد سے بھی خدا کا لاکھ شکر ہے ہم محروم نہیں ان کی عمروں میں خدا برکت دے۔ ان کو دین و دنیا کی فلاح ہو۔ کافی ہیں۔ اب زیادہ اولاد لے کر کیا کرو گی انہی پر اپنی محبت صرف کرو۔ ان کے حق میں خدا سے دعائیں مانگو۔ اور مصیبت پر صبر کرو کہ خدا کی مرضی۔ شاید عاقبت میں انہی مصیبتوں کے طفیل سے

ہم پر رحم ہو۔ کسی اُستاد کا کیا اچھا قطعہ ہے۔ ؎

قسمت کیا ہر ایک کو قسّامِ ازل نے
جو شخص کہ جس چیز کے قابل نظر آیا
بُلبُل کو دیا نالہ تو پروانے کو جلنا
غم ہم کو دیا سب سے جو مشکل نظر آیا

اے خُدا ہم کو صبرِ جمیل کی توفیق دے۔ آمین۔ آدمی کو چاہیے کہ جب اُس پر کوئی مُصیبت نازل ہو دُوسرے بندگانِ خُدا کے حال پر نظر کرے اور وہ پائے گا کہ ہزاروں آدمی اُس سے بدتر حالت میں مبتلا ہیں۔ تم گھر کے گھر میں بے چاری ... کو دیکھو بڑی ناشُکری کی بات ہے کہ ہم ٹوکروں اِحسان اور چھکڑوں سُلوک بُھول جائیں اور تنکے بھر رنج کی برداشت نہ کریں بشیر بچّہ ہے۔ تم کو روتے دیکھ کر سہما جاتا ہوگا۔ اُس کے حال پر رحم کرو۔ اپنے حال پر رحم کرو کہ کیا تمھاری حالت ہوگئی ہے آخر یہ کالبدِ خاکی سدِّ سکندر تو نہیں ہے۔ اِسی طرح رنجوں کے مارے اِس کو تحلیل کر ڈالوگی تو کیا انجام ہوگا۔ ۴ جون سنہ ۱۸۶ء

خط ۳

تمھارا دہلی سے نفرت کرنا یہ تمھارے حق میں ایک فالِ نیک ہے اور جِس کو خُدا نے عقل و غیرت و حمیت دی ہوگی ضرور ہے کہ وہ اہلِ دہلی کے اوضاع و عادات ناپسند کرے۔ تم اپنے تئیں ایسا سمجھو کہ بہ ضرورتِ تحصیلِ علم پردیس میں ہو تم اُن جھگڑوں میں مت پڑو۔ میں جانتا ہوں کہ اُن کو دُنیا

اکارت ہے لیکن کیا کروں دینا ہی پڑتا ہے۔ تم اگر وہاں نہ ہوتے تو شاید برسوں بھی میں دہلی کی خبر نہ لیتا اور تم کو معلوم ہے کہ میں نے اُن لوگوں کو ناقابلِ خطاب سمجھ کر مطلقاً ترکِ مراسلت کیا۔ میں نہیں سمجھتا کہ مجھ سے اُن لوگوں کو گزند کیا پہنچتا ہے۔ میں کسی طرح اُن کا بارِ خاطر نہیں۔ خدا نے تمام عمر مجھ کو اُن کا شرمندۂ احسان نہیں کیا اور جہاں تک ہو سکتا ہے سلوک کر دیتا ہوں۔ اگر شیوۂ انصاف سے دیکھو تو مرد اور عورت بڑے اور چھوٹے ہر ہر متنفس کے ساتھ کچھ نہ کچھ ایصال نفع ضرور کیا ہے۔ احسان فراموشی کا علاج نہیں۔ خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ اُس نے اپنے فضل و کرم سے مجھ کو اُن کی مدح و ذم دونوں سے مستغنی کیا ہے۔ اگر یہ لوگ میری مدح کریں تو مجھ کو کیا بخش دینگے؟ سوائے اِس کے کہ مجھ کو خوش کر کے دو چار روپیہ مجھ سے لیں۔ مجھ کو کونسا نفع پہنچا سکتے ہیں اور اگر ساری دِلی میں مجھ کو بُرا کہتے پھریں تو میرا کیا نقصان ہے؟ اب ذرا بجنور والوں کی غیرت کو دیکھو کہ مولوی ... صاحب کا مجھ پر کتنا بڑا حق ہے اور اگر آ کھڑے ہوں تو میں اُن کو ٹال نہیں سکتا۔ اُن کے ہاتھوں سے مجھے کبھی کسی قسم کی ایذا نہیں پہنچی اور اُن کے مقابل حضراتِ دہلی ہیں کہ عمر بھر دیتا رہا اور پھر بھی

اُن کے مزاج دُرست نہ ہوئے۔ حقیقت میں یہ مادّہ حسد ہے۔ اُن کو جلن اِس بات کی ہے کہ خُدا نے اُن میں سے کسی کو یہ نعمت نہیں دی۔ بشیر خُدا کے لئے تم اپنے خیالات اُونچے۔ حوصلہ فراخ۔ ہمّت بلند۔ نظر سیر رکھو۔ تُف ہے اُس آسائش پر جو دُوسرے کے طُفیل میں حاصل کی جائے خُدا تم کو کسی کا دستِ نگر نہ کرے اور ہمیشہ تمھارے ہاتھ سے لوگوں کو دِلواتا رہے۔ برخوردار۔ تم اِن سب باتوں سے قطع نظر کرو اور پڑھنے میں جی لگاؤ جِس کی بڑی ضرورت ہے۔ تم اپنی کوئی حاجت ...... سے متعلّق مت رکھو اور تم کو میرے برتاؤ سے خود معلوم ہو جائیگا کہ میں کہاں تک تمھارے مقابلے میں رُوپے کو عزیز رکھتا ہوں۔ اے دشمنانِ عقل۔ اگر رُوپیہ تمھارے خلافِ خواہش کچھ پس انداز ہوگیا ہے تو تم کو اِس کا حسد کیوں ہے؟ میں تو اِس کو اپنے ساتھ نہیں لے جاؤنگا یہ لوگ کبھی خوش ہو نہیں سکتے تاوقتیکہ اپنے حسد کے مُطابق مجھ کو تنگ حال نہ دیکھیں۔ بشیر۔ کہاں تک تم سے دُکھڑا روؤں معاملے کی صفائی کا یہ حال کہ گھر کے گھر میں نصف رُوپیہ غائب۔ تم اِن جھگڑوں میں اپنا وقت ضائع مت کرو۔ اگر کہیں یہ خط نظر پڑ گیا تو نارِ فساد مُشتعل ہوگی اور تم پر سب مِل کر نرغہ کریں گے اِس خط کو پڑھ کر چاک کر دینا

میں نے صرف تمھاری اِطلاع کے لئے یہ حال لکھا ہے ورنہ میں نے تو سمجھ لیا ہے ع شاد باید زیستن نا شاد باید زیستن ... کے باب میں یہاں بیٹھا ہوا کیا رائے دُوں مُصالحہ اچھا ہے ۔ بشرطیکہ صمیمِ قلب سے اِس کی خواہش ہو اور طرفین سے اُس کی تمنّا کی جائے ۔

بشیر ذرا کھانے پینے میں اِحتیاط رکھا کرو وہ اِحتیاط یہ ہے کہ اوقاتِ مُنضبط ۔ خلافِ وقت مت کھایا کرو اور اقسامِ اطعمہ بھی مُضر ہیں ۔ ایک غذا سے جو جی کو بھائے پیٹ بھر لینا ضامنِ تن دُرستی ہے ۔ ۱۵ - جون سنہ ۱۸۷۶ء

خط ۴

تمھارے کان بھی اِس مصرع سے ضرور آشنا ہوں گے ۔
ع خُدا پنج انگشت یک ساں نہ کرد ٭ طُول اور وضع اور تعدادِ انامل کے اِختلاف سے انگلیوں کو اِعانت اور اِستعانت کا عُمدہ موقع دیا گیا ہے یعنی انگلیوں کے اِختلافِ حالت نے ہاتھ کو زیادہ قوی اور بہ کار آمد بنا رکھا ہے مگر اِس اختلاف کی بھی ایک حد ہے مُعیّن ۔ جس میں افراط و تفریط کی گنجائش نہیں ۔ یہی حال ہے ایک خاندان کے لوگوں کا اگر اُن کی حالتیں ایک اندازۂ مُناسب تک مُتفاوت ہیں تو یہ اِختلاف مُنفرداً اُن کے اور مجتمعاً سارے خاندان کے حق

ہیں، مفید ہوگا۔ لیکن فرض کرو کہ کسی کے ہاتھ کی ایک انگلی بے موقع بڑھ کر گز بھر کی ہو جائے تو وہ لمبوتری انگلی عذاب ہو گی اپنے حق میں اور دوسری انگلیوں کے حق میں اور سارے ہاتھ کے حق میں تموّل کے اعتبار سے اپنے خاندان کے ہاتھ میں وہ لمبوتری انگلی میں ہوں نہ آپ خوش رہ سکتا ہوں اور نہ اوروں کو خوش رکھ سکتا ہوں۔

خط ۵

مجھ کو ہر چند کوئی خاص ضرورت تم کو خط لکھنے کی اِس وقت نہیں ہے مگر مولوی ... صاحب نے پرچہ مانگا اِس واسطے یہ چند سطریں لکھ دیں۔ امتحانِ سالانہ بہت قریب ہے۔ اپنی تمام ہمّت توجّہ حفظِ کتب میں مصروف رکھو۔ اگر سالِ آئندہ میں تم نے 'سکنڈ کلاس' میں ترقّی نہ کی تو مجھ کو سخت افسوس ہوگا۔ ہر چند تم مجھ سے زیادہ مواقع اِس بات کے تجویز کرنے کے رکھتے ہو کہ کامیابی کے لئے کون سی تدبیر عمدہ ہے لیکن زبان دانی بے تسوید یعنی کمپوزشن کے نہیں آتی اور اِس خصوص میں تم نے میرے نزدیک غفلت کی اور کرتے ہو۔ وقت کے اِنتظام کے ساتھ صرف کرنے میں عجیب برکت ہے۔ تھوڑا تھوڑا روز حاصل کرتے کرتے ایک ذخیرہ جمع ہو جاتا ہے مدارس کی تعلیم میں

اگر پسندیدگی ہے تو یہی کہ مختلف علوم اور متعدد فنون ایک ساتھ سکھائے ہیں۔ اگر ایک ہی چیز کو آدمی دن بھر رٹا کرے تو طبیعت اُکتا جاتی ہے۔ لیکن اگر کئی چیزیں پیشِ نظر ہوں اور باری باری سے دیکھے تو سارا دن پڑھتا رہے اور مطلق جی نہ گھبرائے۔ میں ایسا اِنتظام کر سکتا ہوں کہ اگر انگریزی کمپوزیشن بھیج دیا کرو تو پادری صاحب سے اِصلاح لے کر واپس کر دیا کروں۔ یہ اُس صورت میں مُناسب ہوگا جب کہ تم کو اِصلاح دہندہ وہاں مُیسّر نہ ہو۔ عربی میں مولوی ... صاحب تم کو بہت کچھ مدد دے سکتے ہیں بہ شرطیکہ اخذ و اِعطا کی شرطیں طرفین سے ادا ہوں۔

خط ۶

۸۔ جنوری کو رات کے نو بجتے بجتے میں اپنے ضلع میں پہنچ گیا۔ ٹرین نے اِبتدائے روانگی میں کچھ دیر کی پھر راہ میں زائد از معمول وقفات ہوئے۔ غرض تین بجے کے بعد بکسر پہنچا ورنہ میں شاید سویرے پہنچ جاتا۔ راہ میں جو لوگ میری گاڑی میں تھے اِتفاقاً اُن میں ایک ہندوستانی ڈاکٹر بھی تھا۔ میں نے تمھارے داد کا تذکرہ کیا۔ وہ تو کچھ چُپ سا ہوا۔ مگر ایک یوروپین جنٹلمین نے کہا گوا پاوڈر داد کے لئے نہایت نافع ہے اور اِس وقت ڈاکٹروں کا اجماع

ہے اِس بات پر کہ داد کی دوا اِس سے بہتر نہیں یہ ایک سفید شغوف ہے انگریزی دوافروشوں میں شاید آٹھ آنے کو اِس کی شیشی ملے گی۔ خُوبی یہ ہے کہ حاد اور قاطع نہیں رتی بھر ہتیلی پر رکھ کر دو تین قطرہ پانی میں لت کرکے داد پر مل لیا کرو۔ صُبح و شام استعمال کرو غالباً تین دِن میں نفع ظاہر ہو جائے گا۔ ۹۔ جنوری ۷۷ء

خط ۷

۱۷۔ کا خط پہنچا۔ بندۂ خُدا اتنی دیر مت کیا کرو۔ کیا کفایت شعاری اِسی میں منحصر ہے کہ مُجھ کو خط لکھنے میں کمی کی جائے۔ میں نے تم کو پہلے بھی لکھا ہے اور اب پھر لکھتا ہوں کہ اِمتحان کے بھروسے پر مت رہو۔ کسی طرح جماعت میں ترقّی کرو اور آگے کو نصیحت پکڑو۔ مدرسے میں کامیابی اور نام وری کے ساتھ پڑھنا یوں تو نہیں ہوگا مدرسے کے علاوہ گھر پر کم سے کم تین چار گھنٹے روز دل لگا کر پڑھوگے تو خیر ورنہ کیوں خود حیران ہوتے ہو اور کیوں ہم سب کو حیران کرتے ہو۔ دُنیا کی کارروائی کے لائق تم کو لکھنا پڑھنا آہی گیا ہے۔ پس میرے پاس رہکر قانُون یاد کرو اور اِمتحان دو۔ مدرسے میں پڑھنا منظُور ہے تو یاد رکھو 'انٹرنس' پہلی منزل ہے۔ بھلا کچھ نہ ہو تو 'بی۔ اے' کے

خطاب تک تو ہو۔ بشیر! درجۂ فضیلت حاصل کرنے کے ہرگز یہ ڈھنگ نہیں جو تمھارے ہیں۔ ہر روز کے سبقوں کو بالالتزام مطالعہ اور پڑھنے کے بعد نظرِ تدقیق سے اِن کو دیکھنا اور ذہن نشین کرنا اور ایک درجۂ اعتدال کے ساتھ محنت کا برابر جاری رکھنا شرطِ ضروری ہے۔ تمھارا یہ حال ہے کہ پہلے ہی اِمتحان میں یہ تردّد کہ پاس ہوئے یا نہیں، تو اگلے امتحان کہیں سخت ہیں کیونکر اُن سے عُہدہ برا ہو سکوگے۔ غرض پڑھنا ہے تو پڑھنے کے طور پر پڑھو۔ کہیں چاندنی چوک جا نکلے کہیں عجائب خانے کی سیر کی۔ کچھ وقت قِصّے کہانیوں میں ضائع کیا۔ دو گھڑی رات گئی اور سو رہے۔ یوں تو پڑھنا نہیں آتا۔ پڑھنا جب آسکتا ہے کہ تم ایک ایک 'منٹ' کی قدر کرو اور جہاں تک تن درستی اِجازت دے محنت کرتے رہو۔ تم اب تک مجھ سے صِرف عربی میں پوچھتے تھے۔ آیندہ ریاضی بھی پوچھا کرو۔ زیادہ نہیں تو 'انٹرنس' تک تم کو بتاؤں گا۔ حساب و جبر و مقابلہ کی خامی متوجّہ ہوکر نکال ڈالو۔ تاریخ کے واقعات بہ طور سوال و جواب مرتّب کرتے جاؤ تب اِمتحان دینے کا مزہ ہے۔ نری دُعا سے کام نہیں چلتا۔ شوق نہیں ورنہ مولوی ... کے ہوتے تم کو عربی کا حاصل کرنا کیا دشوار

تھا۔ ندرت کی چیزوں کا حیلہ اور ان میں بھی نقصان۔

مولوی صاحب نے کئی مکان نئے لیکن سب جائداد میں دکان مجھ کو پسند ہے باقی محل اور حویلیاں سب آخور کی بھرتی۔ غضب ہے . . . والا مکان تیرہ سو کا ہے اور تین روپیہ کرایہ "نوٹ" کے حساب سے اس کا کرایہ چار روپے آٹھ آنے ہونا چاہیئے۔ مگر کوئی اہتمام نہیں کرتا۔ ہم نے مکان مفت نہیں پایا۔ گٹھری بھر روپیہ دیا ہے۔ تو کیا وجہ کہ ہم کو پورا نفع نہ ملے۔ مولوی صاحب کے مزاج میں رحم۔ بیوی صاحب کو خیال نہیں۔ تم کو لیاقت نہیں۔ مولوی دعاگو کو قابلیت اور فرصت دونوں نہیں۔ مکان لاوارث سا پڑا ہے۔ اگر کرایہ داروں کو یہ حال معلوم ہو تو تین روپے بھی نہ دیں۔ بڑی حویلی ہمیشہ خسارہ دیتی ہے مگر اعمالِ بد کی طرح بارِ دوش ہے۔ خدا ہی ہے کہ اس کا بوجھ سر سے ٹلے جب تجربہ کر لیا کہ دہلی و بجنور دونوں میں کوئی انتظام کرنے والا نہیں تو عاجز آکر "نوٹ" کا پہلو اختیار کیا ورنہ کوئی کرنے والا ہوتا تو حلال طور پہ ایک "ڈپٹی کلکٹر" کی تنخواہ کماتا اور اصل محفوظ۔ بس غنیمت ہے کہ بیچارے مولوی صاحب باوجودِ معذوری اتنا بھی کرتے ہیں ورنہ ہم سب تو جیسے منتظم اور ہوش یار ہیں ظاہر۔ فقط ۲۱۔ جنوری ۱۸۴۴ء

خط ۸

مولوی ... صاحب کا حال فی الواقع سخت افسوس کے قابل ہے۔ خدا اُن کو صبر دے۔ اگرچہ میں طریقۂ مُروّجۂ ماتم پرسی کو ناپسند کرتا ہوں مگر تمھارے کہنے سے میں نے خط لکھا۔ مشکل ہے کہ مولوی صاحب کسی طرح کی تعزیت سے تسلّی پاسکیں مگر بہ مُرورِ وقت آدمی خود بخود صبر حاصل کرتا ہے گو ایسا صبر عندالشّارع نامحمود ہے۔

یہاں قحطِ شدید کے سامان ہو رہے ہیں۔ برسات ۵ جون سے شُروع ہوتی ہے سو مہینا گذر گیا پانی نہیں اور پچھلا برس بالکل خشکی میں گذرا۔ اگر امسال بارش نہیں ہوئی تو ایسی بڑی آفت ہوگی جس کا کوئی تصوّر نہیں کرسکتا۔ خلق اللہ سخت پریشان ہے۔ بلھاری میں دو سیر اور یہاں چار سیر اوسط نرخ۔ العیاذ باللہ۔

بشیر۔ اب تو ماشاء اللہ تمھاری انگریزی اچھی ہوگئی ہے۔ میرے خط میں جو انگریزی پرچہ ... کے نام کا ملفوف تھا وہ ضرور تمھاری عبارت ہوگی۔ بالکل غلطی سے پاک بشیر۔ ذرا عربی۔ نری انگریزی پڑھ کر آدمی مبہوت ہوجاتا ہے۔ خدا جانے یہ کیا وبال ہے۔ کیوں جی میاں بشیر اِن دِنوں مُنقبض کیوں؟ ہو نہ تو ہم کو کبھی اپنا سبق لکھتے ہو

نہ کوئی فرمائش کرتے ہو۔ بندۂ خُدا اِس قدر جلد کیوں مَلُول ہو گئے؟ ہم خود دُنیا سے مَلُول ہیں۔

یہاں آدم صورت بہت ہیں مگر آدمی نہیں ؎

بس کہ دُشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا
آدمی کو بھی مُیسّر نہیں اِنساں ہونا

۲۰ - رجب ۱۲۹۴ھ

خط ۹

جناب ... کی خدمت میں آداب کے بعد

میاں ... نے اپنا مزاج ابھی تک مُطلق دُرست نہیں کیا۔ سب سے ہمیشہ لڑتے جھگڑتے اور مُجھ کو بدنام کرتے ہیں اِن نالائق اور کمینہ لڑائیوں کی خبریں تمام مشہور ہوتی ہیں جس کے سُننے سے مُجھ کو سخت اِیذا ہوتی ہے۔ تنخواہ اُن کی ابھی تک واقعی نہیں ملی اور یہاں نوّابی کارخانے ایسے ہی ڈھیلے اور سست ہیں اور کیسی نوکری اور کس کی تنخواہ نواب صاحب کی بندہ نوازیاں ہیں ورنہ اِن لوگوں کو احدیوں کی طرح پڑے رہنے کے سِوائے کُچھ کام نہیں۔ میں نے جو کُچھ رُوپیہ بھجوایا میری تنخواہ کا تھا انگریزی تنخواہ اب تک ایک کوڑی وصُول نہیں ہوئی۔ ہر کام میں دیر ہر مُعاملے میں توقّف یہاں کا دستُور ہے۔

مولوی ... صاحب نے اپنے والد کو بھی کچھ روپیہ بھیجا ہے۔ بیٹے کی نوکری پر نازاں ہیں اور یہاں یہ حال ہے کہ آج ہے تو کل نہیں۔ مطلق بے اعتبار و بے ثبات۔ ایسا نہ ہو کہ مولوی ... کی اتنی بڑی نوکری سن کر والد بزرگ وار پاؤں پھیلائیں۔ ۱۸۷۷ء

خط ۱۰

یہ خیال کرنا بڑی بے انصافی اور ہٹ دھرمی کی بات ہے کہ دوسری قوموں کے رسم و رواج عموماً لغو و بیہودہ ہیں اور اس سے بڑھکر بے انصافی اور ہٹ دھرمی کی بات یہ ہے کہ کسی دوسری قوم کے آدمی سے نفرت کی جائے یا اُس کو نظرِ حقارت سے دیکھا جائے صرف اِس وجہ سے کہ وہ دوسری قوم کا ہے۔ ہم کو ہندوؤں کے ساتھ بڑا قوی تعلق ہے جس کی لوگ کیسی عمدہ تشبیہ دیتے ہیں کہ ہمارا ان کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ ہمارا ان کا ایک جگہ رہنا سہنا ملنا جلنا۔ لین دین پشت ہا پشت اور سیکڑوں برس کا ہے۔ ہم آپس میں لڑیں یا جھگڑیں روٹھیں یا بگڑیں مگر کہلائیں گے ہندوستانی۔ انڈین نیٹو کالا لوگ۔ ہم دونوں کے اغراض ایسے مشتبک اور وابستۂ یک دگر ہیں کہ ہم کسی طرح ایک دوسرے سے چھوٹ نہیں سکتے۔

پس ہم دونوں کا مفاد اِسی میں ہے کہ جہاں تک ہو سکے ایک دُوسرے کی طرف سے دل صاف رکھیں۔

ہاں تو میں ہندوؤں کے چند رواج بیان کرنا چاہتا ہوں سب سے پہلے گائے بیل کی بزرگ داشت سے چلو۔ اُن منفعتوں پر نظر کرو جو بنی نوعِ اِنسان کو اِس جانور سے پہنچتی ہیں تو دُنیا کا کوئی جانور اتنا بہ کار آمد نہیں سب پر مُقدّم کاشت کاری کہ اُس میں جتنے کام مشقّت کے ہیں بہ تمامہا اِسی جانور سے لیے جاتے ہیں۔ سواری۔ باربرداری۔ دُودھ۔ گھی۔ یہاں تک کہ مَرے پیچھے بھی ہڈّی۔ چمڑا۔ سینگ کوئی چیز بے مصرف نہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ جِس شخص نے ہندوستان میں اِس جانور کی بزرگ داشت کا قاعدہ جاری کیا بڑا ہی دانشمند اور عاقبت اندیش ہو گزرا ہے۔ اُس نے مُلکی ضرورت پر نظر کی اور یہ بھی سمجھا کہ تا وقتیکہ داخلِ احکامِ مذہبی نہ کی جائے پُوری پُوری بزرگ داشت مُمکن نہیں۔ اِسی طرح گنگا جمنا کی تعظیم بھی بے اصل نہیں۔ میں اپنے نفس پر قیاس کرتا ہوں کہ مُجھ کو بجنور کے تعلّق سے گنگا کے ساتھ ایک اُنسِ خاص ہے۔ جب کبھی عُبور کا اِتّفاق ہوتا ہے پیاس نہ بھی ہو تو بے اِختیار اُس ہاضم اور شفّاف اور سرد پانی کو جی چاہنے لگتا ہے۔ کئی بار ایسا

بھی ہوا کہ نماز کا وقت نہیں ہے اور میں ٹھہرا رہا ہوں کہ دریا کے پانی (گنگا جل) سے (اشنان نہیں) وضو کرکے دو رکعت پڑھ لوں تو چلوں۔ ہندوستان کی کروڑوں بیگھ زمین گنگا اور جمنا سے سیراب ہوتی ہے۔ معلوم ہے کہ پانی محاسنِ قدرت میں سے ہے اور لوگ مصنوعی تالابوں اور نہروں سے جی خوش کرلیتے ہیں تو کیا گنگا جمنا اِن سے بھی گئی گزری ہوئیں۔ مُلک کی گرمی اور آب و ہوا کے لحاظ سے ہندوؤں میں ہر روز کے غُسل (اشنان) کا قاعدہ بھی پسند کرنے کے قابل ہے۔

'یورپ' میں 'ڈاکٹروں' کا اگر اِجماع نہیں تو غلبۂ رائے اِس طرف ضرور ہے کہ اِنسان کو خُدا نے گوشت کھانے کے لئے نہیں بنایا کیوں کہ اِس کام کے لئے نہ تو اِس کے دانت مُناسب ہیں اور گوشت خوار جانوروں کے معدے میں ایک قسم کے تیزاب کی تولید ہوتی رہتی ہے جو گوشت کو خُوب ہضم کرتا ہے۔ اِنسان کے معدے میں اُس تیزاب کے پیدا کرنے کی بھی صلاحیت نہیں۔ یہ ہے ماخذ 'وجیٹیرین' لوگوں کا جو ہمارے مُلک کے ہندوؤں کی طرح گوشت نہیں کھاتے اور 'یورپ' میں یوماً فیوماً زیادہ ہوتے جاتے ہیں۔ ایک بار اخبار میں نظر سے گزرا کہ امریکہ کے

ڈاکٹروں' نے بہ دلائل ثابت کیا ہے کہ آدمی کا جھوٹا آدمی کو طبّاً مُضر ہے۔

غرض کسی قوم کسی مُلک کا کوئی مُبتذل سے مُبتذل رواج بھی مصلحت سے خالی نہیں ہاں مُمکن ہے کہ لوگ اِس میں کچھ مُبالغہ کرنے لگے ہوں یا لوگوں کی حالت بدل جانے سے اُس میں ترمیم کی ضرورت ہو۔ اِن وقتوں کے انگریزی خوانوں کا عام رُجحانِ طبع کہ اپنے مُلک کی ہر چیز کو حقارت سے دیکھتے ہیں انھیں کے بے جا تعصّب اور نادانی کی دلیل ہے۔

مُدّت کی بات ہے۔ گورکھ پور میں کچھ دنوں شہر کی صفائی کا 'چارج' میرے پاس رہا۔ ولایت سے صفائی کے مُتعلّق ایک کتاب نئی آئی تھی۔ صاحبِ کلکٹر نے مجھ کو دی کہ دیکھو اِس میں سے شاید کوئی بات اخذ کرنے کی ہو۔ میں نے اُس کو پڑھا تو معلوم ہوا کہ ایک 'کمیشن' بیٹھی تھی اِس بات کی دریافت کے لئے کہ سلبِ عفونت کی آسان تدبیر کیا ہے؟ اہلِ 'کمیشن' نے فرانس۔ قسطنطنیہ۔ عرب۔ مصر۔ ہندوستان۔ غرض تمام اطراف و اکناف میں برسوں تحقیقات کی۔ آخرِ کار ثابت ہوا کہ مٹّی بالخاصّہ دافعِ عفونت ہے۔ وہ کتاب جو صاحب نے مجھ کو دی تھی

اِس کمیشن کی رپورٹ تھی۔ اُس کے پڑھنے سے مجھ کو دو خیال پیدا ہوئے۔ اوّل تو انگریزوں کی تلاش کہ ایک ڑی سی بات کے لیے اِس قدر زحمت۔ دُوسرے جو بات اِس قدر تحقیقات کے بعد دریافت ہوئی اب سے تیرہ سو برس پہلے ہمارے پیغمبر صاحب کو معلوم تھی اور اُنھوں نے مٹی کو طاہر طہور فرمایا۔

حصۂ نظم

ایک گھرانے کی قبریں

[ترجمۂ نظم مس ہمنس شاعرۂ انگلستان]

سب پھول تھے ایک ہی شجر کے
گویا تھے چراغ سارے گھر کے
وہ ایک ہی جگہ پلے تھے
اور حسن کے ساتھ بڑھ رہے تھے
کیا وقت وہ تھا جو سب بہم تھے!
عنقا الم و ملال و غم تھے
سب خوش تھے عجب دلوں کو کل تھی
اُن کے دم سے چہل پہل تھی
قبروں میں ہیں ہائے اب وہ تنہا!
حائل ہیں پہاڑ اور دریا
ماں عاشقِ زار اور شیدا
ہر شب دستور تھا یہ اُس کا

کس پیار سے سوتے ہیں وہ جُھک کے
بوسے لیتی تھی میٹھے میٹھے
ہر چند وہ پھُول سب کِھلے تھے
کیا کُچھ نہیں ماں کے حوصلے تھے
رہتے تھے نظر کے سامنے سب
پروانہ تھے سب یہ - دِن ہو یا شب
افسوس! کہ اب وہی نہاں ہیں
اے موت! بتا کہ سب کہاں ہیں؟
اُس پانی میں ایک کی ہے تُربت
جس کی ہے بہت سیاہ رنگت
ہے ایک کی خواب گاہ - اے وا!
جنگل سُنسان امرکہ کا
سُنتا ہوں غریب کی لحد پہ
ہے سایہ کیئے ہوئے صنوبر
اُس بحر میں ڈُوبا اِک اکیلا
پانی جِس کا ہے خُوب نِیلا
اُس جا سوتا ہے تہہ کے اندر
جس جا سے نکالتے ہیں گوہر
آبی تُربت پہ اُس کے اصلا

اب کوئی نہیں ہے رونے والا
اسپین میں ایک سو رہا ہے
اُس قبر پہ تاک رو رہا ہے
شمشیر زنی زبس رہی واں
ندی اِک خُون کی بہی واں
رایت کو لئے تھا کس ہنر سے
باندھے مضبُوط تھا کمر سے
دُشمن کہیں چھین کر نہ لے جائیں
اُلٹی نہ اُسے شکست دے جائیں
اِک اُن میں سے دفن اب وہاں ہے
مہندی کا بڑا شجر جہاں ہے
ہلکے ہلکے ہوا کے جھونکے
مل کر شاخوں سے پھُنگیوں سے
برساتے ہیں پتّیاں وہ اتنی
چادر بن جائے اِک لحد کی
جا کر وہ اطالیہ مری ہے
پھُولوں کی جہاں بہار بھی ہے
گھر بھر میں وہی تو اِک حسیں تھی
پیاری صُورت تھی نازنیں تھی

سوتے ہیں الگ وہ دلبر
جس جا جنھیں لے گیا مقدّر
وہ میٹھے سُروں میں اُن کا گانا
گا گا کے ہر اِک کا دل لُبھانا
آتش خانہ بھی گونج اُٹھتا
یہ حال تھا اُس گھڑی صدا کا
ہر وقت ہنسی تھی قہقہے تھے
آپس میں مذاق چہچہے تھے
اے موت! غضب کا سامنا تھا
ہوتا اندھیر ہائے کیسا؟
برباد یہ ساری زندگی تھی
مٹّی تھی خراب پھر وفا کی
ہوتا جو نہ حشر کا سہارا
ملنے کا طریقہ اور کیا تھا؟

(سیّد علی سجّاد دہلوی
(مصنّف نئی نویلی)

دہلی کے کھنڈر

جدھر دیکھو اُدھر ویرانہ ہی ویرانہ پاتے ہیں
عجب ہُو. حق کا عالم ہے جہاں اوسان جاتے ہیں

عجب عبرت فزا نظّارہ ہے گورِ غریباں کا
نشانِ نیست اُن کے ٹھوکروں میں ملتے جاتے ہیں
شکستہ قبریں کچھ ہیں اور گڑھے دو چار باقی ہیں
جو اپنا خندۂ دنداں نما ہم کو دکھاتے ہیں
پڑے پھرتے ہیں دہقاں بے تکلّف جن کی قبروں پر
وہ آغوشِ لحد میں بے خبر آرام پاتے ہیں
لٹیرے اِس جگہ کو اپنی جولاں گاہ کرتے ہیں
درندے اِن کی قبروں میں اب اپنا گھر بناتے ہیں
پڑے ہیں دُور آبادی سے وہ اِس کس مپرسی میں
ہم اُن کی بے کسی پر یوں کھڑے آنسو بہاتے ہیں
یہی ہیں جو چراغِ خانہ تھے اور شمعِ محفل تھے
اب اِس شہرِ خموشاں میں اِنھیں بے یار پاتے ہیں
وہ دن بھی تھے کہ اُن کے محل میں نقّارے بجتے تھے
مگر اب بُوم اُن کی قبر پر نوبت بجاتے ہیں
کہیں حسرت۔ کہیں شوکت۔ کہیں عظمت برستی ہے
نشانِ رفتگاں۔ خاموش۔ افسانے سُناتے ہیں
یہ سنّاٹا۔ یہ قبریں۔ اور یہ میداں کہہ رہے ہیں کچھ
سُنو! سب بے ثباتی کے سُریلے راگ گاتے ہیں
یہ دُنیا چند روزہ ہے۔ مزے بھی چند روزہ ہیں

غُرور و نخوت و دولت بھلا کس کام آتے ہیں؟
اُٹھو اے سونے والو! بادۂ غفلت کے سرشارو!
ذرا آنکھیں تو کھولو۔ دیکھو۔ تم کو کیوں جگاتے ہیں
خبر بھی ہے زمانے نے لیا ہے رنگِ نو کیسا؟
تمھاری قوم والے مٹ چکے اور مِٹتے جاتے ہیں
زباں خاموش کیوں ہے؟ کچھ تو بولو۔ کون تھے کیا تھے؟
کچھ اپنی تم کہو ہم سے۔ کچھ اپنی ہم سناتے ہیں
نہیں اُٹھتے۔ نہیں سنتے۔ الٰہی! کیا قیامت ہے؟
یہ کیسے سنگدل ہیں! اس طرح سے دل دُکھاتے ہیں
بھلی معلوم ہوتی ہے تمھاری شانِ گمُ نامی
عدم کے رہنے والو! تم سے مِلنے ہم بھی آتے ہیں

محمد انعام الحق
بی۔ اے

غمِ برادر

فُرقت میں تیری دل ہے میرا فگار۔ بھائی!
لالہ کی طرح سینہ ہے داغدار۔ بھائی!
ہجراں میں گھُل رہی ہے جانِ نزار۔ بھائی!
آنکھوں سے چل رہے ہیں اشکوں کے تار۔ بھائی!

جب سے نہاں ہُوا تُو آنکھوں سے میرے پیارے
فُرقت سے ہے تمھاری دل بے قرار۔ بھائی!
ساماں سفر کا سارا تیّار کر چُکا ہوں
بس موت کا ہے باقی اب اِنتظار۔ بھائی!
رُوٹھے ہو مجھ سے ایسے۔ منتے نہیں منائے
کس بات پر ہے آخر مجھ سے غُبار؟ بھائی!
اَے رُوے یار تجھ بِن عالم میں ہے اندھیرا
آنکھوں کا اب ہے تارا شمعِ مزار۔ بھائی!
کِس نیند سو رہے ہو؟ جاگو تو سیر دیکھیں
گُلشن میں چل رہی ہے بادِ بہار۔ بھائی!
تُربت پہ تیری اِس کو کُچھ پھُول ہیں چڑھانے
بیدلؔ پرو رہا ہے اشکوں کے تار۔ بھائی!

{ محمد اسلم بیدلؔ

ماہِ صیام

اماں! بتاؤ۔ گھر میں یہ بے رونقی ہے کیوں؟
چہرے پہ آج آپ کے افسُردگی ہے کیوں؟
ماما بھی کام کاج سے فارغ کھڑی ہے کیوں؟
چُولھا ہے سرد دیگچی اوندھی پڑی ہے کیوں؟

آٹا ہی گُندھ رہا ہے نہ ہنڈیا ہے چڑھ رہی
اور مچ رہی ہے پیٹ میں میرے تو کھلبلی
اے جانِ مادر! آج سے ماہِ صیام ہے
اب دن کو اکل و شُرب سراسر حرام ہے
روزوں کا مومنوں کے لئے حُکمِ عام ہے
کافر ہیں جن کو حکم میں حق کے کلام ہے
سحری کے وقت تیرے لئے میری جاں مگر
کُچھ رکھ لیا تھا طاق میں دیکھ اور نوش کر
اماں! نہیں ہے یاد میں میری اگر خطا
ہر بار میں نے یہ تمھیں کہتے ہوئے سُنا
رحمان ہے رحیم ہے رزّاق ہے خُدا
اور مومنوں پہ اُس کے عطیّات ہیں سوا
رحمان ہو وہ اور ہمیں یہ اذیّتیں!
رزّاق ہو وہ اور ہمیں یہ مُصیبتیں!
مُنہ آپ کا ہے خُشک۔ ہیں ہونٹوں پہ پپڑیاں
چہرے پہ اُڑ رہی ہیں یہ دیکھو ہوائیاں
چینِ جبیں سے صاف غم و غُصّہ ہے عیاں
اعضا ہوئے ہیں فرطِ نقاہت سے ناتواں
کہتی تھیں آپ دین میں ہیں سب سہولتیں

دیندار ہو کے کیوں یہ اُٹھاتی ہو زحمتیں؟
کہتی تھیں آپ ہے وہ خُداوند بے نیاز
فارغ ز آرزُو و تمنّا و حرص و آز
بتلائیے برائے خُدا پھر مجُھے یہ راز
کیوں مومنوں پہ دستِ تحکُّم ہے یوں دراز؟
میرا تو دُور سے ہے سلام ایسے حُکم کو
مجُھ کو تو۔ یا خُدا۔ کبھی مومن نہ کیجیو
بیٹا! خُدا کے واسطے چھوڑو یہ شوخیاں
گندی کرو نہ کُفر کے کلموں سے یوں زبان
نامہرباں کبھی نہیں ہوتا وہ مہربان
ہیں اس کے ایک حُکم میں سو حِکمتیں نہاں
کیا میں بھی میری جاں تری دُشمن کہاؤنگی
گر جبر سے دوا تجُھے کڑوی پلاؤنگی؟
اماں! دوا کی آپ نے دی بے محل مثال
اِس سے تو ہو بحال۔ طبیعت ہو گر نڈھال
پر دیکھتا ہوں آپ کے روزوں میں یہ کمال
کرتے ہیں ضُعف سے مہِ کامل کو یہ ہِلال
حِکمت یہ خُوب ہے کہ قوی کو کرے ضعیف
چارہ یہ ٹھیک ہے کہ توانا بھی ہو نحیف

اے جانِ من! ابھی تمہیں موقع نہیں ملا
اس مسئلے پر غور و تعمق کا خوض کا
اس بات سے ہوئے نہیں تم پیارے آشنا
امراضِ باطنی کے لئے روزہ ہے دوا
روزہ سبیلِ معرفتِ کردگار ہے
جس پر فلاحِ ہر دو جہاں کا مدار ہے
منعم جو نام سے بھی نہ واقف ہو بھوک کے
آسودگی و عیش کی کیا قدر کر سکے؟
شکرِ خدا کی اس کو ضرورت ہی کیا پڑے؟
احسانِ حق کی یاد سے کیا کام ہو اسے؟
روزہ ہی قدرِ لذّتِ نعمت بتائے ہے
روزہ ہی شکرِ حق کا سبق یوں پڑھائے ہے
ملتی رہیں جو آب و خورش ہم کو پیٹ بھر
برداشت ہم نے کی ہو نہ تکلیف لحظہ بھر
مجبوریوں میں حال ہمارا ہو کیا بتر
عادت نہ صبر کی ہو تو جاں سے کرے گذر
روزے نے ہم کو صبر کی عادت سکھائی ہے
مجبوریوں میں جان ہماری بچائی ہے
زردے سے اور پلاو سے گر پیٹ ہو بھرا

فاقوں کی تلخیوں کا چکھا ہو نہ گر مزا
پھر ہم کجا؟ مصیبتِ فاقہ کشاں کجا؟
آہِ یتیم و نالۂ بیوہ پہ درد کیا؟
آگاہ ہیں جو حکمتِ حکمِ حکیم سے
ہمدردیاں ہیں اُن کو غریب و یتیم سے
بیمار ہے وہ رُوح جو درد آشنا نہیں
بیمار سر جو سامنے حق کے جُھکا نہیں
بیمار دل ہے جس میں تحمّل ذرا نہیں
بیمار آنکھ ہے جو حقیقت نُما نہیں
اے جانِ من! جو غور سے کچھ کام لو ذرا
امراضِ باطنی کے لئے روزہ ہے دوا

سراج الدّین احمد

اُون کا بیان

اُون کیا چیز ہے؟ کچھ بال ہیں اور کچھ بھی نہیں
ظاہری جال ہیں جنجال ہیں اور کچھ بھی نہیں
نہ یہ معشوق کی زُلفیں ہیں نہ اب گیسو ہیں
نہ یہ سنبل نہ بنفشہ ہیں نہ عنبر بو ہیں

نہ ہیں وہ دام کہ عالم کو پریشان کریں
نہ بلا ہیں کہ چڑھیں سر پہ تو بے جان کریں
نہ دھواں دھار گھٹا ہیں کہ اُٹھا کر طوفاں
خشک کر دیں گی ابھی غلہ فروشوں کی جاں
نہ یہ تاتار کا نافہ ہیں نہ یہ مشکِ ختن
روئے دشمن ہیں سیاہی میں نہ کالی ناگن
اِن میں آدھی بھی نہیں عنبرِ سارا کی مثال
جعدِ پُر پیچ کا اِک پیچ نہیں ہے فی الحال
شبِ یلدا شبِ ہجراں شبِ دیجور نہیں
بال ہیں اُترے ہوئے کچھ جنھیں مقدور نہیں
دستِ مقراض نے جڑ اُن کی اُڑائی ہوگی
تیزی ہر وار پہ چل چل کے دِکھائی ہوگی
اُستروں نے اِنھیں سر پر سے اُتارا ہوگا
خاص یہ خاص تراشوں[1] کا اِشارا ہوگا
کردیا جمع جُلاہوں نے پریشانی سے
قیمتی بن گئے کچھ بے سر و سامانی سے
آپ نے دام دیئے پھنس گئے خود جال میں آپ
دلِ عاشق کی طرح قید ہیں ہر بال میں آپ

---

[1] بادشاہی حجام کو خاص تراش کہتے ہیں ۱۲

اِن کی تعریف کی رسّی کو لپیٹے رکھّو
سخت زنجیر ہے - پاؤں کو سمیٹے رکھّو

مثال

بھیڑ وہ بھیڑ- غریبی میں ہے شُہرت جس کی
کوئی دس بیس روپے بھی نہیں قیمت جس کی
اِسی پوشاک سے ہے تن کو سجائے رکھتی
گرمی اور سردی سے جِسم اپنا بچائے رکھتی
برف و بارش میں اِسی سے ہے رُکاوٹ اِس کی
رات دِن ہے اِسی خِلعت سے سجاوٹ اِس کی
خاک اور پانی سے اکثر اِسے بھرتے دیکھا
پر نہ تن پر سے یہ ملبُوس اُترتے دیکھا
آپ کی طرح جو اِس اُون پہ اتراتی بھیڑ
پھُول کر بھیڑ سے بس بھیڑیا بن جاتی بھیڑ
اپنے ہم جنسوں کو اِک لات میں پدڑا لیتی
ایسا کرتی تو وہ نادان بھلا کیا لیتی؟
فخر ہے بھیڑ کی اُترن پہ تمھیں؟ واہ جی واہ!
چند بالوں کے سبب اتنے ہوئے ہو گُمراہ؟
رکھیے صندُوق میں کاغاں کا "السٹر" اپنا
نہ ظریفوں سے بِکھرواؤ پلسٹر اپنا

چُپ رہو۔ اتنی 'بلنکٹ' کی نہ تعریف کرو
مایۂ فخر سمجھتے ہو۔ تو گٹھری میں دھرو
رونگٹے دیکھ کے کمبل کے کھڑے ہوتے ہیں
ریچھ سُنتے ہیں تو حیران بڑے ہوتے ہیں
نرم گُدما ہے تمھارا تو ہمیں کام نہیں
کوئی بھٹّی نہیں چُولھا نہیں حمّام نہیں
نہ کرو لاف زنی۔ نرم اگر ہے پٹّو
داغ دے۔ دیکھنا۔ نالش نہ پہاڑی ٹٹّو
ہم نے مانا کہ ہے انمول تمھارا دھسّا
کیا زمانے میں کوئی اور نہیں ہے اُس سا؟
بِلّی کی دُم ہے نہ اتراؤ ذرا قاقم پر
تم ہو مردُم۔ کہیں بلّی نہ ہنسے اِس دُم پر
ہو مُبارک تمھیں۔ انمول ہے گر پاس سمُور
ڈھونڈتے پھرتے ہیں خرگوش چھپیں گھر میں حضور
ہے جو زر دار دوشالہ تو چھپا کر رکھو
ہو جو سادہ کوئی جوڑا تو اُسے گھر رکھو
کار چوبی جو مداخل ہے۔ تو مغرور نہ ہو
فلسِ ماہی دُمِ طاؤس کی خُوبی دیکھو
رگ کی تعریف سُنیں گے تو کہیں گے بدرگ،

دیکھو دیوانے نہ ہو۔ رہتا ہے رگ زن لگ بھگ
پہنو اچھے سے بھی اچھا نہ مگر اتراؤ
رگِ غیرت کو کبھی تو حرکت میں لاؤ
اوروں کی پشم پہ اِس طرح کا اِترا جانا!
ایسے دانا ہو۔ کہیں گھانس نہ تم کھا جانا

آؤ اب ریشمی کپڑے کی حقیقت سُن لو
نرم و باریک مضامین برغبت سُن لو
کس کا سرمایہ ہے ریشم؟ ہمیں سمجھاؤ تو
کس ریاست کا خزانہ ہے؟ بتا جاؤ تو
پیلہ اک کیڑا ہے۔ جو پیل نہیں شیر نہیں
پیل سے شیر سے ہوتا وہ کبھی زیر نہیں
توت کے پیڑ پہ کرتا ہے نشیمن اپنا
یعنے رکھتا ہے بلندی پہ وہ مسکن اپنا
پھینک دیتا ہے وہ فُضلہ۔ تم اُٹھا لیتے ہو
اپنی ترکیب سے کچھ اُس کو بنا لیتے ہو
اِسی فُضلے کا رکھا نام ہے تم نے پوشاک!
اِسی پوشاک کی ہے سارے زمانے میں دھاک!
اِسی پوشاک سے ظاہر ہے امیرانہ پن!

اِسی پوشاک کی مشہور ہے دُنیا میں پھبن!

رومی مخمل کا جو ملبوس پہن آتے ہو
تو شہِ رُوم ہی کاشانے میں بن جاتے ہو
گاہ تو دھیان ہے سینے کی صفائی کی طرف
دیکھتے ہو کبھی خوش قطع سلائی کی طرف
آستینوں پہ کبھی ہاتھ جو پھر جاتا ہے
ہاتھ کو پاؤں پھسلنے کا مزا آتا ہے
روغنِ بستہ کا دریا ہے رواں کوسوں تک
ہاتھ اِک ہاتھ میں ہوتا ہے رواں کوسوں تک
یہ تو سب کچھ ہے کہ وہ مخملِ کاشانی ہے
پہنا جس نے اُسے وہ قابلِ سلطانی ہے
نہ مگر اِس کی لجاجت کا سبب یاد رہا
عقدہ باریک تھا ہر تار میں۔ کب یاد رہا؟
آنکھ تو نرمیِ مخمل پہ لگائی تم نے
خواب کی اِس کے نہ تعبیر بتائی تم نے
ہے یہ اِس خواب کی تعبیر کہ بیدار رہو
دل ہے بیدار۔ تو کیوں مائلِ پندار رہو؟
ہے یہ وہ خواب۔ کہ سوتا نہیں بیدار اِس کی

اور جو سوتا ہے۔ تو تعبیر ہے اکسیر اِس کی
ہے یہ کمخواب ہی غفلت سے جگانے والا
خواب سے مردمِ دیدہ کو اُٹھانے والا

تیتری کا کبھی دیکھا ہے سجیلا خِلعت ؟
جامہ خوش قطع وہ۔ کچھ اس پہ وہ خود خوش خلقت
ٹِکلیوں دار مثلّث کی طرح کے دو پر
اِس قدر نازک و باریک کہ ٹھہرے نہ نظر
چتّیاں اِن میں جو صد رنگ نظر آتی ہیں
مینا کاری یدِ قُدرت کی یہ دِکھلاتی ہیں
دم بدم کُھل کے پروں کا وہ ادا سے جُڑنا
اِنھیں دو پنکھوں سے وہ اِس کا ہوا پر اُڑنا
تالیاں کیسی بجاتی ہے یہ ہر آن اُن سے!
پر ہیں دو تختِ رواں۔ خود ہے سُلیماں اُن سے
آپ کی طرح سے گر تیتری اترا جاتی
تو فلک پر کبھی اُڑتی نہ بلندی پاتی

کیسا ذیشان پرندوں کا ہے رنگیں بانا!
نہیں آتا ہے کسی ایک کو بھی اترانا

ایک پوشاک مہینوں نہ بدلتے دیکھا
مدتوں تک اسی اک جامے کو چلتے دیکھا
ایک وردی میں وہ خورسند رہا کرتے ہیں
دیکھ کر سب انھیں خوش باش کہا کرتے ہیں
ہے جڑاول یہی اُن کی یہی بارانی ہے
اسی جامے سے انھیں گرمی میں ذیشانی ہے
جوڑا غم کا ہے یہی اور یہی شادی کا لباس
ایک کترن بھی نہیں اس کے سوا اِن کے پاس
اس کو دھوبی کی نہ حاجت ہے نہ درزی کی تلاش
سوئی تاگے سے نہ مطلب ہے نہ ہے فکرِ تراش
یہی پوشاک پسِ مرگ کفن ہے اُن کا
واہ کیا خوب فقیرانہ چلن ہے اُن کا !
اپنے خالق کے عطیے پہ رضامند ہیں وہ
جو مقدر سے مِلا اُس پہ ہی خورسند ہیں وہ
کب ہیں درگاہِ خداوند میں کافر نعمت؟
مثلِ انسان نہیں اُن کے لئے ہر نعمت
صاف ظاہر ہے بہائم کی یہ خاموشی سے
کہ بری ہم رہے اِحسان فراموشی سے

باغ میں پھولوں کے وہ رنگ - وہ جوبن - وہ بہار
کہ تڑپ جائے نگہ دیکھ کے جن کو ہر بار
حسنِ صورت وہ غضب کا - وہ ستم کا انداز
صورتِ حسن میں ہر ایک ہر اِک سے ممتاز
جامہ وہ بوقلموں بر میں کہ اللہ اللہ!
باغ کھل جائے تصور میں جو پڑ جائے نگاہ
شام کی طرز نئی - شان الگ - روپ جدا
رنگ دیتی ہے انھیں چھاؤں جدا دھوپ جدا
جب نسیمِ سحری جسم کو چھو جاتی ہے
جو صفت دل میں بھری ہے وہ نکل آتی ہے
یہی خوشبو تو ہے مغزوں کو بسانے والی
ہے یہی شان انھیں ہار بنانے والی
اپنی پوشاک پہ خوشبو پہ جو اترا جاتے
سر و سینے پہ وہ انساں کے جگہ کیا پاتے؟

نتیجہ

پھول بننا ہے - تو کپڑوں پہ نہ ہرگز پھولو
سو کی اِک بات سناتے ہیں - نہ اس کو بھولو
روح سے میل اتارو تو وہ آراستہ ہو
علم کے رنگ میں دو ڈوب تو پیراستہ ہو

اِس سے بہتر کوئی پوشاک ہی انمول نہیں
جسم پر آئی ہے کیا ٹھیک کہیں جھول نہیں
داغ دھبّوں سے سدا اِس کو بچائے رکھنا
اِس کی پاکیزگی پر آنکھ لگائے رکھنا
اِس کا خالق نے بنایا ہے جو تانا بانا
اِس کی باریک نزاکت کا وہی ہے دانا
عالمِ عُلوی و سِفلی سے ہے وہ ہم رِشتہ
ایک سے تو ہے سِوا۔ ایک سے ہے کم رِشتہ
آگیا بوجھ گُناہوں کا جو اِس کے لگ بھگ
کاجو بھوجو سا ہے۔ ہو جائے کا چَٹ پَٹ سے الگ
یہ وہ خلعت ہے۔ نہیں خوف جسے رہزن کا
نہ تو کیڑے کا خطر ہے نہ پُرانے پن کا
خواہ دُنیا میں ہو کیسا ہی کوئی بادی چور
گُل سے خوشبو کے چُرا لینے کا ہو عادی چور
ہاتھ یہ مال کسی طرح نہیں آ سکتا
ہاتھ کیا آئے؟ یہاں ہاتھ نہیں جا سکتا
خلعتِ خاصۂ دربارِ خُداوندی ہے
واہ! کیا بخششِ سرکارِ خداوندی ہے!
یا خُدا! ارشدِ عاصی کو وہ حُلّہ ہو عطا

جس کی خوبی میں ہو پوشیدہ ہر اک میری خطا
ابرۂ و آستر اِک جنس کے اِک رنگ کے ہوں
ظاہری باطنی افعال کُل اِک ڈھنگ کے ہوں
صورتِ آبِ رواں صاف مرا دل ہو جائے
سہل آلودگی کی جتنی ہے مشکل ہو جائے
صفتِ موج اگر دل میں شکن آجائے
ایک ہی دم میں صفائی بھی معًا آجائے
اِسی ملبوس سے بازیب تنِ خاکی ہو
دُور مجھ میں سے ہر اِک زشتی و ناپاکی ہو

ارشد }

گداگری

جن کو ہے حُبّ الوطنی کا خیال
بحث میں لاتے ہیں یہ اکثر سؤال
مانگتے پھرتے ہیں جو اکثر گدا
دینا ہے کچھ اُن کو بھلا یا بُرا
فرقہ ہے کنسروٹو اُن میں جو ایک
کہتا ہے دینا ہے بہر حال نیک

مانگنے کی گو کہ ہے عادت بُری
اِس سے بھی ہے بُخل کی خصلت بُری
رد نہ سوالِ فُقرا کیجئے
جان بھی مانگیں۔ تو فِدا کیجئے
داد و دہش کے ہیں نتائج بڑے
اہلِ سخا کے ہیں مدارج بڑے
خیر کے کام آج جنھوں نے کیئے
کوثر و جنّت ہے کُل اُن کے لئے
اُن کے لئے وقف ہے دارُالسّلام
اُن کا ہے فردوس میں اعلیٰ مقام
مُلک میں جو لوگ ہیں دیرینہ سال
ہے یہی قال اُن کا یہی اُن کا حال
پر لبرل کی ہے خلاف اُن کے راے
جس میں بظاہر نہیں حجّت کی جاے
کہتے ہیں وہ۔ دیتے ہیں سائل کو جو
دونوں جہاں سے اُسے دیتے ہیں کھو
رہتا ہے دُنیا کا نہ وہ دِین کا
شرع کا پابند نہ آئین کا
اِس کو نہ غیرت نہ حمیت ہے کچھ

اور نہ ڈِھٹائی سے ندامت ہے کچھ
قُوّتیں جو اُس کو ہوئی تھیں عطا
سب کو دیا خاک میں اُس نے مِلا
جانتا ہے ۔ مانگنے کو ہے زبان
دُور دیک سُننے کی خاطر ہیں کان
سُونگھنے کو ناک ہے بُوئے طعام
دیکھنے کو آنکھ ہے خوانِ کرام
پاؤں ہیں پھرنے کے لئے در بدر
جوڑنے کو ہاتھ ہیں پیشِ بشر
دیتے ہیں جو بھیک اُنھیں صُبح و شام
وہ کوئی نیکی کا نہیں کرتے کام
جو کہ سوال اُن کا نہیں کرتے رد
مُلک میں پھیلاتے ہیں اخلاقِ بد
مانگنا خود اُن کو سِکھاتے ہیں وہ
حوصلہ دے دے کے بڑھاتے ہیں وہ
بعضوں کو اِس بات میں یہاں تک ہے کد
روکئے قانون سے یہ رسمِ بد
کیجئے سرکار سے فریاد و داد
تاکہ کرے مانگنے کا اِنسداد

ایسا وہ قانون بنائے کوئی
بھیک نہ پھر مانگنے پائے کوئی
ہے 'لبرل' کی یہی کوشش اگر
لائے گی آخر کو یہ کوشش ثمر
ایک دِن ایسا بھی ضرور آئے گا
مانگنا اِک جُرم ٹھہر جائے گا
مانگتے اب پھرتے ہیں جو در بدر
آئے گی پرچھائیں نہ اُن کی نظر

} حالی

انگریزی لباس

ہیں جو میرے برادرِ امجد
شفقت جن کی مجھ پہ ہے بے حد
اُن سے اِک روز عرض میں نے کی
گر کریں عفو میری گستاخی
تو کروں عرض آپ سے اِک بات
جس سے تشویش ہے مجھے دِن رات
بولے۔ وہ بات کیا ہے؟ شوق سے کہہ
اُس کے کہنے سے تو نہ قاصر رہ

تب یہ میں نے کہا۔ کہ حضرتِ من!
میرے دل کو اِسی کی ہے اُلجھن
یہ روش کیوں جناب کو بھائی
ترک کردی جو وضعِ آبائی؟
نہ وہ پاجامہ ہے نہ ہے اچکن
بلکہ ہے ’کوٹ پینٹ‘ زیبِ بدن
ہے بجائے عمامہ سر پر ٹوپ
ہوگئے آپ مولوی سے ’پوپ‘
گرچہ رکھتے ہیں چہرے پر ڈاڑھی
پر لبیں ہیں ضرور حد سے بڑھی
آپ نے جو یہ ترکِ وضع کیا
خوبیاں اِس میں۔ کہیے۔ ہیں کیا کیا؟
اور نقصان کی جو پُوچھیں جناب
تو نہیں اُس کا کچھ شُمار و حِساب
پھر بھی دو چار عرض کرتا ہوں
عرض کرنے میں گرچہ ڈرتا ہوں
دیکھتے ہیں جو صُورتِ ظاہر
لوگ کہتے ہیں آپ کو کافر
آپ کی شکل دیکھ کر۔ حضرت!

ہوتی ہے اُن کو وحشت و نفرت

خیر۔ اُن کی اگر نہیں پروا
سوچیے یہ تو اپنے دل میں ذرا
جب کہ یوں شکلِ ظاہری بدلی
حالتِ باطنی بھی بدلے گی
حُبِّ اِسلام دل سے جائے گا
دین عیسائیوں کا بھائے گا
ہوگی خویش و یگانہ سے نفرت
صاحبوں کی خوش آئے گی صُحبت
پر وہ حاکم ہیں۔ آپ ہیں محکوم
وہ ملیں آپ سے! یہ ہے معلوم
الغرض۔ اپنی قوم بھی چھوٹی
صاحبوں سے اُمید بھی ٹوٹی

میری تقریر سُن چکے جس دم
بولے ہنس کر برادرِ اعظم
تُو نے جو کچھ کہا وہ سچ ہے۔ مگر
غور اب میری بات پر بھی کر

لوگ کافر کہیں۔ تو کیا ڈر ہے ؟
عالمُ الغیب ربِّ اکبر ہے
جانتا ہے وہ دل کی سب باتیں
اُس پہ ظاہر ہیں نفس کی گھاتیں
کُفر و ایماں تو دل پہ ہیں موقُوف
جانتے اِس کو ہیں سب اہلِ وقُوف
گو رکھیں لوگ ہم سے دل میں پیچ
کارِ ما با خدا است ۔ دیگر ہیچ

شکلِ ظاہر کا اِعتبار نہ کر
دِل حسینوں کے ہوتے ہیں پتّھر
جب بھرا دل میں ہو فریب و دغا
جُبّہ و خرقہ بھی جو پہنے تو کیا ؟
مولوی کتنے ایسے پائے گا تُو
جن میں ایمان کی نہیں کچھ بُو
وہ پہنتے ہیں جُبّہ و دستار
تاکہ اِس آڑ میں وہ کھیلیں شکار
خود کو پجواتے ہیں مُریدوں سے
اور انھیں لُوٹتے ہیں جی بھر کے

دین کا پردہ آگے ڈالتے ہیں
پھر دِلی حسرتیں نکالتے ہیں
برملا کرتے ہیں وہ ایسے کام
جن سے شرمائے فاسقِ بدنام

ماسوا اِس کے۔ یُوسفِ خوشخُو !
ہندیوں کے لباس ہیں جو جو
وہ کہاں ہیں لباسِ اہلِ عرب؟
اُن کو اِسلام سے علاقہ ہے کب؟
ہے کہاں ہند میں لباس ایسا
جس پہ صادق ہو لفظ "قومی" کا؟
ہر کسی کا ہے ایک رُوپ نیا
جس کو دیکھو۔ ہے اُس کی وضع جُدا
کوئی کرتا ہے زیبِ بر اچکن
ہے انگرکھا کسی کے زیبِ بدن
جُبّہ و خرقہ پہ مِٹا ہے کوئی
ہے کسی کو پسند شروانی
ایک کو "فیز" ہے اگر مرغُوب
دُوسرے کو دوپلّی ہے محبُوب

کوئی کرتا ہے زیبِ سر دستار
سر چھپانا ہی ہے کسی کو عار
باندھتا ایک ہے اگر تہبند
دُوسرے کو ہے دھوتی دل سے پسند
گر پہنتا ہے ایک پاجامہ
دُوسرا پینٹلون میں ہے ڈٹا
پھر برابر ہوئے لباس سبھی
یُورپی ہوں وہ۔ یا کہ ہوں ہندی
بلکہ میں کہہ دوں تجھ سے صاف صریح
ہے لباسِ فرنگ کو ترجیح
زیبِ تن اُس کو کرتے ہیں اتراک
جن کی تہذیب کی بندھی ہے دھاک

تُونے جو کچھ سُنے یہ میرے مقال
تھے یہ سب صرف بہرِ اِستدلال
میرا مطلب اِسی قدر ہے فقط
ہے لباسوں پہ اِعتراض غلط
جن کو جن کپڑوں کی ضرُورت ہو
وہ اُنھیں شوق سے پہننے دو

نہیں اِسلام میں لباس کی قید
چاہیے دل میں ہو نہ مکر و شید
باطنِ اِنسان کا دُرست رہے
چاہے پھر جو لباس وہ پہنے
ہے مُسلماں کو صِرف یہ لازم
رہے پابندِ شرع وہ دائم
جو اوامر ہیں وہ بجا لائے
جو نواہی ہیں اُن سے باز آئے

اتنی تقریر ہونے پائی تھی
کہ یہ آواز غیب سے آئی
"در خصُوصیتِ لباس مکوش
قولِ سعدیؔ شنو ز گوش ہوش
در عمل کوش و ہرچہ خواہی پوش
تاج بر سر بنہ و علم بر دوش"

محمد یوسف جعفری
رنجور عظیم آبادی

رُباعیاتِ رنجور

بد اچھا بدنام بُرا

بعضے کہتے ہیں شخصِ خود کام بُرا
بعضوں کی سمجھ میں ہے مے آشام بُرا
مجھ سے پُوچھو تو یہ کہوں گا رنجور
بد اچھا ہے۔ مگر ہے بدنام بُرا

ریا کار واعظ

واعظ ہے خُوب میرا دیکھا بھالا
بتلائے کسی اور کو آلا بالا
یہ حُجرہ نشینی اُس کی بے وجہ نہیں
کچھ دال میں ہے ضرُور کالا کالا

دُنیا اُمید پر قائم ہے

جو ہیں بیمار اُنھیں ہے اُمیدِ شفا
جو ہیں بے زر اُنھیں ہے اُمیدِ غنیٰ
اُمید نہ ہو تو خودکُشی ہو اِک کھیل

سچ ہے۔ اُمید پر ہے قائم دنیا

عاشقانہ

میں نے جو قصیدہ اُس کی مدحت میں پڑھا
اور اُس بُتِ مغرور کا پندار بڑھا
تھا ایک تو پہلے سے کریلا کڑوا
اِس پر یہ غضب ہوا کہ وہ نیم چڑھا

عاشقانہ

اب تک خللِ دماغِ مُختل نہ گیا
سودائے گیسوئے مُسلسل نہ گیا
ہے قبر میں بھی مجھے تری زلفوں کا دھیان
گو رسّی جل گئی مگر بل نہ گیا

مار گزیدہ از ریسمان می ترسد

تُو میری دوستی کا ہے دم بھرتا
میں دوست کے نام سے ہوں نفرت کرتا
کیوں کر نہ ڈروں رہا ہوں یاروں کا ڈسا
ہے مار گزیدہ ریسمان سے ڈرتا

بِلّی کے بھاگوں چھینکا ٹُوٹا

افسوس کہ اب میرا مُقدّر پھُوٹا
میرا اور اُن کا ساتھ اے دِل چھُوٹا
مُجھ سے لڑ کر گئے وہ دُشمن کے گھر
بِلّی کے بھاگوں آہ! چھینکا ٹُوٹا

بھاری پتّھر تھا چُوم کر چھوڑ دیا

رنجور نے پیمانِ وفا توڑ دیا
اُلفت کا رِشتہ اور سے جوڑ دیا
اُس بُت میں تو شانِ دلبری تھی لیکن
بھاری پتّھر تھا چُوم کر چھوڑ دیا

گیا وقت پھر ہاتھ آتا نہیں

رنجور ہے کیوں آہ زباں پر لاتا؟
کیوں اپنے کئے پہ آج ہے پچھتاتا؟
جو ہونا تھا ہوا۔ اب آگے کی سوچ
جو وقت گیا۔ وہ پھر نہیں ہاتھ آتا

قطرہ قطرہ دریا می شود

ہر روز کے اِسراف کا صِرف اِک پیسا
بتلا تو کہ اِک سال میں کتنا ہوگا!
کیا تجھ کو خبر نہیں ہے۔ اے یارِ عزیز!
ہوتا ہے قطرہ قطرہ۔ آخر دریا

بیکار سے بیگار بھلا

مانا خادم سے ہے۔ دُکان دار اچّھا
یعنی مجبور سے ہے مختار اچّھا
لیکن اِک سخت روگ بیکاری ہے
اے یار! ہے بیکار سے بیگار اچّھا

دُشمنِ دانا بہ از دوستِ ناداں

ہے دوست تمھارا میں نے مانا اچّھا
کہتا ہے اُس کو اِک زمانا اچّھا
باوصف اِس کے بھی وہ اگر ہے ناداں
اُس سے ہے کہیں دُشمنِ دانا اچّھا

مُفلسی میں آٹا گیلا

بُیرسٹری، پڑھ کر اِنھیں یہ نفع ہوا
بُیرسٹری، چلتی نہیں۔ گھر بار بِکا
انگریزی ٹھاٹھ اب نبھے گا کیونکر؟
آٹا ہوا مُفلسی میں اپنا گیلا

کوئی شال میں مست، ہم کھال میں مست

کیوں سمجھیں تونگروں کو ہم بالا دست
کیا اُن کی ہمارے آگے ہے بُود و ہست
کِس بات میں رنجور ہم اُن سے کم ہیں
وہ شال میں مست ہیں تو ہم کھال میں مست

بے عیب ذات اللہ کی

گو کام تجھے ہے شاعری سے دِن رات
معلوم تجھے ادب کے ہیں سارے نُکات
کیوں میری لغزشوں پہ ہے تیری نظر
بے عیب اے نُکتہ چین! ہے اللہ کی ذات

آدمی بلبلا ہے پانی کا

پانی کا بلبلا ہے اِنسان کی حیات
ہرگز نہیں اِس سے بڑھ کے اِس کو ہے ثبات
وہ اِس دُھن میں کہ دوں رقیبوں کو شکست
اور موت اِس فکر میں کہ دوں اُس کو مات

ایک چُپ میں ستّر آفت ٹلتی ہے

اِنساں کے لئے گو ہے زباں اِک نعمت
لیکن ہے فضول گوئی اِک بد عادت
اِنساں پر آفتیں یہ لاتی ہے۔ مگر
ٹلتی ہے ایک چُپ میں ستّر آفت

ایک پنتھ دو کاج

گر چاہتے ہو کہ قوم کے ہو سرتاج
امراضِ قوم کی کرو فکرِ علاج
ہو قوم کو بھی نفع تمھیں بھی شُہرت
صادق ہو یہ مثل کہ "اک پنتھ دو کاج"

آنکھیں ہوئیں چار تو دل میں آیا پیار

جب تک رہے دُور تم نظر سے اے یار!
کرتے رہے رنجور کو مُردوں میں شُمار
اب اُس جُدائی کے روادار نہیں
چار آنکھیں ہوئیں تو دل میں بھی آیا پیار

آنکھوں سے دُور دِل سے دُور

بیکار ہے شکوۂ تغافل رنجور
ہونا ہے کسے خیالِ یارِ مہجور
کیا تو نے سُنی نہیں یہ مشہور مثل
"جو آنکھوں سے دور ہے۔ وہ ہے دل سے دُور"

بڑے بول کا سر نیچا

اُس بُت نے تجھ کو مُنہ لگایا ہے اگر
شیخی کی نہ لے مجھ سے تو اے گیدی خر!
اِک روز ضرور مُنہ کی کھائے گا تو
سُن لے کہ بڑے بول کا نیچا ہے سر

عیب کرنے کو بھی ہنر چاہیئے

تو رِیس جو صاحبوں کی کرتا ہے یار!
کرتے ہیں تجُھ کو بندروں میں وہ شمار
لیکن آساں نہیں ہے نقّالی بھی
کرنے کو عیب بھی۔ ہنر ہے درکار

دھوبی کا کُتّا نہ گھر کا نہ گھاٹ کا

دُنیا کی طلب میں ہوئے اللہ سے دُور
لیکن دُنیا کو ہم سے ہے سخت نفُور
دھوبی کے کُتّے کی طرح صد افسوس
ہم گھر کے رہے نہ گھاٹ کے اے رنجُور!

باہمی نااتّفاقی سے قومی ترقّی نہیں ہو سکتی

وہ قوم ترقّی کرے۔ کیا خاک اے یار!
ہوتی رہتی ہے۔ جِن میں جُوتی پیزار
کیا واسطہ اِس سے اور سرسبزی سے
وہ بیل منڈھے نہیں چڑھے گی زِنہار

ظاہر کچھ باطن کچھ

واعظ کے وعظ ہیں سنانے کے اور
اور آپ اپنے عمل میں لانے کے اور
پھبتی ہے اُس پہ یہ مثل ہاتھی کی
"کھانے کے ہیں دانت اور دکھانے کے اور"

جب تک سانس تب تک آس

ہرچند بجھی نہیں کبھی میری پیاس
کیوں مجھ کو شرابِ وصل پینے سے ہو یاس
میں یہ کہہ کہہ کے دل کو سمجھاتا ہوں
جب تک ہے سانس تب تک اے دل ہے آس

کارِ امروز را بہ فردا مگذار

کرنے جو کچھ تجھے ہے۔ کرلے فی الحال
معلوم کسے ہے حالتِ اِستقبال
میری یہ نصیحت آبِ زر سے لکھ لے
"جو آج کا کام ہو۔ اُسے کل پہ نہ ٹال"

جو ابر گرجتے ہیں برستے کم ہیں

تم کہتے تو ہو کہ "مصلحِ قوم ہیں ہم"
لیکن معلوم ہے تمھارا دم خم
سچ ہے یہ مثل ذرا نہیں شک اس میں
"جو ابر گرجتے ہیں - برستے ہیں کم"

یاروں کی بے وفائی

جب سے مجھے یاروں سے ضرر پہنچا ہے
اپنے سائے سے بھی مجھے کھٹکا ہے
جل جاتی ہے گرم دودھ سے جس کی زباں
وہ چھاچھ بھی پھونک پھونک کر پیتا ہے

زر بور کا لڈو ہے

ناداروں کو آرزو- کہیں زر ہاتھ آئے
زرداروں کو ڈر کہ چور اس کو نہ چرائے
زر اسے رنجور! بور کا ہے لڈو
جو کھائے پچھتائے- جو نہ کھائے پچھتائے